

# نَری یادوں کے گلاب

ناولٹ

شازیہ اعجاز شازی

PDFBOOKSFREE.PK

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk

## ابتدائیہ

میرا نام یقیناً قارئین بہنوں کے لیے نووارد کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈائجسٹوں کی دنیا میں میرا داخلہ ماہنامہ نازنین کراچی میں چھپنے والے ناولٹ "غم تمہارا ہے" کے ذریعے ہوا۔ یہ کہانی اپریل ۲۰۰۹ء کے شمارے میں چھپی جو اچھی خاصی پسند کی گئی۔

اگلے ہی ماہ ماہنامہ نئی کہانیاں اور فیشن میگ میں میری دو اور تحریروں شائع ہوئیں۔ اور اس کے بعد یہ سلسلہ چل پڑا۔ ایک ہی سال کے اندر دس کہانیاں لاہور اور کراچی کے انجمنوں میں چھپیں۔ جن میں سے ایک ناولٹ "ریت کی دیوار" انعام یافتہ قرار پایا جبکہ "سحر ہونے تک" نے ماہنامہ نئی کہانیاں میں ماہ دسمبر کی اول انعام یافتہ تحریر کا اعزاز حاصل کیا۔

نئی کہانیاں، شمع، درخشم، فیشن میگ میں دوہ اور نازنین، ماہنامہ خاتون خانہ میں ایک ایک کہانی شائع ہو چکی ہے۔ جبکہ اب تک کی آخری اشاعت فروری ۲۰۱۰ء کے ماہنامہ "سماج" کراچی میں چھپنے والا افسانہ "چاہت کا درخت" ہے۔

اسے کم عرصے میں اتنی زیادہ کہانیاں شاید کسی بھی دوسری خاتون مصنفہ کی ڈائجسٹ اور ماہی کی زینت نہیں بنی اور وہ بھی پہلے ہی سال۔

سادب کتاب ہونا جہاں بہت بڑا اعزاز ہے وہاں ذمہ داری بھی ہے اور مجھے نہیں



معلوم کہ میں اس ذمہ داری سے بہ احسن مہد و براہ ہو سکتی ہوں کہ نہیں؟ تاہم میری کوشش ہے اور ہے گی کہ میں پڑھنے والوں کو ایسی تحریریں دوں کہ جن سے معاشرے کے بچاؤ کو کم کرنے میں مدد ملے۔

اکثر احباب پوچھتے ہیں کہ ان کہانیوں کے کردار کہاں سے کشید کرتی ہوں میرا جواب یہ ہے کہ ہر شخص ایک نہ ایک کہانی اپنے چہرے یا ماتھے پہ سجائے پھرتا ہے۔ کردار بھی اسی معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں۔ ہاں انہیں بازیافت کرنا لکھنے والے کی ذمہ داری ہے۔

میرے ناولت بھی اسی جیتے جاگتے معاشرے کی کہانیاں ہیں۔ اور ان کے تمام تر کردار میں اپنے ارد گرد سے محسوس کر کے لیتی ہوں اور سیدھے سادھے انداز میں لکھتی ہوں تاہم یہ کوشش ضرور ہوتی ہے کہ کہانیوں میں یکسانیت نہ آئے۔ انشاء اللہ جلد ہی قارئین نہیں میرے سلسلہ وار ناول مختلف ڈائجسٹوں میں دیکھیں گی۔

اس کے علاوہ درجن بھر کے قریب ناولت بھی اشاعت کے لیے مختلف ڈائجسٹوں کے پاس "انتظار فرما" کے مرتلے سے گزر رہے ہیں۔

آخر میں ان کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتی ہوں جنہیں میں نے پڑھ کر لکھنا سیکھا۔ جی ہاں، اے آر خاتون، مدیہ بٹ، سہلی کنول، بشری رحمن، رضیہ جمیل، بانو قہسار اور وہ تمام جن کے نام اس وقت ذہن میں نہیں آ رہے۔

شازیہ اعجاز شادی

## تری یادوں کے گلاب

اے اللہ... انسان اتنا عالم کیوں ہے؟ حیرتی تحقیق اتنی بے درد کیسے ہو گی۔ لفظ محبت تو باعث تکلیف کا نکتہ ہے۔ بھر کا نکتہ سے یہ لفظ کیوں اٹھ گیا۔ ہر طرف نفرت کا راج کیوں ہے۔ کیا ہو گیا ہے انسانوں کو۔ وہ انسان کیوں نہیں رہے۔ شکلیں..... ہر طرف مشکلیں ہی شکلیں۔ باپ حادثے میں معذور پڑے سی کر گزارہ کرتے ہوئے ماں کی آنکھیں بے نور۔ تھوڑی سی تھوڑی میں مشکل سے گزارا اور پھر اپنا تک پڑنے والی میسجیں۔ ماں باپ کی گفتات، کرائے کا گھر جو بھرتوں کے ڈربے سے مختلف نہیں۔ لیکن مالک مکان کے غرے آسمان پر، کرائے یا حائے کی دھمکیاں، نوکری کی مشکلات، پہلے پھر مگر صورتحال کچھ بھر چکی۔

تینوں بھائی ساتھ رہتے تھے۔ تایا ابوتہ تھے ہی خود غرض تائی اماں آفت کی پرکال، پھر مرے کو۔ ورنہ۔۔۔ آخر چچا کی شادی ہو گئی اور نزل انہی بھائیوں پر گرنا انہیں ہی گھر چھوڑنا پڑا۔ کرائے کے گھر میں مشکلیں تو خیر تھیں ہی لیکن نعمان صاحب کے بس کے حادثے نے تو زندگی ہی برباد کر دی۔ اس حادثے میں نعمان صاحب معذور ہو گئے۔ نہ صرف معذور بلکہ ان کی زبان تک بند ہو گئی اور اب وہ صرف ایک ذمہ داری تھے۔ لیکن بیوی اور بیٹے نے انہیں لاش نہ پہنچے دیا اور انہیں ہتھیار نہ دیا۔

نعمان صاحب ان دونوں کے بھی شکر گزار تھے۔ درحالیہ دور میں رشتے سب سے زیادہ مفید نہیں رہے ہیں۔ نین بھائی تھے یہ۔ نعمان، اختر اور احمد گھر سوچنے اور سوچنا بین نیا پاس تھا۔ اماں نے اپنے اختیارات سے کام لے کر مکان دو بھائیوں کے نام کر دیا اور نعمان کو روکھ میں سے جسی بی طرح نکال پڑ گیا کیا۔ وہ بچکر بچا ہی بیوی اور بیٹے کو لے کر کرائے کے مکان میں آ گئے اور یہ ان کے ساتھ یہ حادثہ ہو گیا اور وہ معذور ہو کر گھر بیٹھ گئے۔ تاہم کچھ پیش کر چکا تھا وہ چند

”اور... اوہ... یہ کیا بات ہوئی۔ بہن تمہاری جیسی یاد دہانی؟“ بڑی بھادوچ نے کہا۔

”تم لوگوں سے بولنے کے لیے کس نے کہا ہے۔ بات کرنے دو۔ دیکھو عامم؟ میں معلوم ہے انہیں ان بچارے سے معذور ہو کر گھر بیٹھ گئے ہیں مگر اب ان تینوں بچوں کا مسئلہ ہے۔ ہمارا گھر بھی چھوٹا سا ہے۔ تم کو کچھ بچے ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا فیصلہ ہو جائے جس سے ان کی پرورش بھی ہو جائے۔ میں ایک تجویز ذہن میں رکھتا ہوں کہ ایک ایک سال تک ان بچوں کو اپنے ساتھ رکھا جائے۔ بچوں کی خالائیں بھی ان کا بوجھ اٹھائیں اور انہیں اپنے ساتھ رکھیں، کہ بچے کسی کی محبت سے محروم نہ ہو سکیں۔“

”اور... واہ... بھائی احمد حسین! بڑا شاطر دامغ پایا ہے آپ نے؟“

”کیوں... اس میں شاطر دامغ کی کیا بات ہے؟“

”سارا بوجھ ہم پر لا دیا آپ لوگوں نے ہم خود بال بچوں والے ہیں یہ تمہیں نہیں۔“

”تو پھر کیا کیا جائے ان کو کسی قیمتی خانے بھیج دیا جائے۔“

”کچھ بھی کیا جائے آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔“

”اوں۔ ہوں۔ کون کیا کرے گا دیا جاتی ہے۔“

”تمہیں تائی اماں اور نیا بھی جانتی ہے اور میں بھی جانتا ہوں۔ آپ بالکل بے فکر ہیں۔ میں

انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اور یہ سارا وعدہ ہے کہ میں ان تینوں کو اس معاشرے میں سرفرازا کر دے گا۔“

”سوچ لو سہا! جوانی ہے، جوانی کے جوش میں آدمی سکندر اعظم بن جاتا ہے لیکن سکندر اعظم بننے کے لیے پوری دنیا کو کندھوں پر اٹھانا پڑتا ہے۔“

”اللہ مالک ہے۔“ یہ کہہ کر عامم نے ان تینوں کو بانہوں میں بھر لیا۔ واہی اماں چینی چینی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ گھر ان کی لڑائی ہوئی آواز ابھری۔

”اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔“ اور عامم ان تینوں بچوں کو لے کر اس درے میں واپس آ گیا۔ اس نے باپ کی آنکھوں میں بڑے سکون کے آثار دیکھے تھے۔ شاہدہ بیگم بھی انتہائی نہیں عورت تھیں۔ انہوں نے کہا۔

”خدا ان کی تدبیریں ہمارے ساتھ شامل کر رہا ہے تو ان شاء اللہ ان کی تقدیر سے ہمارے بھی الہ رازہ ہو جائیں گے۔“ نعمان حسین نے نگاہوں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا تھا جیسے خدا

جان کر سامنے آ گیا اور اس نے باپ کو تسلی دی کہ وہ ہے ماں کی جگہ پر بیٹائی کی کیا بات ہے؟ باپ کی آنکھوں میں پیار کا سمندر اُمنڈ آیا۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لیں۔ اس کا ہاتھ چوم کر اسے بتائیں کہ وہ اس سے کتنا پیار کرتے ہیں مگر وہ اسے دل ہی دل میں دعا نہیں دیتے کہ علاوہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اور حرم کی آنکھیں جو محنت کرتے کرتے دھندلا گئی تھیں لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرتی تھیں نہ یہ بتاتی تھیں کہ ان کے دل میں کیا ہے۔ ایک بے بسی ایک بے کسی ایک تڑپ جو اپنے رفیق زندگی کو معذوروں کی طرح بستر پر دیکھتی تھیں تو اس کا دل کٹ جاتا تھا اور بیٹے کے چہرے پر چھائی ہوئی تھکن جسے وہ چھپانے کی انتہائی کوشش کرتا تھا اور غصہ غصہ اس سے ہاتھیں کرتا تھا ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتا تھا۔

شرافت بعض اوقات انسان کو مشکلات کا شکار کر دیتی ہے مگر بات وہی ہے کہ جب نہ رے اپنی برائی نہیں چھوڑ سکتے تو اچھے اپنی اچھائیوں کو کیسے نظر انداز کر سکیں۔ بچا اختر حسین اور چچی نازیہ بیگم ایک حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ تاپا احمد حسین جو سدا کے زمانہ ساز تھے یہ سوچ کر کہ اب اختر حسین کے تینوں بیٹوں کا بوجھ ان پر پڑے گا جو بالکل چھوٹے چھوٹے تھے انہوں نے نعمان کے ہاں اطلاع بھیج دی کہ آنکھیں اور آ کر ان بچوں کے بارے میں فیصلہ کریں چنانچہ بحالت مجبوری عامم اور شاہدہ بیگم کو ان کے گھر جانا پڑا۔

عامم کئی سالوں کے بعد اس گھر میں آیا تھا۔ جہاں کے پچھلے چھپے سے اس کا بچپن جڑا ہوا تھا۔ اس نے اس کے بچپن کے گھر کے صحن میں لگی ہوئی جی۔ تاپا جان اور تائی جان کے چہروں کی رعینت اور خوشونت میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ کمزور واہی اماں بھی پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک لمبے کے لیے عامم کے دل میں تھی نے سرائی اٹھا کر شاہدہ بیگم کا چہرہ دیکھ کر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ البتہ واہی صاحبہ نے پتہ نہیں کیوں بڑی محبت کا اظہار کیا اور روداد کی کمی کی طرح نکالی جانے والی بہو اور پوتے کو سینے سے لگا لیا۔ تینوں بچے اس انداز میں سر جھکائے بیٹھے تھے کہ جیسے ماں باپ کی موت انہی کا خرم ہو۔

اس نے ان مصیبتوں کو دیکھا تو اس کے دل پر غیب اس اثر ہوا۔ اس وقت نازیہ چچی کی بڑی بہن نے کہا۔

”ہم بھلا ان بچاروں کو کیسے سنبھال سکتے ہیں ہم تو خود اپنے شوہروں کی مرضی سے سانس لیتے ہیں۔“



سے دعا کر رہا ہو کہ وہ ان کی مدد کرے۔

☆.....☆.....☆

اس دن عام اپنے خیالات میں کھوپا کھیں چار ہاتھ کا بے خیالی کے انداز میں کسی سے کرا  
مکیا۔ تبھی اس نے کسی کی ہنسی ہوئی آواز سنی۔

”اے میں آپ اسٹاک پر چل رہے ہیں اور آپ کو ہوش نہیں ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ  
اگر میں چاہوں تو آپ کو ابھی..... ہاں نے جبرانی سے اسے دیکھا اور اس کے چہرے پر شدید  
شرمندگی کے آثار ابھر آئے۔ سفید شلوار، سفید قمیض اور سفید ہی روپے۔ دو اسٹاپی بڑی بڑی  
آنکھوں سے غصے سے دیکھ رہی تھی۔ ابلیسی سالانہایت لیے گندی رنگت۔ بہت ہی دلکش نقوش  
سب سے بڑی چیز اس کے چہرے کی وہ جھلکت تھی۔

”م..... م سحافی چاہتا ہوں۔“

”جی ہاں۔ عام ساقط ہے۔ سحافی چاہتا ہوں۔ پتہ نہیں یہ آنکھیں استعمال نہیں کی  
جاتیں۔ راستہ دینا تو شان کے خلاف ہے۔“ اس نے تھک کر اپنی چیزیں اٹھائیں اور وہاں سے  
آگے بڑھ گیا۔ اسے بہت سی ضروری کام سے جانا تھا۔

☆.....☆.....☆

دروازہ ہلکے سے کھٹکے سے کھلا تھا۔ نیند میں آئے پیپے..... شاید وہ جیم چمک کر سیدھی  
ہوئیں۔ آنے والا عام ہی تھا۔ ان کو دیکھ کر مسکرایا۔

”آپ سنوئی نہیں امی ابھی تک؟“

”جی بہت دیر ہو گئی آج؟“ انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا جو رات کے کیمارہ تھا  
رہی تھی۔

”ہاں امی میں نے آپ کو بتایا تھا کہ دیر ہو جائے گی۔“ اس نے تخت پر گرتے  
کے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے جیٹا۔ مگر اتنی دیر..... میں پریشان ہو گئی تھی۔“

”کتاب پریشان مت ہو۔ یہ..... پ..... روزانہ یہی ٹائم ہوگا۔“

”روزانہ..... امی دیر تک کیا جاؤ۔ روکے باہر؟“ وہ حیرانی سے بولیں۔

”ای پارٹ ٹائم جاب ملی ہے۔ صدر میں دو تین دنوں پر حساب کتاب کرنے کا کام

تری یادوں کے کتاب

ہ۔ لارے ہوتے ہوئے اتنا کم تو لگ ہی جائے گا۔“

”یہ تمام انسان ہی ہو کوئی مشین تو نہیں اتنا کام کیسے کرو گے کوئی دوسری نوکری کیوں نہیں  
امانڈ لیتے.....؟“ وہ فکر مند ہوئیں۔

”اوی..... نوکری ملنا کوئی آسان ہے؟ آپ کو کیا لگتا ہے کہ سب میرے انتظار میں بیٹھے ہیں  
کہ میں ان کے پاس آؤں اور وہ ہار بھول کر لے کر مجھے پہنائیں اور میٹ پر بٹھادیں؟“ وہ اتنا تھکا  
ہوا تھا کہ اس کے لہجے میں تلخی آ گئی۔

”آپ فکر نہ کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کوئی دوسری جاب اس آپ دعا کریں میرے لیے۔“  
اس کو اپنے لہجے کا احساس ہو گیا اس لیے محبت سے ان کا ہاتھ تھام کر ان کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔

”تمہارے لیے دعا میں ہی دعا نہیں ہیں جیٹا۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

”اور یہ ہی کیا ہمارے پاس؟“ ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

”نہیں یہ..... بہت ہیں اور یہ بتائیں کہ تینوں بچے سو گئے ہیں کیا؟“

”ہاں..... ابھی تو سلا یا ہے۔ تمہارے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ شاکر اور امرو تو بچے  
پینے تھے کہ کہیں تم سے ملنے نہ پائیں۔“ وہ مسکرا کر بتانے لگیں۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ واقعی  
تینوں بچے اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ شاکر اور امرو جو جڑواں تھے۔ خود ہی اس کے پاس بیٹھ کر  
اس کی باتیں دہانے لگتے تھے تو اس کو ان پر بہت پیار آتا دونوں کو ایک ساتھ گود میں اٹھا لیتا تھا  
بڑا بڑا طہرے سوئی نظروں سے اس کو دیکھتا جاتا تھا۔ عام نے کئی بار اس سے بے تکلف ہونے کی  
کوشش کی تھی لیکن وہ شرمایا شرمایا سار جاتا تھا۔

”بابا سو گئے؟“

”ہاں بچے دو بھی سو گئے ہیں تم جلدی سے ہاتھ دھو کر آؤ میں کھانا گرم کر رہی ہوں۔“ وہ  
امرو کی باتیں کرتی۔

اور کھانا کھا کر وہ جیسے ہی اپنے بستر پر گر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ سارے دن کی محنت شفقت  
نے مانت رہا تھا۔ صبح چوبیس گھنٹے لگتا تھا۔ نہیں کہیں بدل کر ٹیکسٹری پہنچا تھا۔ اور صبح نوٹش  
بہانا ہے آفس اور رات گئے گھر پہنچا اور بستر پر گر کر اسے کچھ ہوش نہیں رہتا تھا۔ مگر اچانک ہی  
اس کی نوکری تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اسے آواز دی ہو۔ اور اُدھر دیکھا تو حیران رہ گیا۔  
وہ دن تھا۔ اس نے اسے آواز دی تھی۔ عام نے گھڑی پر نظر ڈالی جو رات کے تین بج رہی تھی۔

تری یادوں کے گلاب

"الطیر کیا بات ہے بیٹا؟ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟ اتنی رات کو کیا کر رہے ہو؟" گھبرا کر اس نے کئی سوال کر ڈالے۔ جواہر گھبرا کر انہی نظروں سے اسے دیکھا رہا۔

"بیٹا..... کیا ہوا..... آپ ٹھیک ہو نا.....؟ کوئی ڈراؤ نا ڈراپ دیکھا ہے۔ اس کی سمجھ میں یہ ہی آیا کہ بچے سوئے میں ڈر گیا ہے۔"

"وہ بھائی جان..... آپ سے ایک بات کر..... کرنی ہے۔" وہ بہت انکڑا رہا تھا۔  
 "ہاں..... بیٹا کہو..... کیا بات ہے؟ کچھ چاہیے آپ کو کیا؟" اس وقت وہ اپنی صحنہ نیند سب کچھ بھول گیا تھا۔

"بھائی جان آپ مجھے اسکول داخل نہ کروئیں۔" اس نے آخر کبھی دیا۔

"کیوں بیٹا آپ کال نہیں جانتا اسکول جانے کو؟"

"نہیں بھائی جان آپ مجھے گھس کام پر رکھوادیں۔" اس نے مصمویت سے کہا۔

"اسنے سے بچے کے کسی سے اتنی بڑی بات سن کر وہ حیران رہ گیا۔ اس پر کہنے کی کیفیت طاری ہوگئی۔ کچھ دیر تک وہ بول بھی نہ سکا۔"

"بیٹا..... آپ سے کس نے کہا؟" بڑی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوا تھا۔

"وہ جب میں تاجا جان کے ہاں تھا ناں..... تو وہ کہتے تھے تم کام کیا کرو۔ انہوں نے ایک ہوٹل میں کام بھی دعوہ کر لیا تھا۔ مگر پھر ہم یہاں آ گئے۔" وہ اس کے تاثرات سے بے نیاز ہوتا چلا گیا۔

"اوہ تاجا جان اہم تو سنبھلے تھے۔ آپ نے تو سگوں کا بھی لحاظ نہیں کیا۔" وہ سوچ کر رو گیا۔ اسنے سے بچے کو موت مشقت کی آگ میں جھونکنے کا قصور ہی اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔

"آپ اتنا کام کرتے ہیں۔ اتنا تھک جاتے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ مل کر کام کروں گا۔ شاکر اور احمد کو سکول داخل کرادیں۔" وہ مصمویت سے اپنے پلان بتا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

آخر چنچا اور منیہ وچٹی سے اسے بہت سی شکایتیں تھیں۔ مگر ان مصوم بچوں سے اتنی ہی بہت تھی۔ اس نے پیار سے اسے اپنے برابر بھا لیا۔

"بیٹا یہ سب سوچنا آپ کا کام نہیں۔ اس سیشن سے آپ کا اسکول میں ایڈمیشن ہو جائے گا۔ اگلے سال ان شاء اللہ شاکر اور احمد بھی اسکول جانے لگیں گے۔ آپ لوگوں کا کام ہے صرف

تری یادوں کے گلاب

اور..... اس وقت سے توجہ دانی کرنا اور بس پیسے کہاں سے آئیں گے۔ کون کائے گا؟ کتنا خرچ ہوگا۔  
 اس نے آپ کو کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ آج وہ میں آپ کے منہ سے یہ باتیں نہ سنوں۔ ٹھیک ہے۔" ماسم نے اس کے کال پر بیٹا دیا۔

"م..... مگر بھائی جان....." وہ کچھ کہنا چاہا رہا تھا مگر اس نے اس کے سر پر ایک چپٹ لگا لی۔  
 "اگر کمر کچھ نہیں بس میں نے کہا ناں یہ آپ کا مسئلہ نہیں۔ چلو آپ جا کر سو جاؤ۔ بلکہ ایسا اور میرے ساتھ ہی سو جاؤ۔" اس نے الطیر کو اٹھا کر اپنے برابر میں لٹا لیا۔ بچہ بہت جلد نیند کی آغوش میں چلا گیا مگر اس کی آنکھوں سے چند دھندلی جھگی۔

☆.....☆.....☆

"ماسم جیسے پورا راز و صاحب ہمارے ہیں۔" نعمان جہاں کے ساتھ ہی کام کرتا تھا آ کر اطلاع دی۔

"مجھے ہمارے ہیں۔ مگر کیوں؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"جا کر خود پوچھ لو۔" وہ تو اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا مگر اسے پریشانی لگ گئی۔ سب چھوڑ چھوڑا پورا راز و صاحب کے کہنے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"اسلام دیکھ کر آپ نے بھلا کیا تھا۔"

"ہاں..... آؤ بیٹو۔" شمشاد بیگ نے اس پر نظر ڈال کر کہا۔

"آخر نے بتایا تھا کہ تمہیں اکاؤنٹس کا کام آتا ہے؟"

"جی سر۔"

"ایسا ہے کہ آفس میں کسی کی ضرورت ہے جو یہ کام کر سکے ابھی تو عارضی طور پر ہے مگر ہوسکتا ہے۔ اب اس کام منتقل ہو جائے۔ میں نے تمہارے لیے بات کر لی ہے۔ تم پڑھ لکھے ہو۔ یہ کام ہانے وہ۔ آفس کے ماحول میں رہو گے تو آگے بڑھنے کے امکانات ہیں۔ درندہ بازو سے زیادہ تم وادار رہنا چاہو گے۔ کم سے کم وہاں کچھ سیکھ ہی لو گے۔ آگے تمہارے کام آئے گا۔" وہ تفصیل دیتا لے گیا۔

"تو ادنیٰ الحال تو یہی رہے گی۔ یہ اچھا موقع ہے۔ اسے ضائع نہیں کرنا۔" شمشاد بیگ نے کہا۔ بات ٹھوس سے سمجھا رہے تھے۔





تری یادوں کے گلاب

”ہاں ٹھیک ہے۔ بابا..... ہمارا شماروں میں تہارے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ جا کر دیکھو اور ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ کرے میں تھا۔“

”بابا!“ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ ان کے پاؤں پر رکھا۔ ان کے جسم میں خفیف سی حرارت پیدا ہوئی اور انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور ان کے ہاتھ قلم لے۔

”کیسے چل پایا آپ؟“ اس نے ان کے ہاتھ کی پشت پر ہوسہ دیا۔  
جواب ان کے ہونٹ ذرا سا لرز کر رہ گئے۔ وہ تاسف بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ کیا تھا۔ ان کا بیٹا! اور اب کیا ہو گیا تھا۔ مشقت، بے آرامی اور نیند کی کمی اس کے روم روم سے پھولی پڑ رہی تھی۔ ان کی آنکھیں لم ہو گئیں۔ یہ ان کا اکھوتا بیٹا تھا۔ کتنی محنتوں اور مشقتوں سے اس کو بڑا کیا تھا۔ اس کی ہر وہ فرمائش پوری کی تھی جو وہ کر سکتے تھے۔ اس کو کایا بھی چھوڑنا تو تکلیف ان کے دل میں ہوتی تھی۔ مگر آج..... آج وہ کتنی اہت سے سب کچھ سنبھالے ہوئے تھا۔ وہ دل ہی دل میں اسے دعاؤں سے نواز رہے تھے۔ جبکہ وہ ان کے پاس بیٹھا کھانا کھاتے ہوئے اور اصرار کی باتیں کر رہا تھا۔ درمیان میں ان کے منہ میں نوالہ بھی ڈال دیتا تھا۔

☆.....☆.....☆

نسرین جب سے آئی تھی داخلی دروازے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اس کو عام کا انتظار تھا۔ تقریباً چارہ گھنٹے بعد وہ آنا دکھائی دیا۔ نسرین ایک دم چو کنا ہو گئی۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرنا چاہ رہی تھی لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ آفس میں کسی کے کان میں بھٹک بھی پڑے اور نہ لوگ سکتے ہی دماغے تراش لیتے۔ وہ معمول کے انداز میں اسے سلام کرتے ہوئے اپنے کیمین کی طرف بڑھ آیا۔ اس نے خدا کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے وہیں رک کر اس کی ضرورت نہیں پوچھی۔ ورنہ سب پوچھتے اور جاتے۔ محراب وہ خود کیسے اس کے کیمین میں جائے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اسے بھی مارے۔ لیکن اور زردی کی طرح لگے۔ جو وقت بے وقت اس کے کیمین میں آ کر کوئی دفتری کام ان کرنے لگتی تھیں۔ خود کو نمایاں کرنے کی انتہائی بھڑکی کوشش اسے بیٹھ ہی ایسی حرکتوں کا پتہ رہی تھی۔

”نسرین! آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے درانی صاحب کھڑے تھے۔  
”مامم! کیا ہے کیا؟“

تری یادوں کے گلاب

آپ بھی اب حریف نہ کریں۔ آفس تقریباً خالی ہو چکا ہے آپ کا اور دوسرا صاحب نہیں ہے۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ وہ ایک دم حشوش ہو گئی۔

”ایک منٹ دیکھیں میں آپ کے ساتھ ہی چلوں گی۔“ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ حیرانی سے اس کے بلبل پل بدلنے لگے سوڈا کو دیکھ رہا تھا۔ نسرین نے جلدی سے دوپٹے کے پلو سے اپنا چہرہ صاف کر کے سر ڈھانپ لیا۔ بیک کنڈھے پر لٹکا کر وہ کھڑی ہو گئی۔  
”بھلیں۔“ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ باہر نکل آیا۔

بس اسٹاپ پر پہنچنے تک ان دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ سامنے سے اس کے روٹ کی بس آ رہی تھی مگر اسے نسرین کو ایسے حال میں چھوڑنا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

”آپ جاہے۔ آپ کی دین آگئی میں اب ٹھیک ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔  
عام حیران رہ گیا۔ اسے کیسے پتہ چلا کہ وہ کس نمبر کی دین میں جاتا ہے؟

”نہیں جب تک آپ کی دین نہیں آ جاتی میں یہیں رہوں گا۔“ اس نے قطعی انداز میں کہا۔  
جواب دہ اسے دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی مطلوبہ دین آتی نظر آئی۔ عام نے خدا کا شکر ادا کیا کہ پیچھے اس کی دین بھی تھی۔ ورنہ آج نیوٹن کی چھٹی ہو جاتی۔ دیے تو وہ خود بھی بہت پابند تھا لیکن مسز انصاری کے انداز پر اسے بہت غصہ آتا تھا۔ کبھی اگر وہ دس منٹ بھی لیٹ ہو جاتا تو نہایت درشت انداز میں جواب طلبی کرتی تھیں اور آج تو ان کے پاس کی چھٹی ہی ہو گئی تھی۔ اس کے کتنے ہی نسرین پک کر اس میں سوار ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

بیٹا آج تو بہت دیر ہو گئی۔ وہ جیسے ہی مگر پہنچا شاہدہ بیگم پک کر آئی تھیں۔ اس نے کھڑی پر نظر ڈالی جو پونے بارہ بج رہی تھی۔ وہ سکر دیا۔

”اوی تھوڑی بہت دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔“ آج وہ اتنا تھکا ہوا تھا کہ مسکرانے کی بھی ہمت نہیں تھی مگر جانتا تھا اس کی نظریں اس کا چہرہ پڑھ لیتی تھیں۔ اور وہ کہیں سے بھی اپنی جھکن ان پر ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔

”تہہارے بابا آج تہہارے انتظار میں جاگ رہے ہیں۔“ انہوں نے اندر کی طرف اشارہ کیا۔

”بابا! بھی تک جاگ رہے ہیں؟ طبیعت ٹھیک ہے نا ان کی؟“ وہ مگر مند ہوا۔



Courtesy of [www.pdfbooksfree.pk](http://www.pdfbooksfree.pk)

کوٹھن کر دے۔ خدا حافظ! وہ کہہ کر گزرا نہیں پیچھے وہ زرا بھلاکتی رو کی تھیں۔

☆.....☆.....☆

کتنا آسان ہوتا ہے کسی کی عزت نفس کو پامال کرنا۔ اس نے شوکر سے سامنے پڑا مچر بتایا اور پارک میں داخل ہو گیا۔ یہ رہائی کا لونی کا چھوٹا سا پارک تھا۔ جہاں شام کو بڑی رونق ہوتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ سبز فیضان کے نیچے کوڑھانے چلا جائے۔ مگر ان کے وقت میں پورا ایک گھنٹہ باقی تھا۔

"چلو آج تھوڑا آرام ہی سہی۔ کل سے سب شیڈ دل ایک گھنٹہ کے کر لوں گا۔"

وہ اندر ہی اندر حساب کتاب کرنے لگا۔ ایک دم پانچ کی ٹوٹی کا سوچ کر وہ پریشان ہو رہا تھا۔ حالانکہ آج میں امن مع تھی اور اس کی اقداروں کی تھوڑی سی تھی مگر وہ اس بد نظیر عورت کے منہ نہیں لگتا چاہتا تھا۔

"چلو اللہ مالک ہے۔ کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جائے گا۔" وہ سچ سے ٹپک لگا کر بیٹھ گیا۔ سامنے کچھ نیچے پٹ پٹ ہال کھیل رہے تھے۔ وہ دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھنے لگا۔ جب ایک بڑے میاں اس کے پاس آ کر بیٹھے تھے وہ اتنا خوش تھا کہ اس نے ٹوٹس ہی نہیں لیا۔

"میاں! آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ نئے آئے ہیں؟" بڑے میاں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ ایک دم چونکا بھرا نہیں سلام کیا۔

"والہم السلام! میں پوچھ رہے تھے کہ آپ نئے آئے ہیں یہاں؟" انہوں نے اسے سال دہرایا۔ وہ مسکرایا۔ میاں کا پرانا خواب تھا کہ ایک دن وہ کسی اچھی سی کالونی میں ایک اچھا، مگر خریدے۔ مگر موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ چاند کو پانے کی تمنا تھی۔ اس کی آنکھوں میں اپنے خواہوں کی کڑیاں چمکتی تھیں۔ اس کو خاموش پا کر بڑے میاں نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

"نہیں انگل! میں یہاں ٹیوشن پڑھانے آتا ہوں آج ذرا جلدی آ گیا تو یہاں بیٹھ گیا۔"

اس نے گول مول جواب دیا۔

"ارے میاں! یہ انگل کیا ہوتا ہے ایک تو ہم انی نسل کے انگلوں سے بہت ننگ ہیں کچھ میں نہیں آتا کہ چاہا ہیں کہ لانا ہیں۔ ویسے یہاں سب لوگ ہمیں دانتے جتے ہیں۔ چاہو تو تم بھی کہہ سکتے ہو۔ ہمارے پوتے تمہاری ہی عمر کے ہیں اور تمہارا نام یہ ہے؟" انہوں نے فوراً رشتہ بھی جوڑ لیا۔ وہ مسکرایا۔

"یہ نام عام ہے دادا میاں!" وہ بخور اس کے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ ہلکے پڑے۔ ان نے تینا کراپے چہرے پر ہاتھ بھرا۔

"حاف کرنا میاں! تم تمہارے گالوں کے گڑھے دیکھ رہے تھے۔ ایک بات کہیں تم

"میں نہیں۔"

"تم مسکرایا کرو اور اس کیلے میں مسکرایا کرو۔ دہت کسی کی نظر لگ جائے گی۔ ماشاء اللہ تمہاری طراوت بہت پیاری ہے۔ اللہ بخنے تمہاری داوی جب حیات تھیں۔" وہ سامنے لینے کوڑ کے اور رونق شکل بنائے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"میں میری داوی ابھی بھی حیات ہیں۔" اس نے گڑبڑا کر صبحی کی۔

"ارے تمہاری داوی یعنی ہماری شریک حیات۔" وہ ہنسا گئے۔

"لاحول ولا قوہ" زبردستی جوڑنے والے رشتوں پہاے ہلکے آگے جو اس نے بڑی مشکل سے بند کی۔

"ہاں تو ہم کہہ رہے تھے۔" انہوں نے سلسلہ کلام وہیں سے جوڑا۔ "تمہاری داوی کو یہ گڑھے بہت پسند تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کی اولاد میں سے کسی ایک کے ہی گالوں پہ گڑھے بنے ہوں مگر قسمت" وہ غلطی سامنے بھر کر رہ گئے۔ "ساری اولاد میں تم بخت مسکرانے میں کبھی اور اگر کبھی مسکراؤں تو دل کرتا ہے کہ یہی مسکرائیں۔" وہ طے دل کے پھوسلے بھونڈ رہے تھے۔

"ہم..... ہم سچ کہہ رہے ہیں۔ ویسے تو ہماری اولاد ہیں۔ ہمیں جان سے پیار ہے جس مگر بات ہے وہ ہے۔ اس میں کبھی شرم؟ اگر ہماری بیگم زندہ ہوتیں تو تم سے مل کر بہت خوش

"اُن۔"

ابا تک ہی اس کی نظر گھڑی پر پڑی تھی۔ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔

"باپ۔" اتنی دیر ہو گئی۔ اچھا دادا میاں! مجھے اجازت دیں میرا ٹیوشن کا نام ہو گیا ہے۔

ابا نے آپ سے ملاقات ہوگی۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا جو انہوں نے تمام لیا۔

"مل بھرا کا ہے؟"

"مل ہے۔ مگر مجھے آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔"



”ہم کو بھی تم سے مل کر بہت ہی اچھا لگا۔“ وہ سڑی منہ میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے اس کے چہرے پر چھوٹک ماری اور اس کا ماتھا چوم لیا۔  
”جاء بیٹے اللہ نظر بد سے بچائے۔ ہر پریشانی دور ہو، کامیابی تمہارے قدم چومے خدا حافظ۔“

وہ خاموشی سے اُن کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ٹھک کر اُن کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔  
سز فیضان کے گھر پہنچنے میں اب صرف دس منٹ باقی رہ گئے تھے۔ کبھی کبھی کسی کی سرسری باتیں بھی دل کو تھکا ہکا کر دیتی ہیں۔ یہ آج اسے اعزازہ ہوا تھا۔

☆.....☆

”داؤی“ وہ گھر میں داخل ہوا تو دارنی کو سامنے تخت پر سوتے ہوئے دیکھ کر ہچکچاہٹ رہ گیا۔ جب سے اُن کو لوگوں نے وہ گھر چھوڑا تھا وہ کبھی ان کے گھر نہیں آئی تھیں۔

اس کے والد ہر عید، بقرعید پر اس کو لے کر ماں کو سلام کرنے جاتے مگر وہاں ایسا استقبال ہوتا کہ سلام کرتے ہی وہ اپنی پلٹ آتے۔ جب سے وہ بیمار پڑے تھے یہ قہقہے بھی ختم ہو گیا تھا اور آج اتنے سالوں بعد رات کے ساڑھے گیارہ بجے وہ اُنہیں اپنے گھر میں سوتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ شاید بیگم اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے باور پنی خانے میں لے گئیں اور تحصیل سے بتایا۔

چلتا پھرتا ڈھوپ میں کوئی تین بجے کا وقت تھا جب دروازہ بجا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی انہوں نے تین بچوں کو سلا لیا تھا۔ اظہیر اور احمد بہت مشکل سے سوتے تھے۔ ابھی بھی انہوں نے جلدی سے بڑھ کر دروازہ کھولا کہ کہیں وہ اُنھیں نہ جانیں۔

”اتھاس! آپ؟“ سامنے ساس کو دیکھ کر وہ حیران ہی تو رہ گئیں۔ کچھ ان کا علیہ بھی ایسا تھا۔ سسلے پکڑے، اُٹھے اُٹھے بال، بے پناہ کمزور اور زرد چہرہ، جلدی سے ان کو اندر لائیں۔ بھوس پانی پلایا، گرم گرم روٹی پکا کر دی۔ وہ کتنی ہی دیر تک کھانے کو کھنگرتی رہیں تب انہوں نے خود نوالہ توڑ کر ان کے منہ میں ڈالا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ کھانے کے بعد وہ چائے بنا کر لائیں جیسے ہی وہ آ کر بیٹھیں اماں ان کے قدموں میں آ کر بیٹھ گئیں۔

”مجھے معاف کر دے، بہو! مجھے معاف کر دے۔ میں نے تم لوگوں کے ساتھ بہت برا کیا۔“

”بہو! نہی! انصافی کی۔ مجھے معاف کر دے۔“ شاید بیگم کو تو جیسے بھونے ڈنک مارا۔  
”اتھاس۔ مجھے کیوں گناہگار کر رہی ہیں۔ آپ اُنہیں اوپر نہیں لیں۔“ انہوں نے زبردستی اُن کی آغوش کراخت پر بٹھایا۔

”میں نے ہمیشہ تم لوگوں کے ساتھ زیادتی کی ہے جس کی سزا میں جگت رہی ہوں۔ انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا۔“ انہوں نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔  
”اماں یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ شاید بیگم ہانٹنے میں آ گئیں۔

”ہاں بہو میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ سب کچھ اپنے نام تو وہ پہلے ہی کروا چکا تھا۔ آخر کے ہانے کے بعد نے اس نے مجھے اور بھی بے عزت کر رکھا تھا۔ اس کی بیوی کو میری صورت سے پہلے ہی نفرت تھی۔ جھوٹی جی کر کر کے میرے بیٹے کو مجھ سے بدگن کر دیا اور آج اس نے مجھے ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیا کہ اس کو اپنے گھر کا ٹکھ چین بر باد نہیں کرے۔ ایک مہربانی کی کہ تمہارا بہتہ ہاتھ میں تھا وہاں رہنے والا یہاں چھوڑ گیا۔“ ان کی آنکھوں سے پانی بہے پنا چار ہاتھ۔

شاید بیگم نہ بڑا۔ غ نفروں سے اُنہیں دیکھ رہی تھیں۔ ایک زمانے میں ان کے غرور کا یہ عالم تھا کہ ان سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ مگر وقت کیسے کیسے رنگ دکھاتا ہے۔ انہوں نے ان کا منہ ہاتھ دھلوا دیا، اپنا ایک جوتا نکال کر دیا۔ اپنے ہاتھوں سے ان کے سر میں نل ڈال کر تھپکی کی۔ وہ ان کو اپنے تیار شوہر کے سامنے اس صلیب میں بیٹھنے لے جانا چاہتی تھیں۔ ورنہ ان کو بہت دکھ ہوتا۔

ماں کو دیکھ کر وہ کہتے ہیں آگے تھے۔ وہ بھی بیٹے سے لپٹ کر روئے جاری تھیں۔ شاید بیگم نے بڑی مشکل سے دونوں کو سنبھالا تھا۔ ان کے یہ کہنے پر کہ اماں اب ہمارے ساتھ ہی رہیں گی اماں ایک طرف خود عثمان احمد بھی چرک کر ان کی صورت دیکھنے لگے پھر جیسے وہ سب کچھ سمجھ گئے۔  
”میں نے ٹھیک کہا تھا۔“ شاید بیگم نے ساری داستان سنا کر پوچھا۔ جوا اس نے ایک لڑکی مانس بھری۔

”جی امی! آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ آج ہی سز فیضان نے بھی اُن کے لیے منع کر دیا کہ ان کے شوہر کا تبادلہ کسی دوسرے شہر ہو گیا ہے۔ نفروں کے آگے وہی بات کہہ کر وہ گھر سے گئے۔ جواب نہیں ملے تھے۔

تری یادوں کے گلاب

”پلو اللہ مالک ہے۔ میں کیوں ایسے سوچ رہا ہوں۔ ہر کوئی اپنا رزق ساتھ لاتا ہے۔ ورنہ میری کیا اوقات کہ میں کئی گورکھ سکوں۔“ یہ سوچ کر وہ اٹھ گیا۔ اماں اتنی پریشان لگ رہی تھیں کہ وہ انہیں ٹھونٹھونٹ ختم ہونے کے بارے میں بھی نہ بتا سکا۔ چپ چاپ جا کر لیٹ گیا۔

”عام“ راوی کی کمرہ سی آواز پر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”راوی جان آپ اٹھ گئیں؟“ اس نے بڑھ کر سلام کیا۔

”مجھے معاف کر دے بیٹا“ وہ ایک دم اس کے آگے ٹھکی گئیں۔

”راوی کیا کر رہی ہیں؟“ وہ بڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

”مجھے کیوں گناہگار کر رہی ہیں۔ یہ آپ کے بچے کا گھر ہے۔“ وہ ان کو ہاتھوں کے چلنے میں لے کر سمجھا رہا تھا۔ اس کا انداز دیکھ کر ایسا تھا کہ ان کے بچے میں دل کو قرا کر گیا۔

وہ ساری رات اس کی آنکھوں میں کی تھی۔ جن خاتون کے رعب و رپہ اور خشونت سے اس کا سارا بچپن ہم گزرا تھا ان کا یہ حال وہ دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے ان سے کوئی شکایت نہیں تھی بہت شکایتیں تھیں اپنے باپ کی معذوری کا وہ کہیں نہ کہیں انہیں حصار مانتا تھا مگر خدا گواہ ہے کہ اس نے کبھی ایسا نہیں چاہا تھا۔

☆.....☆.....☆

صبح وہ جلد ہی آنس کے لیے نکل گیا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ ابھی کوئی آیا نہیں ہوگا مگر یہ اندازہ غلط ثابت ہوا۔ سامنے ہی نرسن بنی ہوئی اپنی چیزوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ معمول کے مطابق وہ اس کو سلام کرتے ہوئے اپنے کہیں کی طرف بڑھ گیا۔

سلام کا جواب دیتے ہوئے نرسن نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی تو وہ مضحک کر رہ گئی۔ وہ بہت پریشان اور رُپ نہٹ لگ رہا تھا اس کا دل ہا ہا کر رہا تھا اس کے پیچھے جا کر پوچھے کہ وہ اتنے پریشان کیوں ہے۔ اپنی اس کیفیت پر وہ خود بھی حیران رہ گئی تھی۔ مگر پھر سر جھٹک کر وہ گئی۔

”میری پریشانی میں اس نے بھی تو میری مدد کی تھی پھر آج اس سے پوچھ لوں گی تو کوئی غلط بات تو نہیں ہوگی۔“ اس نے خود کو تسلی دی۔

”اوپر“ اس نے تہیاری جو ایک اخلاقی قصے سے کی تھی اور تم؟“ دل نے طعنے لگے۔

”نہیں میرے دل میں کچھ نہیں ہے۔“ اس نے بخفی سے اپنے آپ کو ڈانٹا اور چپکی ہو کر بیٹھی

تری یادوں کے گلاب

”مجھ۔۔۔ جان ابھی بھی اس کمرے کی طرف تھا جس کی لائٹ ابھی تک نہیں جلائی گئی تھی۔“

”سب کے آنے تک اور کام میں مصروف ہونے کے بعد بھی اس کا دھیان اسی کی طرف تھا۔“

”لاشعوری طور پر وہ پتھر دھکی کر کوئی اس بارے میں بات کرے۔ مگر کسی نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ خود عام بھی ہارل انداز میں کام میں مصروف تھا۔ مگر اس کی آنکھیں سب کہانی کہہ رہی تھیں۔ جب ہی اس پر انکشاف ہوا کہ وہ اس شخص کی آنکھیں پڑھ سکتی ہے۔ وہ دوسروں کے آنے لگے کہ ہر دے ڈال لے کر نرسن اس کی آنکھوں میں موجود ہر سوچ کو پڑھ سکتی ہے۔ وہ پھر غور کر رہ گئی۔“

پانچ بجتے ہی وہ سب سے پہلے نکل کر بھاگتا تھا مگر آج سارا سہ پانچ ہو گئے تھے وہ ابھی تانہ اپنے کہیں سے نہیں نکلا تھا۔ نہ جانے کیا سوچ کر نرسن نے بھی اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ وہ دوسرے کے غیر ضروری کام بننا رہی تھی۔ جب پونے چھ بجے کے قریب وہ جانے کے لیے نکلا وہ مٹی بندی سے سب چیزیں ایسے ہی چھوڑ کر اٹھ گئی۔

”سب آپ ابھی تک یہیں ہیں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”یہی سوال میں آپ سے کروں تو؟“ جواباً وہ اصرار سے مسکرائی تھی۔

”میں تو بس ایسے ہی.....“ وہ آگے کچھ بول نہیں پایا۔ اس کو آگے بڑھنے کا اشارہ کر کے پیچھے

پٹا لگا۔

”آپ کچھ پریشان ہیں؟“ بہت جھجک کر اس نے پوچھا۔

”واکیم دم چونک گیا۔“

”ہیں۔۔۔ اس او۔ کے۔ کوئی بات نہیں۔“ وہ مسکرایا تھا۔ آج پہلی بار وہ اس کی مسکراہٹ کو

دیکھ رہی تھی۔ اس کے گالوں میں پڑنے والے گہرے ڈبکے۔ سے عجیب

اور دلچسپ طرف توجہ کیا تھا۔ اس نے بے اختیار نظر سٹھکا لیں۔

”آپ کو بخیرین کیسے لگے نہیں جاتا؟“ تھوڑی دیر میں اس نے پھر سوال کیا۔ نہ چہرے

اور نہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس شخص سے باتیں کرے کہ وہ اپنا آپ کھول دے۔۔۔۔۔

”جی ہاں۔“

”جی“ وہ حیرت نظروں سے اچھڑ دیکھنے لگا۔ وہ کیسے جانتی تھی کہ وہ آنس کے بعد ٹھونٹ

نہ مانے ہا تھا۔ جبکہ اس نے کسی کو کبھی اس بارے میں نہیں بتایا تھا صرف صمیم صاحب اور



فیکٹری کے سپرد ان کے شہساز بیگ صاحب جانتے تھے۔ پھر یہ لڑی.....

”آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں؟“ وہ جملہ عمل نہیں کرنے پایا تھا کہ نسرین کو اپنی لفظی کا احساہ ہوا۔ وہ جلدی سے اسے خدا حافظ کہہ کر سامنے سے آنے والی بس میں سوار ہو گئی جبکہ وہ حیرانی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆.....☆.....☆

اس دن وہ بہت دنوں بعد فیکٹری کی طرف آیا تھا۔ ساتھی اور کروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا کیونکہ نزدیک اب وہ بہت بڑا آدمی بن چکا تھا۔ وہ ان کی سادہ لوحی پر فیس پڑا۔ سپرد ان کے شہساز بیگ صاحب کے کمرے کی لائٹ جلتی دیکھ کر وہ ہیں آ گیا۔

”میں اندر آ سکتا ہوں سر؟“ دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے اجازت طلب کی اور وہ اس کو دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔

”ارے تم آؤ بھی۔ ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ اب تو تم بڑے آدمی ہو گئے ہو۔ ہم لوگ یاد ہی نہیں رہے۔ کیوں؟“ سامنے بڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ مسکراتے۔ وہ بھی ہنس پڑا۔

”جانتے ہیں سر! کیوں مذاق کرو ہے ہیں؟“

”ارے مذاق کی کیا بات ہے۔ تم دیکھنا۔ ایک نہ ایک دن تم بہت آگے جاؤ گے۔ یہ میرا تجربہ کہتا ہے۔“ انہوں نے قہر سے اشارہ کیا اور وہ مسکرا کر رہ گیا۔

”عامم! میں تم سے ایک بات کہنا چاہ رہا تھا۔ اگر تم نہ انا تو تو.....“ کچھ لمبے وقفے کے بعد انہوں نے کہا۔

”کیسے سرا میں آپ کی کئی بات کو ماننا نہیں کرتا۔“ اس نے ان کی طرف دیکھا۔

”تمہارا شادی کا کیا ارادہ ہے؟“ انہوں نے آہستہ سے پوچھا۔

”جی سر! شادی؟“ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ روٹی کپڑے اور مکان کی لکڑی سے نجات ملے تو انسان کچھ اور سوچے۔ جب ہی وہ ان کی یہ بات سن کر حیران رہ گیا۔ ورنہ بات کچھ ایسی تو تھی۔

”ہاں تمہارا شادی کا کیا ارادہ ہے؟“ انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔

”سرا آپ تو جانتے ہیں میں ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔“

”بیٹے پوزیشن تو کین چلتی ہے۔ اگر کوئی چاہے تو؟“ وہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

نہری یادوں کے گھار

”سر میں بالکل نہیں سمجھ پا رہا۔ آپ مجھ سے یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں؟“ وہ واقعی حیران تھا۔ اس سے کبھی کبھی کی ایسے ذاتی موضوع پر گفتگو نہیں ہوتی تھی۔

”عامم میری بھتیجی ہے۔ ماں باپ گزر چکے ہیں۔ میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔ مگر عورتوں کی اہمیت تو تم سمجھ ہی سکتے ہو۔ میری بیوی اس کے ہمارے ساتھ رہنے پر خوش نہیں ہے۔ بے چاری امانت بند کیے رکھتی ہے۔ میں کچھ کہتا ہوں تو اس کی اور زیادہ شامت آ جاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی شادی کروں۔ میری بیوی اپنے بھائی سے اس کا رشتہ جوڑنا چاہتی ہے۔ مجھے وہ لڑکا باطل بھی پسند نہیں ہے۔ عجیب آدمی ہے اس کے انداز میں۔ میں اس کے لیے تمہارے جیسا لڑکا چاہتا ہوں۔“ وہ تفصیل بتاتے چلے گئے۔ آخری جملے پر وہ اچھل پڑا۔

”میں؟ سر میرے پاس ایسا کیا ہے جس کی بنا پر آپ یہ سوچ رہے ہیں۔ میرے پاس تو ایک آدمی ہے۔ نہ تو فیکٹری میں بھی نہیں ہے۔ میں تو آپ کی بھتیجی کو پیٹ بھر کھانا بھی نہیں کھلا سکتا۔“ وہ انتہائی بیٹھا۔

”بیٹے! صرف پیٹ بھر کھانے والے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ میں اس کے لیے ایک شیف بھجی اور باکرو لڑکا چاہتا ہوں۔ ایک ایسا ساتھی جس کے سراپے میں اس کا کردار جھلکتا ہو۔ جس کا لہجہ سچا اور نظریں پاکیزہ ہوں۔ ایسے لوگ کبھی نہیں ہارتے۔ آج نہیں تو کل وہ ضرور کامیاب ہوتے ہیں اور تم ان ہی میں سے ایک ہو۔ وہ اس کے چہرے پر اپنی نظریں جمائے۔ اسے تھے۔“ اور جہاں تک وقت کی روٹی کھانے کا تعلق ہے وہ خود بھی جاب کرتی ہے اسی فائن میں۔ تم جانتے ہو گے اُسے۔“

”اسی آفس میں؟“ وہ حیران ہوا۔ ”کون؟“

”نسرین نام ہے اس کا۔ ری پکشن پر ہوتی ہے۔“ وہ بتا رہے تھے جبکہ اس کے کانوں میں دن نام کوئی رہا تھا۔

”نسرین ان کی بھتیجی ہے۔ جیسی اس کو میرے بارے میں سب کچھ پتا تھا اور شاید اپنے والد کی وجہ سے وہ اس دن رو رہی تھی۔“ یہی بھر میں سب کچھ واضح ہو گیا۔

”سر! نسرین جیسی لڑکی سے رشتہ جوڑنا میری خوش نصیبی ہوگی۔ لیکن سر میں واقعی اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ شادی کر کے بیوی کی ذمہ داری اٹھا سکوں۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔“ اس نے ابجد بجم تھا۔

”جئے اگر تم راضی ہو اور اپنے گھر والوں سے بات کر سکو تو میں انتظار کرنے کو تیار ہوں۔“

مگی اپنی بات پر قائم تھی۔ ”مطلب اگر تمہیں یہ روشہ منظور ہو تو؟“

”جی۔“ اس نے بے سکون انداز میں جواب دیا۔

”آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوا؟“ عاصم نے ایک نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”اعتراض کس بات کا؟ آپ میں کس چیز کی کمی ہے جو میں اعتراض کرتی؟“ اس کے احوال

میں قوتہ ہر اہر فرق نہیں آیا تھا۔

”مس! آپ جانتی ہیں کہ میرا قتل کوئی ویل آف فیل سے نہیں ہے۔ ویل آف فیل تو کیا میرا قتل تو ایک نہایت غریب فیل سے ہے۔ میری یہ جاب عارضی ہے اور آل میرے پاس ایسا کچھ بھی نہیں ہے جس کی بناء پر کوئی مجھ سے شادی کرنا چاہے۔ یا میں کسی سے شادی کا سوچوں۔ کم از کم اس سٹیج پر آپ میری بات سمجھ رہی ہیں ناں؟“

”حق میں بہت اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ لیکن میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ اگر کیا یا تو آپ کو میرے لیے مناسب سمجھتے ہیں تو میں ایک نقطہ بھی نہیں کہوں گی۔ چاہے آپ کے پاس کچھ ہو یا نہیں۔ لیکن اگر میری رائے جانا چاہتے ہیں تو مجھے صرف ایک ایسا مسطر چاہیے جس کے پاس بھلہ دلت نہ ہو مگر وہ ایک سچا اور کھرا انسان ہو۔ عورت کی عزت کرنا جانتا ہو اور بس۔ آپ میں یہ خوبیاں میں نے دیکھی ہیں۔“ اس نے بڑے سکون انداز میں اپنا نقطہ نظر واضح کیا۔

”میں آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں۔ میں آپ کو صاف صاف بتانا چاہتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ میں اپنے والدین کا انکلوٹا بیٹا ہوں۔ میرے والد کا قے کے مریض ہیں۔ میرا گھر کرائے کا ہے۔ میں گھر کا واحد کھیل ہوں۔ جبکہ میرے گھر میں والدین کے علاوہ میری رادی اور میرے تین چھوٹے کزنز بھی رہتے ہیں۔ جن کی پڑھائی اس وقت میری سب سے بڑی اڑے داری ہے۔ میری تحفہ آؤ خدہ ہزار روپے ہے۔ اس کے علاوہ میں ٹیوشن پڑھاتا تھا جو ابھی کچھ دن پہلے ہی ختم ہوئی ہے۔ اور اب میں دوسری ٹیوشن کی تلاش میں ہوں۔ اس کے علاوہ میں ایک دو بڑی بڑی روکائوں پر حساب کتاب کا کام کرتا ہوں۔“

میں سمجھ لو جہاں سے چار پیسے جائز خرچے سے مل جائیں وہ کام کر لیتا ہوں۔ میں آپ کو یہ  
اٹل لیے بتا رہا ہوں کہ میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اتحاد فیصلہ طاعنی میں کریں۔ یہ میرے حالات اور  
میرے اچھے دوستوں ہیں۔ میں نے سب کھول کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب ایک بات ضرور  
کہوں گا کہ حالات خواہ اچھے ہو جائیں یا خیر بگڑ جائیں۔ میں اپنی ذمہ داریوں سے کبھی منہ نہیں

”سر پہنچو بھی بات کرنے سے پہلے میں سرین سے بات کرنا چاہوں گا۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو.....“ اس نے دُرتے دُرتے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے اس اعتماد پر وہ ہنس دیئے۔

”کیوں نہیں۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ تم آج ہی اس سے بات کر سکتے ہو۔“

”لیکن سر میں آفس میں بات نہیں کر سکتا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کہیں اور۔۔۔“ وہ کہتے کہتے جبکہ کراڑک مچا۔

”ٹھیک ہے بیٹے! مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔“

”جیک یویری چی سر؟“

”اور گھر رب خیریت ہے؟ بابا کیسے ہیں تمہارے؟“ تنگکو کا موضوع بدل چکا تھا۔  
شام کو چھٹی کے بعد وہ نسرین کی نعل کے پاس آیا۔ وہ اپنی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ آج بھی وہ سفید شلوار اور دوپٹے میں لباس تھی۔ تنگکے آسانی لان کے کمرے پر سفید کڑھائی تھی۔  
”ایک سیگڑی مس! میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے شائستگی سے اسے مخاطب کیا۔ وہ ایک دم چونک گئی۔

۱۱۱

”جیسی یہاں نہیں۔ کیا آپ تھوڑی دیر کے لیے میرے ساتھ چل سکتی ہیں؟“ اس نے شائستگی سے کہا۔

”جی... جی... جی... جی؟“ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”جی۔ ڈونٹ وری۔ میں نے شمشاد بیک صاحب سے اجازت لے لی ہے۔ آپ جا ہیں تو ان کو کالٹ کر کے پوچھ سکتی ہیں۔“ وہ اس کو دیکھ کر رو گئی۔ ایک لمحہ کو سا چمچ پر بس اٹھالیا۔

”آئیے۔“ اس نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

دلوں آگے پیچھے چلتے ہوئے آفس سے نکل آئے۔

”میں آج شمشاد بیک صاحب نے مجھ سے ایک بات کہی ہے۔ کیا آپ اس کے بارے میں جانتی ہیں؟“ وہ آفس کے قریب واقع ایک پارک میں بیٹھنے لگی۔ یہ نرسن کی تجویز تھی وہ ان دوسری لڑکیوں کی طرح کسی بونک یا کافی شاپ میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ جو آفس ہاؤس کے بعد کسی نہ





”جی ہاں“  
 ”تو اترتے تھے وہاں؟“  
 ”جی ہاں۔“  
 ”آپ کا پورٹ فولیو میں نے دیکھا ہے۔ مگر کیوں ہیں؟“  
 ”جی ہاں۔“

”پھر آپ جہل لبر میں کیا کر رہے تھے۔ مطلب آپ پڑھے لکھے ہیں کسی ڈسٹک کی لائی میں کیوں نہیں گئے؟“

اس سوال پر وہ ہنستا گیا۔ جی تو چاہا کہ کہہ دے کہ مجھے شوق تھا ایک اچھی معقول نوکری چھوڑ کر مزدور بننے کا۔ مگر وہاں لائی تھی۔ یہ جواب صرف دل میں دیا جاسکتا تھا۔

”سرخچے ضرورت تھی۔“

”آپ اس وقت اس پوسٹ پر ایڈیٹر تھے؟“

”جی ہاں“

”عامر صاحب! آپ ہمارے ساتھ بیچھلے آٹھ مہینوں سے کام کر رہے ہیں۔ ہم نے آپ کو ہمیں طرح آجہدو کیا ہے کہ آپ اس سیٹ کے لائق ہیں یا نہیں اور آج ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ”انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کو دیکھا۔ وہ حیدر کی آغوشی منزلوں پر تھا۔“

”یہ آج دیکھو“ انہوں نے سسکراتے ہوئے ایک بند لٹافہ پڑھایا۔ وہ ساکت بیٹھا رہا۔ اس نے کہیں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

انہوں نے دوبارہ کہا تو وہ ہوش میں آیا۔ لڑتے ہاتھوں سے وہ بند لٹاؤ اس نے قہقاہہ سے۔ وہ اپنا منٹ لیٹر تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کی کیفیت ایسے صحرائوں کی طرح تھی جو زور سے سراب کا تقاضا کر کے بے حال ہو چکا ہو اور جب وہ تھک کر گر جائے تو وہاں بس جائیں۔

”سفرِ ماسم! اہم آدمی صاحب نے اسے حوجہ کیا۔ وہ اچکھم ہوش میں آ گیا۔“  
 ”جینک ہوسر جھینک یویری گج۔“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ کتنا کڑا انتظار کیا تھا اس  
 دن ایک لمحے کے لیے۔

”اں کی ضرورت نہیں ہے۔ بیٹا آپ کی محنت کا نتیجہ ہے۔ ہم آپ کو فی الحال بیس ہزار دیں





ملائی ہوئیں اور جب کھڑی ہی نہ ہوئیں گی تو کیا خاک بس اسٹاپ پر بس کا انتظار کر کے اس عمارت کے استعمال کا موقع مل فرام کرئیں گی کہ بھی عمارتوں کے گروہ ہے۔ "ذریاب کھڑی ہل کوری اور پھر کھٹکھٹا کر بولی۔

"کیسے اس ویم ایس سی کی اسٹوڈنٹ نے کسی تھریغ کی آپ کے عمارت کی۔ دیکھ رہی ہیں اماں جی آپ اس کی زبان۔" انیشا مسکرائی۔ "آپ تو کہتی ہیں کہ لڑکیوں کو اتنا نہیں ماننا چاہیے۔"

"اور سے اس ٹھیک ہے۔" اماں جی نے ذریاب کی طرف متا مہر نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اپنے ہی گھر میں تو بول رہی ہے اور کہاں جائے گی بولے۔ یہی تو زمانہ ہے بیٹا تم لوگوں کے بننے بولنے کا۔" پھر وہ آزدہ لہجے میں بولیں۔

"خدا تم لوگوں کے نصیب ایسے کرے۔ لڑکیاں تو اپنے پیکے میں بس ایک چلتا پھرتا سایہ ہیں۔" اماں جی کی ہلکی سی جھلکی چلیں۔ ذریاب نے ماحول کی سنجیدگی دیکھ کر فوراً چٹکلا چھوڑا۔

"ارے اماں جی۔ میرا چلتا پھرتا سایہ تو کہیں جاتا جاتا نہیں۔ یہ تو جوت کی طرح آپ سے پناہ ہے گا۔ ہاں اب آپ جلدی سے آپا کے ہاتھ پٹے کر دیں۔ دو سال ہو گئے انھیں ملازمت کرتے ہوئے۔ اب تو ان کا جینز بھی تیار ہو چلا ہے۔"

"کوہست جی تم! انیشا کا چہرہ حجاب سے گلاب ہو گیا۔ پھر وہ سی جلد پکس جھپکاتے ہوئے بولی۔

"اماں جی آپ نے وہ بھائی صاحب کا رشتہ تو کھٹائی میں سی ڈال دیا اور پشاپ اسکی ٹری جی نہ تھی۔ بس ذرا رنج سا نوالا ہے۔"

"نہیں رنج۔ دیکھ کا کیا ہے اللہ نے دیا ہے۔ لیکن جانا اتنا بڑا گھر انہیں دس نہیں آ سکتا۔

میں اپنی حیثیت دیکھ کر سی آگے بڑھنا چاہیے۔" اماں جی نے بھائی ٹیلیفون سینے دیکھ کر ذریاب کا ہاتھ خود سی آواز دے دی گئی۔

"رضیہ ہوا۔"

"ماضر سائیں! ذریاب آگے بڑھ کر ہاتھ باندھے سامنے آ کھڑی ہوئی۔" رضیہ ہوا ان مرثام ہی چلی گئیں ان کے سر میں درد نقاب یہ ہوا ذریاب حاضر ہے۔" انیشا کھٹکھٹا کر ہنسی۔

## اور فضا میں گنگنا اٹھیں

انیشا نے کٹھمی دیکھی اس میں بہت سے بال اٹکے ہوئے تھے سامنے سی ای بیٹھی ہوئی تھیں۔

"تو کچھ رہی ہو اپنے بالوں کا حال۔ سو بار کہا ہے کہ بٹھے میں دو تین بار سر میں تھوڑا سا تیل ڈال لیا کرو اور سیکا کاٹی سے سر دھو کر دیکھیں انیشا بی بی ہیں کہ جھاڑ جھکاڑ سونگے بال لٹکائے لٹکائے پھرتی ہیں۔ سو اگر کی چوٹی آدھی بھی نہیں رہی۔"

"اماں جان اتنا وقت کہاں ملتا ہے کہ ہم یہ سب کھڑاک کریں۔ انیشا کے چہرے پر ایک لخت تھکن کے آثار یہ ابھرنے لگے۔"

"اب دیکھیے کہ کاٹی سے دایسی ہوتی ہے تو گھر کے کام نکل آتے ہیں پھر کم بخت آنے جانے کا خراب بھی آپ کو جو روز میں بیٹھنا پڑ جائے تو کانوں کو ہاتھ لگا کر گھر بیٹھ جائیں۔ ایمان سے اماں جی بڑا دل گروہ ہے عمارت آپ انہیں معلوم۔"

"آپ انیشا یہ دل گروہ سے کیا عمارت ہے کیا؟ ہمارے پٹے تو پڑا نہیں۔" ذریاب فوراً بول پڑی۔

"ابھی لپے تو کیا ہے بزرگوں نے بی بی کہ تھوڑا سا ادب بھی پڑھنا چاہیے۔ اب دیکھو یہ عمارت اگر کہیں کسی منظر میں کوئی استہلال کرتا تو تم تو بس ہونٹوں کی طرح مدھنکتی رہ جاتیں۔"

"گاہے کوہستہ روتے رہ جاتے واہ....." ذریاب نے اپنی بی بی کی چٹکتی آنکھیں چھرائیں۔

"آپ ادب کے حوالے سے دل گروہ کی طاقت ثابت کرتیں تو ہم سائنس کے ذریعے سے دل گروہ کے فوائد ثابت کرتے کہ قرآن کی جسم میں منہ دو کی کا کیا جواز ہے اور اگر یہ دونوں بھی یعنی دل اور گروہ صحت مند نہ ہوں تو حلال ہے کہ آپ اپنے پیروں پر



ترقی یادوں کے گلاب

"پلو پھر ہم دونوں ہی مل کر کام سیٹ لیں۔" اس نے جواب کے ہاتھ میں دُش پکڑاتے ہوئے کہا۔

"آپا انیشا یہ سب میں کرلوں گی۔ آپ اماں جی بھیا کے دھنے کی بات پکی کر لیں۔ اب اس گھر میں بہو کا آنا ضروری ہو گیا ہے۔ ہاں اماں جی تھائی سے بہت گھبرائے گی ہیں۔"

"تم بھی ٹھیک کتنی ہوزر باب۔ اچھا پلو پہلے میں ذرا ہاتھ دھو لوں پھر اماں جی سے باتیں ہوں گی۔ ہاں یہ بھائی صاحب کہاں رہ گئے۔"

"نیکئی تو بد قسمتی ہے ہمار کی۔" زور باب نے منہ بنا کر کہا۔

"اتنی محنت سے تو آج ہم نے کھانا پکا یا اور وہ چلے گئے اپنے دوست کے گھر دعوت اڑانے۔"

"اس کا پروگرام پہلے سے بنا ہوا تھا۔" اماں جی بولیں۔

"تم نے اس سے پہلے پوچھ لیا ہوتا۔"

"میں ذرا کچھ انکشاف کرنا چاہتی ہوں اپنی قابلیت کا۔ ان سے اس طرح پچکر دکھانے کا وعدہ بھی تو لیا تھا۔" زور باب جاتے جاتے بولی۔ وہ پھر دروازے پر دنگ مچی۔

"آپا انیشا اٹھا پروگرام آپ کے کھانے کا ہے۔ ابھی سے طے کر لیں کہ آپ کیا کھلا رہی ہیں اگلے ہفتے۔"

"واہ ابھی سے کیوں بتائیں۔ ہم ایک نئے دُش کھلائیں گے۔ بس اتنا بتا دیجئے ہیں کہ اس میں جدت ہوگی۔"

"سمجھ مچی میں۔" زور باب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"پرس خوب بھاری ہو رہا ہے نا آپ کا تھوڑا مل ہوگی۔"

"جی نہیں محترمہ گنواؤ کا معاملہ تو کھائی میں پڑا ہوا ہے۔ کل نیچر ڈاک ایک وفد ڈائریکٹر تعلیمات سے بھی ملا تھا، دیکھیں کب معاملہ بنتا ہے۔ یہ تو اپنی پورٹ ٹائم ٹیوشن کا زمانہ ہے چھا۔"

"میں نے کتنی بار تم سے کہا ہے کہ یہ ٹیوشن وغیرہ چھوڑ دو۔ لی ایڈ کیا کیا تم نے کہ اس مشین کی طرح ٹھٹھکی ہو۔" اماں جی نے غصے سے کہا۔

اماں جی میں وقت ضائع کرنے کی قائل نہیں۔ ہم سب کی محنت نے ہی اس گھر میں

ترقی یادوں کے گلاب

وہاں کے دروازے کھول دیئے ہیں۔" انیشا نے اماں جی کے گلے میں باپیں ڈال دیں۔

"اب آپ تو بس بھائی جان کی شادی کا معاملہ نشا دیں پھر ہمار کی اس چھوٹی سی جنت میں بہا رہی بہار ہوگی۔"

اماں نے انیشا کے ماتھے پر پیاد کرتے ہوئے اسے اپنی گود میں لٹالیا اور بولیں۔

"ایک آدھ دن بعد تم پچھنی لے لو تو ہم بیگم زبیدہ کے ہاتھ جا کر لڑکی دیکھا نہیں۔ انھوں نے ایک لڑکی دکھانے کو کہا ہے۔"

"اماں جی آپ بیگم زبیدہ کے پتہ میں تو نہ پڑیں۔" انیشا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "یہ شادی کے ارے تو پیسے اٹھنے کے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔"

"اور سے نہیں بی۔ اب دیکھو اکھار صاحب کی دو لڑکیوں کی شادی آخر بیگم زبیدہ ہی نے کرائی ہے۔"

"بھیس تو انھوں نے اب تک پکڑ ہی لگوائے ہیں بس۔" انیشا نے حیرت بھری سے کہا۔

"بھئی کسی جج کی لڑکی دکھائی ہے تو کبھی کسی سی ایس بی ایس بی آفیسر کی بہن اور آپ بڑے گھر کی لڑکی کے لیے راضی نہیں ہوتیں۔"

"چند اکاشف میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ اپنی چار سے زیادہ بیویاں کر میں بیٹا کھونا نہیں چاہتی۔ مجھے نہیں چاہیے یہ دولت دولت۔ میں تو بس سیدھی سادی گھر لڑکی چاہتی ہوں تاکہ میرے گھر میں چراغ جلتا رہے اور پھر جوڑے آسانوں پر لگے ہوتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو یہ شرط بھی طے ہو جائے گا۔ تم پر سوں کی چھنی لے لو تو ہم جا کر لڑکی دیکھتے نہیں۔"

"اماں میں بھی چلوں گی۔" زور باب بولی۔

"بائی تم کیا کرو گی جا کر۔ کوئی مجھ لگاتا ہے۔ بس میں اور انیشا چلے جائیں گے۔"

"اور لی زریاب۔" انیشا بولی۔

"وہ جو آپ کھانے کے بعد ایک ایک پیالہ چائے پلا کر کرتی ہیں وہ کیا ہو گئی؟"

"اللہ آپا انیشا ہم بہت تھک گئے ہیں آج۔" زور باب نے منہ بنایا۔

"مرضی غدو کی۔" انیشا نے مصنوعی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"آج اللہ میاں نے مقدہ میں پائے نہیں گھسی۔"

"پلو میں بنائے دیتی ہوں۔" اماں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اے اماں جی آپ.....“ انیشا بھی بڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اماں جی بھریں ہی طے دیتی ہوں۔“ نور باب نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

”کوئی بھی نہیں۔ تم دونوں جاؤ کرے میں۔“ اماں جی نے حکم لگایا۔ اب کس کی مجال تھی

جو چوں بھی کرے۔ تھوڑی دیر بعد چائے پیتے ہوئے انیشا سوچ رہی تھی کہ اللہ میاں نے ماں کے پاؤں تلے جنت بلاجہ تو نہیں رکھی اور کیا آسمان والی جنت اس جنت سے زیادہ دلکش ہو سکتی ہے جس میں وہ سانس لے رہی ہے۔

اور واقعی اماں جی کے تدبیر اور سوچہ بوجھ نے اس چھوٹے سے گھر وندے کو ایک جنت کا روپ دے رکھا تھا۔ جہاں دولت کی ریل ٹکڑی تھی لیکن طمانیت کا بیش بہا خزانہ تھا۔ سکون اور مسرت کے خوشگوار جھونکے تھے کہ ہر فرد اپنی خیر سوسائیاں اپنی خیر بادشاہت۔ اماں جی نے گھر کے ہر فرد میں اپنی اپنی ذمہ داری کا بھرپور احساس بٹا کر رکھا تھا اور ایک جگہ بھی ادھر سے ادھر نہ ہوسکا۔ کاشف نے اپنی تعلیم ختم کر کے ملازمت ڈھونڈ لی اور اپنی جید و جہد سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ انیشا نے تعلیم ختم کر کے ملازمت نہ ملنے تک ٹیوشن کر کے اس گھر وندے کو سپارادہ دے رکھا اور ذریعہ اب اپنی تعلیم کی تکمیل کے آخری مراحل سے گزر رہی تھی اور اب اماں جی کی خواہش تھی کہ پہلے انیشا کی ذمہ داری سے فارغ ہو لیں تو بھولائیں لیکن انیشا اور نور باب کا اصرار تھا کہ آئینہ میں پہلے بھابی کے کھنڈے کا چاند چمکے۔ چنانچہ بیگم زہیدہ کے تھکان سے لڑکیاں دیکھی جا رہی تھیں اور اب کہ جب بیگم زہیدہ انھیں لڑکی دکھانے لے گئیں تو صورت حال دیکھا چاک ہی بدل گئی۔

اماں جی کو گھرانہ بھی پسند آ گیا اور لڑکی بھی۔ بس بات یہاں انگی کہ کاشف میاں لڑکی کی تصویر دیکھ کر مایہ جبروئیں تو نہ بیٹھا کر دیا جائے۔ لیکن شادی سال بھر بعد ہونے لگی تھی۔

اماں جی اپنی ہونے والی سحرین فاراد بیگم سے ان ہی مسائل پر گفتگو کر رہی تھیں۔ اس موقع پر فاراد بیگم کی ایک دُور کے رشتہ کی بہن عابدہ بیگم بھی موجود تھیں۔ اماں جی چاہتی تھیں کہ فاراد بیگم سال بھر کی مدت میں کچھ کی کر دیں۔ جب عابدہ بیگم ہنس کر بولیں۔

”بہن پہلے آپ کاشف میاں کا عقد پتہ تو لے لیں۔ ابھی تو یہ مرحلہ بھی باقی ہے۔“ اماں جی نے غصے سے کہا۔

”عابدہ بیگم یہ تو آپ صرف دیکھ کر دانی سمجھیں۔ خدا کے فضل سے میں نے اپنے بچوں میں خود بخود ہی کے احساس کے ساتھ ساتھ ذمہ داری اور خود اعتمادی کا بھرپور جذبہ اور حالات سے

ہاں کی قوت بھی اُجاگر کر رکھی ہے تاکہ زندگی کے کسی بھی سوز پر ان کا عمل اخلاقی سوچ کا حامل نہ ہو۔ لیکن انسانی سوچ کے بغیر انسان کی شخصیت نامکمل رہتی ہے۔

عابدہ بیگم کو اماں کا یہ انداز بھانپ گیا اور پھر روز بروز بعد ہی وہ بیگم زہیدہ کے ہمراہ اماں جی کے گھر میں موجود تھیں۔ انھوں نے انیشا کو مانگ لیا اور اماں جی بھی ہنسی کا رخ کر گئیں۔ وہ شروع ہی سے اپنی برابری کے لوگوں میں رشتے کی قائل تھیں اور عابدہ بیگم لاکھوں کی جائیداد کی مالک تھیں جس کا حجاب وارث ان کے بعد ان کا انکلوٹا عاقل تھا۔ شوہر کے چاک اپنا انتقال کے بعد عاقل ہی اب ان کی کل کائنات اور مرکز زندگی تھا۔ وہ چاہتیں تو دیکھیں ابیں دیکھیں کی بنی بیادواتیں لیکن انھیں محض عاقل کی پیروی کی ضرورت نہ تھی انھیں ایک بہو بھی چاہیے تھی جو انھیں سمجھ سکتی۔ ان سے نباہ کر سکتی اور اماں جی سے ملنے کے بعد انھیں اماں جی کی بہت سی خوبیاں انیشا میں نظر آئیں لیکن اماں جی تھیں کہ کسی طرح اس رشتے پر راضی ہوتی نظر نہیں آتی تھیں۔

عابدہ بیگم نے نماز عاتر نہیں بلکہ سچ سچ اپنی اپنی جوتیاں گھسالیں۔ وہ پہلی بار اپنی کار میں آئیں اور اس کے بعد ان کی کار بھی اماں جی کے دروازے پر نہیں دیکھی گئی۔ وہ اماں جی کے پاس آتے وقت کار کو آدھ میل پر سے چھوڑ دیتیں اور پیدل آئیں۔ پھر ان کی والدہ بھی اس طرح ہوتی ہلا خراں کی یہ اور اماں جی کے دل میں اثر گئی۔ انھوں نے ڈنگا تے دل سے حافی بھری اور بھر چنہ معمولی جڑوں اور ہلکے پھلکے زہر کے ایک سیٹ کے ساتھ ماسا کی ڈیجیٹل دعاؤں کے سائے تلے انھوں نے انیشا کے کونپے کے گھر سدھار دیا۔ یہی عابدہ بیگم کی بھی خواہش تھی۔ انھوں نے جہیز لینے سے سختی سے انکار کر دیا تھا اور اماں جی کے سامنے ہاتھ تک جوڑ لیے۔ اماں جی کو بیٹی کی سسرال کی خوشنودی بھی مزید تھی اور پھر ان کے لئے سب سے بڑی دولت تو عاقل تھا انیشا کی زندگی کا رشتہ اور نمکسار۔

اس محل لڑکھئی میں آکر انیشا گھبرا گئی۔ اس نے اب تک امارت کی صرف شہرت سنی تھی یا ایسی شاندار کوکھیاں غلوں میں دیکھی تھیں۔ اس نے تو کبھی بھول کر بھی ایسا کوئی خواب نہیں دیکھا تھا جہاں قدموں تلے تھلیں فرش بچے ہوتے ہیں اور خواب گاہیں دوایتی شہزادوں کے کمروں کی طرح آراستہ ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ محسوس کرتی کہ وہ واقعی بیداری کے عالم میں نہیں لیکن ابھی اس کے اہلناہن کے دن ختم نہیں ہوئے تھے اور خوابیدگی کا یہ عالم اسے بہت بھلا لگ رہا تھا مگر یہ خواب تھا تو وہ چاہتی تھی کہ وہ اس خواب سے کبھی نہ جاگے لیکن وقت کو کبھی قرا نہیں ہوتا۔ وہ کبھی ختم نہیں



رو جاتا اور اس کے دلہانے کا وقت بھی گزر گیا۔ جب اس نے دھیرے دھیرے گھر کی دیکھ بھال کے کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ عابدہ بیگم بھی چاہتی تھیں۔ نوکروں کی چاہے ایک فوج ہی کیوں نہ ہو لیکن گھر والی کی توجہ سے بغیر گھر گھر کے بجائے مسافر خانے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ دولت کی فراوانی کے باوجود عابدہ بیگم کی سرگرمیاں گھر کی چار دیواری تک محدود تھیں۔ انھیں بکریوں اور پارٹیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ نام نہاد سوشل ورک کی بھی قائل نہ تھیں۔ ان کے نزدیک صحیح معنوں میں سوشل ورک یہی تھا کہ عورتوں میں اپنی ذات کو بھٹکنے اور پچھانے کا شعور پیدا ہو جائے۔ اس کے بعد عورت چاہے کسی سڑک کی پتھریلی زمین پر بیٹھ کر روزگار حاصل کرے یا سگریٹ کے بجنگے پر دے پر اپنے آپ کا مظاہرہ کرے، اس کی شخصیت میں ایک وقار ہو گا۔ ذوقِ قادرِ جود بھیننے والی نگاہوں میں ہوس کی چنگاڑیوں کو پھینا کرنے کے بجائے احترام کے دھجے دم چرائیں روشن کر دیتا ہے۔

انیشتادہ ماٹک نادلوں اور کہانوں کی بیرونی طرح ہے پناہ مہین نہ تھی۔ نہ ہی قدرت نے اسے بادامی اکھیں عطا کی تھیں۔ چلتے وقت اس کی کمر میں تل بھی نہیں پڑتے تھے۔ لیکن چال میں ایک دم دار عورت کا سا وقار ضرور موجزن ہوتا تھا۔ بالکس بھی اتنی لمبی نہ تھیں کہ وہ دھوا فوٹو پارحیا سے ٹھک جاتیں لیکن وہی بالکس اپنے سے بڑے کو سامنے دیکھ کر احترا تھک جاتیں تاکہ نگاہوں کو بے باکی سے اٹھنے کا موقع نہ ملے۔

خودداری اس کے کردار کا سرمایہ تھی۔ لیکن خودداری کی حد تک نہیں۔ یہی اماں جی کی تربیت تھی وہ جانتی تھی کہ شادی کے بعد کی زندگی کسی آزمائش کی زندگی ہوتی ہے۔ ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ عورت کو وہاں میں ہی ملے صراط کی دھار پر چلنے کی لذت سے آشنا ہونا پڑتا ہے اور عادتِ قدم رہنے پر پیدایا ہی جنت نظر آنے لگتی ہے۔

انیشتادہ کبھی ایسے ہی آزمائشی لمحوں سے پار باز نہ ہوتا۔ عاطف اس کا محبوب تھا لیکن شوہر پہلے تھا اور شوہر کے حراج کو بھٹاتا آسان بھی نہیں ہوتا۔ عاطف کو اپنے کاروبار کے مسائل سے بہت کم فرصت ملتی۔ لیکن جو وقت بھی ملتا وہ اسے انیشتادہ کی مصیبت میں گزارتا۔ علاوہ بھرہ داری دعووں کے کلب میں پارٹی ہو جی دیگر تقریبات انیشتادہ عاطف کے مہرہ ہوتی اور عابدہ بیگم کے لیے یہ لمحے بڑے صبر آزمایا ہوتے۔ اب بیٹے کے قرب کی ایک اور حصہ دار بھی تھی جو ان کی خدمت گزار اور اطاعت شعار بھی تھی۔ لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی وہ ان کے بیٹے کی محبت کی "تقسیم کار" بھی

تری یادوں کے گلاب

تھی۔ جس کے وجود نے ان کے بیٹے کی محبت کا ہزارہ کر دیا تھا۔ اور یہی چیز عابدہ بیگم کے دل میں غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر انیشتادہ کے لیے ایک جذبہ حسد و رقابت پیدا کر رہی تھی۔ لیکن وہ جی ہر ہر خاتون تھیں۔ اپنے ان جذبات و احساسات کو قابو کیے رہتیں۔ پھر بھی کچھ ایسے لمحے آ جاتے کہ غیر اختیاری طور پر ان احساسات کی چنگاڑیاں بارگاہِ کاف کے ایک بچکے سے جھونکے سے ہی انیشتادہ تک پہنچ جاتیں اور وہ محسوس کرتی کہ اسے ایک غلط اور نامناسب سلکھاس پر بیٹھا دیا گیا ہے۔ ایک کائنات بھر تاج ہے اس کے سر پر کہ جس کے کائنات کی جھین اس کا سکون درہم درہم کے ہوئے ہے۔

عاطف کی مصروفیات کچھ ایسی تھیں کہ کبھی وہ سر شام گھر آ جاتا اور کبھی رات گئے۔ پھر کاروباری سلسلے میں اسے اکثر شہر اور ملک سے بھی باہر رہنا پڑتا۔ یہ عرصہ انیشتادہ کے لئے صبر آزما رہتا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ عابدہ بیگم اس سے کچھ کچھ کھینچتی ہی تھیں لیکن یہ دوری اور یہ قائلے قائلے گرفت بھی نہ تھے۔ کیونکہ اس تناؤ میں بھی ان کا وہ یہ شکایتی نہ تھا۔ بس اک خاموشی ہی تھی جس پر خود انھیں بھی اختیار نہ تھا۔ انیشتادہ عاطف کی غیر موجودگی میں ان سے زیادہ سے زیادہ قریب رہنے کی کوشش کرتی لیکن ساس کے سرور و قیاس سے اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ ایک ٹھنسی محسوس کر رہی تھی اور جب اسے بے اختیار پناہ دے گا تو وہاں یہ آسائشیں تو میسر نہ تھیں لیکن سکون تھا، ہر وقت کی توجہ بہت اور قہقروں کی ٹھنکناہٹ دن بھر کی محنت کی گمراہی طرح بھانڈوتی اور پھر اماں جی زریاب داپنے ہی ہاتھ کی بنی ہوئی چائے کی ایک گرم گرم پیالی ہونٹوں سے لگاتے ہی اعصاب کا سارا بیج پیالی سے اٹھتی ہوئی بھاپ کی طرح غائب ہو جاتا۔

اور اب۔۔۔ اب اسے ملازمت کی اور جسم تو خدمت کی کہاں ضرورت تھی۔ وہ ایک بڑے گھر کی بوچھی۔ گھر کی دیکھ بھال، کمروں کی آسائش کی نگرانی آنے والے مہمانوں کی دعوؤں کے انتظام کے باوجود بھی اس کے پاس اتنا وقت بچ جاتا کہ وہ نئی طرح جمالی کا شکار رہنے لگی اور یہ تنائی اس کے اندر کی جمالی تھی۔ جب اسے ماحول کو تبدیل کرنے کی سوجھی اور وہ بازار جا کر اپنی زندگی کی چیزیں خرید لاتی۔ پھر اس نے اپنی خواب گاہ کے ساتھ ساتھ ڈرائنگ روم میں بھی کچھ نہ بلیاں کیں۔ دیواروں پر آج اس تصویروں کو بدلا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے تبدیل کیے۔ میزوں سے پرانی طرز کے گلدان ہٹائے اور نئے گلدانوں میں پھول سجادی تھی کہ وہ نہ اتنا بڑی۔ دروازے پر عابدہ بیگم کھڑی تھیں۔

”اماں بیگم۔“ وہ ایک دم سے ہولکا ہو گئی۔ پھر خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔  
 ”آپ کو پسند آئی یہ ترتیب۔“ اس نے سجا ہوا گلہ ان کی طرف کرتے ہوئے داؤد طلب  
 لگا ہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”میں نے وہ پرانا گلہ ان مہمان خانے کی میز پر رکھوا دیا ہے۔“  
 ”ہاں اچھی ترتیب ہے، خواست ہے اس میں۔“ عابدہ بیگم نے غصہ خیز کر کہا۔ ”لیکن کبھی  
 کبھی یہ ترتیب دوسروں کی زندگی کو بے ترتیب کر دیتی ہے۔“ انہوں نے سلتکی آنکھوں سے انیٹا  
 کی طرف دیکھا اور پھر تندہ تیز ہوا کے جھوٹے کی طرح دروازے سے باہر نکل گئیں۔

انیٹا جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ گلہ ان کے پھول اسے منہ چراتے نظر آئے اور  
 سرسراتے ہوئے پودوں کی سرگوشیاں جیسے اس کی ذات کا تسخیر آزار ہی ہوں۔ وہ وہیں صوفے پر  
 ڈھیر ہو گئی۔ عابدہ بیگم کے کہے ہوئے جملے اس کے دماغ میں ہتھوڑے برساتے رہے۔ وہ ان کا  
 مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ یہ تو سمجھ گئی تھی کہ انھیں یہ ترتیب پسند نہیں آتی ہے اور اس کا دل رکھنے  
 کی خاطر انھوں نے اٹلی طرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حکم کھلا اپنی ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہیں کیا۔  
 لیکن وہ کچھ وہ کہہ گئیں تھیں اس کے پس منظر میں کیا تھا؟

پھر اس کے دماغ میں جیسے ایک خیال لپکا جیسے اچانک بلب نوٹنے سے ایک جھماکا سا ہوتا  
 ہے اور پھر مہیب تاریکی چھا جاتی ہے۔ اب اسے ان کے جملوں کے پس منظر میں اپنے ماضی کی گہم  
 مانگی کے سانپ چھن اٹھارتے اور اسے اڑتے نظر آتے۔ تب اس کا وجود ایک شدید کرب سے  
 ٹوٹ ٹوٹ کر کھٹکتے لگتا۔

لیکن پھر رات کے کھانے پر اس نے دیکھا۔ وہ عابدہ بیگم اس فنصیت سے مختلف تھیں جو  
 اس نے شام دیکھی تھی۔ وہ سرٹھکائے وچھے اور کاتے سے کھینٹی رہی۔ جھوک تھی اب کب اور عابدہ  
 بیگم بڑی شفقت سے ایک ایک ڈش اس کے آگے رکھ کر اسے پیٹ بھر کھانے پر اصرار کرتی رہیں۔  
 جیسے وہ آج کل میں ہی تو یہاں کراں گھر میں آئی ہو۔ رات گئے تک وہ اس متضاد طرز عمل کا تجزیہ  
 کرتی رہی۔ اُجھکتی رہی۔ لیکن اس کے اعصاب کا تادہ بڑھتا ہی گیا۔

دوسرے دن وہ عابدہ بیگم اس سے پھر دور تھیں۔ قاصدے بڑھ گئے تھے۔ لیکن انیٹا نے ان  
 فاصلوں کو کم کرنے کا حکم ارادہ کر لیا۔ اسے معلوم تھا کہ عابدہ بیگم کے ملنے والے تو ان محنت ہیں لیکن  
 ان کی چیخنی سیلیاں بس دو تین ہی ہیں۔ اس نے ایک دمک کے کر عابدہ بیگم کی لاطمی میں ان

سب کو مدعو کر لیا اور دعوت دیتے وقت ان سے ان کے پسندیدہ کھانوں کے نام معلوم کر کے وہ  
 سب خود اپنے ہاتھوں سے پکائے۔ ان سب کو اچانک وارد ہوتے دیکھ کر عابدہ بیگم متحجب بھی  
 ہوئیں لیکن باتوں کا جو سلسلہ چلا تو ان کی ساری دھشت دور ہو گئی۔ کھانے کی میز پر ان کی گفتگو  
 اچانک گرم ہوئی جیسے وہ اپنے چمچڑے ہوئے دلوں کی گرفت میں ہوں۔ وہ چمچڑے ہوئے دن  
 بے کوئی غم اپاس نہیں جھٹکتا۔ جب جملوں میں وقت آوارہ پرند کی مانند اڑتا چلا جاتا ہے۔

عابدہ بیگم کو ہنسنے چھٹکلاتے دیکھ کر انیٹا ایسے خوش تھی جیسے اس نے اپنے سر پر رکھے ہوئے  
 کاتوں کے تاج میں پھول کھلائے ہیں اور اب اس سلطنت میں حاکم اور عوام کے درمیان  
 فاصلوں کی ساری طنائیں کاٹ دی گئیں ہوں۔

دوسرے دن عاتف دورے سے لوٹا تو عابدہ بیگم کی تنہائیوں کے پھول پھر سے شاداب  
 ہو گئے اور انیٹا نے محسوس کیا جیسے ان کے چہرے کی جھریاں شادمانی کے ہاتھوں اپنی شکست  
 خوردگی کی شرمساری کا احساس لئے رات ہی رات میں غائب ہو گئی ہوں۔ اور ان کی عمر کے  
 طویل دور میں سے اچانک ہی کئی سال کم ہو گئے ہیں۔ اب زندگی کے وہی معمولات تھے اور  
 وہی شب و روز لیکن یہ معمولات زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکے۔ انیٹا نے اپنے اور ان کے  
 درمیان فاصلوں کی جوتھائیں کاٹ دی تھیں۔ اب وہ ایک ایک کڑی کی صورت میں جز کر ایک  
 محبوبہ و دلچیز رفتی جاری تھیں۔

انیٹا خود اب زندگی کے ایک نئے دور سے گزر رہی تھی وہ تخلیق کے مقدس فرض کی ادائیگی  
 کے ابتدائی مراحل میں تھی۔ اور جنت اس کے قدموں سے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ ایک  
 نو شکار لیکن کسلندی کی کیفیت سے دو چار تھی چنانچہ اس کے اپنے حراج کی گفتگو اس سے رنجی جا  
 رہی تھی۔ ایسے میں گھر کا گھبراہٹوں اس کے لیے جان لیوا بن رہا تھا۔ وہ اب اپنے منکے میں  
 ہانے سے بھی گریز کر رہی تھی کہ وہاں جا کر اس کا بی پھر یہاں آنے سے ایک حسی بے کی طرح  
 انکاری ہو جاتا تھا اور جب وہ یہ جبر لوٹ آتی تو دونوں اسے اپنی منتشر سوچ اور بکھرے وجود کو سینے  
 میں لٹک جاتے۔ لیکن بے چارگی تھی کہ سب کچھ میسر ہوتے ہوئے بھی ایک خلا سا محسوس ہوتا۔ جو  
 کسی طرح نہ ہونے میں نہیں آتا تھا۔ بعض اوقات وہ عابدہ بیگم کے وجود کو بکھر نظر انداز کر کے مکمل  
 طور پر عاتف کے وجود میں ڈوب جاتا چاہتی۔ لیکن ان ہی لمحوں میں اسے جیسے عابدہ بیگم کی نظریں  
 بڑھتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ پھر اس کے سامنے اماں جی کا چہرہ ابھرتا وہ اسے کچھ یاد دلار باہو اور



قری یادوں کے گلاب۔  
وہ سب کچھ بھول کر عابد و یحکم کے آس پاس ان کے حکم کی منتظر آئے تھے۔ لیکن ان کی خاموشی اور کیم  
ان کی دوا اور دوا پاروائی گفتگو اس کے حوصلے پرست کر دیتی۔

اور آج جب وہ اس صورت حال سے بہت گھبراہٹ کر رہے تھے تو اپنے کمرے سے باہر نکل کر باغ کا  
طرف جانے لگی۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا عابد و یحکم وضو کر رہی تھیں۔ وہ  
غالباً مغرب کی نماز ادا کرنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا لیکن شام  
سرخ و چند کلمات کی سیاسی میں جذب ہونے لگا ہوا تھا۔ انیشا دھیمے قدموں سے چلتے ہوئے بار  
کے ایک گوشے میں آگئی اور غصہ غصہ کی گھنٹی لگائی کہ اس پر چڑھ چکا کر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں آفتی کے پار  
ڈوبے ہوئے سورج کے منظر میں کھوئی ہوئی تھیں کہ عابد و یحکم کی آواز نے اسے چمکادیا۔  
”لیکن اندر آ جاؤ یہ وقت یہاں بیٹھنے کا نہیں۔ ننگی شروع ہو گئی ہے۔“ انھوں نے ہلائی  
منزل کی بیڑیاں چڑھتے ہوئے کہا۔

انیشا نے گردن موڑ کر انھیں لوہر پ جاتے ہوئے دیکھا۔ حکم کی قہقہے کے لیے اس کے سر اچھے  
میں حرکت ہوئی لیکن کسی اندرونی قوت نے اسے جکڑے رکھا اور وہ وہیں بیٹھی رہ گئی اور پھر وہ اس  
وقت تک بیٹھی رہی جب تک کہ سورج کی آخری کرن تک معدوم ہو گئی۔ باغ میں چار کی پھل بجلی  
تھی۔ اس نے بہت جلد کی اور اٹھنے لگی کہ باغ کا یہ گوشہ یکا یک روشن ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر  
دیکھا طائر نے برآمدے میں گئے ہوئے سوچے بڑا کاٹھن دیا ہوا تھا۔ برآمدے سے چڑھ مارے  
کمرے روشن تھے۔

”بند کر داسے۔“ وہ بیزار سی ہوئی۔

”اور کافی بنا کر صبر سے کمرے میں لے آؤ۔“

آن کی آن میں باغ کا یہ گوشہ پھر تاریکی میں ڈوب گیا۔ برآمدے میں مدھم پادور کے  
بلب سے روشنی چمکن چمکن کر باغ کے کچھ گوشے نور کر رہی تھی۔ انیشا دھیمے قدموں سے چلتی  
ہوئی برآمدے تک پہنچی تو ہلالائی منزل کی بیڑیوں کے قریب اس کے قدم آپ ہی آپ ڈک  
گئے۔ بالکل اچانک غیر ارادی طور پر اس کی نظریں اوپر اٹھ گئیں اور پری منزل پر جیسے سناٹا سا  
چھایا ہوا تھا۔

یہ آج اسی جان کے کمرے میں اندھیرا کیوں ہے؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور اس  
کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ ہولے ہولے سے بیڑیاں اٹے کرنے لگی۔ عابد و یحکم کے کمرے تک وہ

نہاں قدموں سے پہنچی اور چمکتے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔  
اور میرے خدا! اس کے جسم میں لرزش سی ہونے لگی۔ اپنے منتشر اعصاب پر قابو پا کر وہ  
نات دل سے کمرے میں داخل ہوئی اور پھر اس نے کھٹ سے سوچے آن کر دیا۔ پلک جھپکتے میں  
باہر اچھل گیا جیسے سورج کمرے میں اتر آیا ہو۔ روشنی میں اس نے دیکھا عابد و یحکم اپنی سمیڑی پر  
لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کی بڑی بڑی روشنی آنکھیں اس وقت آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی تھیں اور  
بے ہوش کچھ کہنے کے لیے کھلے۔ لیکن آواز گھٹ کر رہ گئی۔

”ای جان آپ..... آپ مجھ سے کچھ غنا ہیں.....؟“ انیشا کی آواز مدھم گئی۔ وہ دوا کر ان  
بندہ میں بیٹھ گئی اور پھر ان کی گود میں سر رکھ کر رونے لگی۔  
عابد و یحکم نے اس کے سر چھتا دیا اور پھر اس کے سر اٹھا کر چہرہ اپنی طرف کر کے اپنے  
پے سے اس کے آنسو چھو ڈالے۔

”ای جان آپ کو مجھ سے کیا فکارت ہے؟ خدا کے لیے کچھ دیجئے ورنہ میں کھٹ گھٹ  
مر جاؤں گی۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کر دیجئے۔ ای جان آپ کو خدا کا  
..... آپ.....“

”بھئی.....“ انہوں نے انیشا کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”میں تجھ سے ناراض تو نہیں..... ڈنٹے مجھے کون سا دکھ دیا ہے۔“ ان کے ہونٹوں پر ایک  
نی کرابت رہ چکی تھی۔

”میں تو..... میں تو اپنے دکھ کے بوجھ سے ٹھک گئی ہوں۔“ وہ دھیمے دھیمے بول رہی تھیں  
اور ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے سن رہی تھی۔

”اس سال ہو گئے ہیں اس بوجھ کو اٹھانے ہوئے۔“ عاظم اس وقت ستر و سائل کا تھا جب  
نی ایران دنوں اور تھاراتوں کی ابتداء ہوئی تھی۔ وہ جرم کی آخری سانسوں تک بھانے کا  
دہائیے ہوئے تھے۔ وہ ایسے چپ چاپ چل دیے کہ مجھے خبر تک نہ تھی۔ وہ جرم گھٹ کے لنگھ کو  
باقی قرار دیتے تھے موت سے گھٹت کھا گئے اور مجھے یادوں کے کھنڈرات میں جھپکنے کے لیے  
باہر دیا۔ میں ٹھکنا نہیں چاہتی تھی اس لئے کہ ان کی روح ان کا وجود عاظم کے روپ میں مجھ  
م۔ اب تک تھا اور مجھے اس روپ کو پروان چڑھانا تھا۔ چنانچہ میں نے ان کھنڈرات میں ان کی  
لی یادوں کے چراغ روشن کرنا شروع کر دیے۔ میں ہر شب ایک چراغ جلاتی تھی اور تنہائی

کے اس کھنڈر کو روشنی کرتی تھی۔ ایسی ہی شاہیں ہوتی تھیں جب ڈوبتے سورج اور چلتے چراغ آ روشنی میں وہ دروازے ہی سے مجھے آواز دیتے ہوئے اندر داخل ہوتے تھے اور پھر مدعو نے او کھڑے ہوئے تھک وہ اپنے روز کے معمولات سناتے تھے۔ ایک ایک بات۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ساری باتیں جیسے لطیفہ سنا رہے ہوں۔ چٹکے چھوڑ رہے ہوں۔ اس ایسی ہی شاہیں ہوتی تھیں جب وہ اکثر میرے لئے کوئی نہ کوئی تھکا لاتے۔ چاہے وہ چند پھول ہوں۔ ایک خوبصورت سارنگھن ٹھکانا سارا مال ہو۔ دل پسند خوشبو ہو۔ انگوٹھی ہو یا میری مخصوص پسندیدہ مشا اور وہ یہ چیزیں میرے سامنے والے میٹھل ہیں کے اس گوشے میں چپکے سے رکھ دیتے وہ وہاں انھوں نے میٹھل ہیں کے اس مخصوص گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کیا۔

میری نظر اچانک اس چیز پر پڑتی تھی ان سے پوچھتی اور وہ بڑی خوبصورتی سے اس سے اپنی لامٹی کا اظہار کرتے۔ محبت کا یہ انداز کیسے جلا یا پاسکا ہے بیٹے۔ یادوں کے یہ چراغ کیسے بجھائے جاسکتے ہیں۔ تھیں یاد ہے وہ گھدانا جو تم نے سہان خانے میں رکھا اور یا تھا۔ وہ انگی کی یادگار تھی۔" پھر وہ ایک لمبی آواز بھر کر چپ ہو گئیں۔

اسی لمحے مجھے سے عاقل کی آواز آئی۔

"انیٹا پلیز کہاں ہو تم۔"

"جاؤ لیکن عاقل آگیا ہے۔" عابدہ جگمگ نے اپنے ہاتھ آہستگی سے اس کے ہاتھوں سے چمڑائے۔ طبعاً وہ ہوتے ہوئے ان ہاتھوں میں اب ایک لمبی کی پکپکاہٹ تھی۔ پانا جلائے والے یہ ہاتھ کو یا اپنی شنگی اور تھی دھنسی کے خاموش شاکی ہوں اور اگر انھیں زبان مل جاتی تو یہ کہا شے۔

"جاؤ لیکن عاقل آگیا ہے۔ اب سے تمہاری ضرورت ہے۔"

انیٹا چپ چاپ بیچھاڑ آئی۔

"بھئی مدد کرو گی تم نے۔۔۔۔۔ اب ایسے استقبال کرو گی۔ آواز دھر پیلے۔"

عاقل اسے کمرے میں لے جانے لگا۔

"شش۔۔۔۔۔" انیٹا نے اس کی بے میلی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر باغ میں گھسٹ لے گئی۔

"بھئی یہ سب کیا ہے؟" عاقل کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھجھلا گیا۔

تری یادوں کے گلاب "عاقل پلیز ایک منٹ۔۔۔۔۔" انیٹا نے جلدی جلدی گلاب کے چند پھول توڑتے ہوئے ایشہ سے کہا۔ اس گھبراہٹ میں اس کے ہاتھوں میں کئی کانٹے چبھ گئے لیکن جیسے وہ پیار کے کانٹے ہوں جو زخم دینے کے بجائے ٹھنک پہنچا رہے تھے۔ پھر اس نے رات کی دہائی کے پھولوں کا ایک گچھا توڑا اور اپنے بالوں سے ریون نکال کر انھیں بکچا کر کے لپیٹ دیا اور عاقل کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی۔

"امی جان بہت تھما ہیں عاقل۔ یہ تھما لی آپ ہی دور کر سکتے ہیں۔ یہ پھول لے جائیے اور ان کے کمرے میں میٹھل ہیں کے دائیں گوشے میں رکھ دیجئے گا اور پھر آج کے دن کی ساری روز ابھی انھیں سنائے گا یہ بہت ضروری ہے، بہت ضروری عاقل صرف آج ہی نہیں روزانہ۔۔۔۔۔ جب بھی ممکن ہو۔"

"لیکن کیوں۔۔۔۔۔؟" عاقل حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ابو۔۔۔۔۔ آپ کے ابو بھی یہی کیا کرتے تھے۔" انیٹا نے اس کی طرف بہت پیار سے دیکھا اور نکھری جھکا لیں۔

"تم انیٹا۔۔۔۔۔" وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا اور چھلانگیں لگا تا ہوا سیریاں چڑھ گیا۔ انیٹا وہیں نہ بیٹے پر تک مچی۔ اوپر سے اسی جان اور عاقل کی باتوں کی آواز آرہی تھی۔

وہ آپ ہی آپ سکرادی جیسے اس کے کانوں سے کاہر اتر گیا اور وہ بکلی بھنگی ہو۔

☆.....☆.....☆



## شبِ غم کی ظلمتیں

تاکہ، فاخرہ اور انیلہ..... چوہدری افتخار کی تین بیٹیاں تھیں۔

ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ ایک فرم میں نوکری کرتے تھے۔ تین بیٹیوں کے آپ تھے۔ فاخرہ بی اے کے آخری سال میں تھی۔ تاکہ ایف اے میں تھی۔ اور انیلہ نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ ماں باپ بیٹیوں کیلئے فکر مند ہو گئے تھے۔

فاخرہ کا رزلٹ نکلا اور وہ پاس ہو گئی۔ کوئی خاص پوزیشن نہیں ملی تھی، آگے پڑھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ نہ تو اس کے سامنے تعلیم کا کوئی مقصد تھا اور نہ کوئی خصوصی دینی صلاحیتیں کہ کسی خاص شعبے کی طرف توجہ دی جاتی۔ ہاں، ابونے اس سے ضرور پوچھا تھا۔

”بتاؤ بیٹی! اب تمہاری کیا خواہش ہے؟“

”آپ پوری کرویں گے ابوبی؟“ اس نے پوچھا۔

”پوری پوری کوشش کروں گا بیٹے!“

”تو ابوبی مجھے نوکری کروادیں۔ میں نوکری کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے کہا۔ اور ابوبی کا چہرہ پیکا پڑ گیا۔

پھر دو بولے۔ ”فاخرہ بیٹے! میں فرسودہ خیالات کا انسان نہیں ہوں۔ لیکن بڑا دل ضرور ہوں۔ اپنے ارد گرد گھمے ہوئے ماحول کو دیکھتا ہوں اور اس پر گہری نظر دیکھتا ہوں۔ میں اس جنم میں اپنی عزت کو نہیں جھونک سکتا اور پھر تمہیں اس کی کیا ضرورت ہے۔ بس خدا سے دعا کرو کہ وہ مجھے تم تینوں کے فرض سے سبکدوش کرے۔ اس خیال کو ذہن سے نکال دو۔ اس عزت کے ساتھ میرے گھر سے چلی جاؤ۔ یہی میرے لیے تمہارا انجام ہوگا۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ بے کاری کا دور شروع ہو گیا۔ گھر کے کام کاج بہنوں کی تعلیم میں مدد۔

تری یادوں کے گلاب

اس کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس نے اپنے آپ کو ان معمولات کا عادی بنالیا۔ بیٹی کے والدین جس انداز میں رشتے تلاش کر سکتے تھے، کر رہے تھے۔ دہلی دہلی زبان میں لوگوں سے تذکرے جاری تھے۔ حسرت بھری نگاہیں ہر طرف اٹھ رہی تھیں۔ عمرنگی جاری تھی۔ فاخرہ کے بعد بھی دو بیٹیاں ہوئی تھیں۔ ایک کی گھر سے نہات ملے تو دوسریوں کی گھر کی جائے۔ انہی دنوں فاخرہ کی ایک دور کی عزیز سیالکوٹ سے آئیں کافی عرصے کے بعد آئیں تھیں۔ گھر میں خوشیاں بکھر گئیں۔ بزرگوں میں ہر موضوع پر بات ہوئی تو فاخرہ و فیروزہ کی شادی کا تذکرہ بھی نکل آیا۔ فاخرہ کی اسی کیلئے یہ سب سے پرکشش موضوع تھا۔ انہوں نے اچھا رشتہ نہ ملے گا رو دیا۔ اور فاخرہ کی عزیز دوستی سوچ میں ڈوب گئیں۔

”آپ کی نگاہ میں کوئی اچھا لڑکا ہو تو.....“ اسی نے سلسلہ متقطع نہ ہونے دیا۔

”وہی سوچ رہی تھی۔ ایک لڑکا ہے تو صحیح لیکن میں ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ ہمارے بڑوں میں رہتے ہیں۔ وہ لوگ لڑکے کے بھائی بھادج ہیں۔ لڑکا خود لندن میں رہتا ہے۔ ان دنوں آیا ہوا ہے۔ اس کی بہن نے مجھ سے کہا تھا کہ کوئی خوبصورت لڑکی نگاہ میں ہو تو بتاؤں۔ مگر اس وقت مجھے تمہاری بیٹیوں کے بارے میں خیال نہیں آیا۔ تم کہو تو خط لکھو انہیں؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے آپ کی بیٹیاں ہیں۔ فوراً کوشش کریں۔“ افتخار صاحب نے درمیان میں دخل دیا۔ اور ان خاتون نے حای بھر لی۔

دوسرے دن ہی ایک تفصیلی خط لکھ دیا گیا۔ افتخار صاحب نے اپنے دفتر کا فون نمبر بھی احتیاطاً لکھ دیا تھا۔ اور ان کی یہ احتیاط کام آگئی۔ پانچویں دن انہیں دفتر میں فون کال موصول ہوئی۔ سیالکوٹ سے تھی۔ افتخار صاحب نے دفتر کے دل سے فون ریسیو کیا۔

”افتخار صاحب بول رہے ہیں؟“

”جی ہاں! آپ کو کون صاحب؟“

”میرا نام رب نواز ہے۔ چھ ہدی زبان صاحب کی ایلینے نے مجھے خط لکھا تھا۔ میں نواز کا بڑا بھائی ہوں۔ جی۔“

”اوہ..... رب نواز صاحب! میں پہچان گیا آپ کو۔ کہنے کیسے حراج ہیں آپ کے؟“

”خدا کا شکر ہے جی۔ تو جی ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کتنے کو ہم یہاں سے چل دیں اور اتوار کی شام کو کراچی پہنچ جائیں۔ انوار کو بھی ساتھ لے آئیں گے۔ وہاں بات ہو جائے گی۔ اسے

"ضرور..... ضرور۔ آپ کوئی نئی سہیلی ہے۔ ہم آپ کو یہ سہیلی کرنے۔"

"اوپر نہیں مٹی آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم ہوگی میں غمخیز کے وہاں ہماری واقفیت بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ہوگی میں ہی غمخیز کے۔"

"زب نواز بھائی مگر ہوتے ہوئے آپ....."

"نہیں مٹی کوئی بات نہیں۔ ہم وہاں پہنچ کر آپ سے خود لیں گے۔ اچھا مٹی، خدا حافظ۔"

زب نواز نے کہا اور فون بند کر دیا۔

افتخار صاحب جیسے ہی کیفیت کا بخار ہو گئے تھے۔ ان لوگوں کو گھر میں غمخیز کے پیکش ضرور کی تھی لیکن غور و فکر بھی تھے۔ اسے معمولی سے گھر میں لندن پوسٹ لڑکے کو کہاں غمخیز کے۔ جگہ ہی کہاں تھی۔ لیکن اخلاقیات کا تو کہنا ہی پڑا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی وہ عزیز و شاہانہ بھی یہیں تھیں۔ کچھ اور پریشانیوں بھی ذہن میں رہی تھیں۔ اگر ان لوگوں نے بہت جلدی کی تو.....؟ گو دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے بہت سی چیزیں گھر میں جمع کر لی تھیں تھیں۔ لیکن یہ چیزیں اس شادی کے کام نہیں آ سکتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ لڑکا لندن واپس جائے گا اور ان چیزوں کی اسے وہاں ضرورت نہیں ہوگی اسے جو کچھ دینا پڑے گا۔ نقدی دینا پڑے گا..... اور یہ نقد.....

شام تک دفتر بیٹھے ہوئے افتخار صاحب بھی سب کچھ سوچتے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے سارے دماغ کے بارے میں سوچا تھا۔ اور کسی قدر مطمئن ہو گئے تھے۔ اگر وہ زیادہ لاچکی نہ ہوئے تو پھر مشکل نہ ہوگی۔ لیکن ساری باتیں صاف صاف کر لینا بہتر ہوگا۔ تاکہ بعد میں کوئی بہرحال نہ ہو۔ پھر انہوں نے دوسرے انداز میں سوچا۔ اور دل میں ایک ہلکی سی دھجی۔ جگر گوشت اتنی دور چلی جائے گی۔ کہ ایک خواب کی مانند ہو جائے گی۔ اس کا تصور تو کیا جاسکتا ہے۔ اس سے ملا نہیں جاسکتا..... یہاں خواب ہی تو ہوتی ہیں۔ ساری زندگی پرورش کرو اور پھر کسی اجنبی کے حوالے کر دو۔

گھر پہنچے تو خوش بھی تھے اور افسردہ بھی۔ پہلے بیگم سے اس کا لینے بارے میں تذکرہ کیا۔ پھر شاہانہ بیگم سے۔ درحک زب نواز کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ "بیٹے کی شام کو سات بجے کے قریب ایک طویل القامت شخص نے چودھری افتخار کے مکان کے دروازے پر دستک دی۔ چودھری صاحب واپس آ چکے تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ کیا لکھت سے آنے والوں کی کوئی

الفاظ ملے۔ انہوں نے فوراً دروازہ کھولا۔ طویل القامت شخص نے انہیں سلام کیا اور افتخار صاحب نے بارے میں پوچھا۔

"میں ہی افتخار ہوں۔ اور آپ شاید زب نواز صاحب ہیں۔"

"خوب پہچانا مٹی! میں زب نواز ہی ہوں۔"

"تشریف لائیے۔ ہم لوگ اس وقت آپ کے بارے میں ہی گفتگو کر رہے تھے۔" زب نواز اندر آ گیا۔ حتی المقدور اس کی خاطر عمارت کی کچی گھسی۔ ذرا آہستہ سے کاپے تکلف سا شخص تھا۔ خوب ڈٹ کر اس نے ناشتا کیا پھر بولا۔

"بھائی مٹی! ہماری پڑوسن ہیں مٹی! ان کا شکریہ کہ انہوں نے یہ بات چلائی پر ایک مشکل ہے۔ چودھری مٹی۔"

"کیا زب نواز بھائی؟"

"لڑکا لڑکی کو دیکھ گئے گا۔" زب نواز نے کہا۔ افتخار صاحب اس بات پر ذرا سا خاموش ہوئے تو ان کی بیگم بول پڑیں۔

"ہم اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے زب نواز بھائی۔ کیا آپ کی بیگم بھی آئی ہیں؟"

"ہاں مٹی! وہ ہوئی ہیں۔"

"وکل دو پیر کا کھانا آپ ہمارے گھر میں ہی کھائیں۔ اداوی کو بھی لیتے آئیں۔ اور اپنی بیگم کو بھی۔ لیکن ان باتوں سے پہلے ہم آپ سے کچھ اور باتیں بھی کرنا چاہتے ہیں۔"

"یو لو بھائی مٹی! زب نواز نے کہا۔

"دیکھیے زب نواز بھائی ہم معمولی سے لوگ ہیں۔ خاندانی شرافت کے علاوہ ہمارے پاس اور کوئی چیز نہیں۔ انوار لندن میں رہتے ہیں۔ اگر ان کے خیالات اونچے ہیں تو پھر ہمارے لیے یہ شادی کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ہم لڑکے کو صرف تین لاکھ روپے نقد دے سکتے ہیں۔ جو بے شک اس زمانے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ لیکن بس۔ یہی ہماری پوچھی ہے۔"

"اوی بھائی مٹی! انوار کے پاس سب کچھ موجود ہے۔ خدا کے کرم سے وہ کسی بھی ہم سے ہمدی کر سکتا تھا پر لڑکا شریف ہے اپنے ہی دھن کی کوئی شریف لڑکی چاہتا ہے۔ باقی اسے اور کسی بیوی کی پرواہ نہیں ہے۔ پھر بھی میں اس سے بات کر لوں گا۔"

"آپ ضرور یہ بات لیں۔ ہم اپنی حیثیت سے اوی بھی اذان نہیں چاہتے۔"





تری یادوں کے گلاب

”اور..... بات تو تشویشناک ہے۔ چاہاجی نے سیالکوٹ جا کر ان کے بارے میں چھان بین بھی نہیں کی؟“

”تم سیالکوٹ جانے کی بات کر رہی ہو۔ یہاں ایک ہفتے کے اندر اندر یہ سب کچھ ہوا ہے۔ کوئی معلومات نہیں لی گئیں۔“ قاخرہ نے بتایا۔

شاید وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر گردن ہلکا کر بولی۔ ”بہر حال خدا بہتر کرے گا۔ ویسے بڑے غراہوتے ہیں جس آج کل۔ ایسی ایسی باتیں سننے میں آتی ہیں کہ دو گھنٹے گزرے ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص یکساں نہیں ہوتا۔ خدا کرے باہر کی زندگی تمہیں داس آئے۔“

فلاح خوب دھوم دھام سے ہوا۔ سیالکوٹ سے صرف چار آدمی آئے تھے۔ شکل و صورت سے وہ اچھے لوگ نہیں لگ رہے تھے۔ لوگ دہلی دہلی زبان میں ان پر تبصرے کرتے۔ لیکن انوار ان لوگوں سے مختلف معلوم ہوتا تھا۔ فلاح کے دوسرے دن انوار سیالکوٹ چلا گیا۔ قاخرہ کو شادی، شادی ہی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ نہانے اس کے ذہن میں کیسے کیسے خیالات جاگزیں ہو رہے تھے۔ اس نے لاکھ کوشش کی کہ خود کو انوار کی طرف مائل کرے لیکن اس کا تصور ہمیشہ اجنبی لگتا تھا۔ ان احساسات نے اس کی صحت پر برا اثر ڈالا تھا۔

شاہانہ بیگم چلی گئیں تھیں۔ اور گھر کے مشاغل معمولات پر آگئے تھے۔ لیکن قاخرہ کو اب ایک مہمان جیسی حیثیت حاصل تھی۔ سبھی اسے کوئی کام کرنے نہیں دیتی تھیں اور حسرت سے دیکھتی رہتی تھیں۔ اسی نے ایک دن اس کی اس کیفیت کو محسوس کر لیا۔ اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

”قاخرہ بیٹی! اس قدر غمزدہ نہیں رہتے۔ والدین کے گھر سے تو بچیں کہ تعلق واجبی سا ہوتا ہے۔ ان کا اصل گھر تو سرسراں ہی ہوتا ہے۔ خدا کے فضل سے تمہاری تو تختہ بر جاگ اٹھی۔ لندن میں رہ کر کشش کرو گی۔ اپنی بہنوں کیلئے دعا کرنا انا نہیں بھی پار لگا دے۔“

قاخرہ کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ ایسے جھک کر روئی کہ اسی پریشان ہو گئیں۔ وہ خود بھی رو رہی تھیں۔ اور ان کے ساتھ نالہ اور اذیتا بھی رو رہی تھیں۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں کی تھی میں نے وہی! اب تو مجھ کو نہیں تھی میں آپ پر۔ اتنی پریشانی کیا تھی میرے بارے میں؟ آپ نے مجھ سے براہین کیوں چھین لیا۔ آپ نے مجھے خود سے اتنی دور کیوں کر دیا کہ میں آپ لوگوں کی صورتوں سے ترس جاؤں۔ آخر ایسا کون سا جرم کیا تھا میں نے؟ چند روز اور گزر جاتے۔ مجھے آپ کے

تری یادوں کے گلاب

بتائیں۔ جو رپ تو ناز اور انوار سے ہوئی تھیں۔ لیکن نہانے کیوں قاخرہ کو مطمئن نہیں تھا اس نے بھی ایک ہی نگاہ انوار کو دیکھا تھا لیکن ہزاروں میں دور کا یا شہدہ تھا۔ وہ ایک اجنبی کے ساتھ انوار سے اتنی دور چلی جائے گی۔ بس یہ احساس اس کیلئے بہت تکلیف دہ تھا۔

ایک ہفتے کا وقت ہی کتنا ہوتا ہے۔ دفتر انٹری میں سارے انتظامات ہو رہے تھے۔ خاندان میں دعوت نامے تقسیم ہو گئے تھے۔ خاندان والوں کو تو کسی اعتراض کا موقع درکار ہوتا ہے۔ جس نے کبھی ایک ہی بات کہی۔ نہ ذات، نہ برادری، کوئی دور کی جان پہچان بھی ہے۔ چہ دہری انتقاد تو جس لندن کے نام پر درجہ گئے اور حقیقت بھی یہی تھی۔ سیدھے سادھے انتقاد صاحب ایک تو بچپن کے بوجھ کے خوف کا شکار، حالات خراب ضرور ہیں لیکن بچپن اب ایسا بوجھ بھی نہیں ہوتا جس کو انہیں کوڑے کے ڈمیر پر پھینک دیا جائے۔ دوسری بات یہ کہ لندن کا نام بھی بہت سمور کن تھا۔ ولایت میں عام لوگ تو شہر رہتے۔ پھر انوار کی شان و شوکت بھی انہیں پسند آتی تھی۔ خاندان والوں کی باتوں کی انہوں نے کوئی پروا تو نہیں کی۔ جس کا جہول چاہے کبے۔ کسی کی زبان کس نے روکی ہے۔

شادی کا دعوت نامہ شاید کو بھی گیا تھا۔ دوسری چند سہیلیاں بھی شریک ہوئی تھیں۔ ماحول میں سہیلیاں ہی پاس ہوتی ہیں۔ اور ان کی پیچھے چھاڑی اس تقریب کا حسن و بالا کرتی ہے۔ ”تو تو بڑی چورنگی قاخرہ! سب سے پہلے ہاتھ مار دیا۔ ارے ہم تو تجھ سے دو تین سال بڑے ہی ہوں گے۔ مگر نہانی کسی کو پروا ہی نہیں ہے۔“ شاید وہ نہ کہا۔

رات گئے وہ سب جانے لگیں تو قاخرہ نے شاید وہ رات کو رک جانے کی خواہش ظاہر کی۔ شاید کے ساتھ اس کا ایک بھائی آیا تھا۔ اس کی اجازت سے شاید وہ رک گئی۔ رات کو تھمائی لی تو قاخرہ نے دل کی بات اس سے کہی۔ ”شاید وہ میں اس شادی سے خوش نہیں ہوں۔“

”کیوں؟“ شاید ہنسی پڑی۔

”ان لوگوں کو کوئی نہیں جانتا۔ ہماری ایک دور کی رشتے دار سیالکوٹ میں رہتی ہیں۔ یہ لوگ ان کے بڑے ہیں۔ وہ خود بھی انہیں زیادہ نہیں جانتیں۔ اور انوار۔ انوار تو رہتے ہی لندن میں ہیں۔ ان کی فطرت کے بارے میں تو کوئی بھی کچھ نہیں جانتا۔ میں اپنا وطن چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔ شاید وہ ایک بالکل اجنبی شخص کے ساتھ انہوں سے اتنی دور۔“





خیال ہے انوار نے کہا اور وہ آہستہ سے مسکرا دی۔

”شکر ہے..... میں چند منٹ کے بعد دو لوگ ہمیں لینے آئیں گے۔ میں باہران کا انتظار کر رہا ہوں۔“ انوار نے کہا اور پھر باہر نکل گیا۔

فاخرہ مقب سے اسے دیکھتی رہی۔ تندرست ہاتھ پاؤں کا ایک جامد زیب انسان۔ اس کا شوہر۔ اس کی آنکھ و زندگی کا ساتھی۔ اس کا محافظ۔ اس سے اتنی اجنبیت مناسب نہیں ہے نہ ہو کہ اسے میری کوئی بات نرمی لگ جائے۔ میرے اور اس کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہونا چاہیے مجھے خود کو مستحیلا چاہیے۔ ہر چہ کہ یہ سب کچھ میرے لیے اجنبی ہیں۔ لڑکیاں تو چلی کی شرمائی گھروں سے رخصت ہوتی ہیں۔ سچ پران کا تعارف اس اجنبی سے ہوتا ہے۔ پہلی بار دروغمانی ہوتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ تکلف کے پردے اٹھتے ہیں۔ لیکن یہاں کوئی سچ نہیں تھی۔ یہاں تو رنگ ہی بدلا ہوا تھا۔ لہجہ بھی ہے۔ یہ یورپ ہے۔ جہاں جوج میں شادیاں ہوتی ہیں۔ اور دلہا دلہن لوگوں کی مہار کھادیاں وصول کرتے ہوئے پتی صون پر چلے جاتے ہیں۔ میرے لیے بھی یہی طرز زندگی ہے اور مجھے بھی وہی کرنا ہے جو یہاں کی سوغات میں شامل ہے۔

چنانچہ دوسری بار جب انوار اسے لینے آیا تو اس کے انداز میں وہ جھجک نہیں تھی۔ نیچے ایک کار موجود تھی جس میں انوار کا ایک پاکستانی دوست اس کا منتظر تھا۔ اس نے اتر کر مکملی کار کا دروازہ کھولا اور فاخرہ انوار کے ساتھ بیٹھ گئی۔ کار لندن کی کمرزدہ سڑکوں پر دوڑنے لگی۔ فضا میں ایک خوشگوار خشکی تھی اور موسم بے حد حسین تھا لندن کی جھگڑاتی سڑکیں۔ طے کرتی ہوئی کار کولس ناہی ہونے کے وسیع پارکنگ لائن پر رک گئی۔ یہاں بھی کچھ لوگ استقبال کے لیے موجود تھے۔ مقامی اور غیر مقامی لوگ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ ان میں کوئی بھی پاکستانی عورت نہیں تھی۔ البتہ مقامی عورتوں اور لڑکیوں کی تعداد اس بارہ کے قریب ہوگی۔

کولس کی مکملی چھت پر انتظام تھا۔ یہاں انوار نے اس کا تعارف اپنے دوستوں سے کر دیا اور انہوں نے اسے ختمے پیش کیے۔ فاخرہ نے گردن خم کر کے ان کا شکریہ ادا کیا تھا۔ آرکسٹر اہم مردوں میں انگریزی و جنس پیش کر رہا تھا۔ لوگ اپنی اپنی میزوں پر بیٹھ گئے تھے اور ان کے سامنے شراب کے برتن تھادے گئے تھے۔ فاخرہ نے یہ برتن دیکھے تو اس کا دل دھک سا ہو گیا۔ اگر شراب کے یہ برتن اس کی میز پر بھی آگئے تو۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شراب کے بعد رقص کا ایک پروگرام ہوا۔ اور پھر وہی یاد ہو شروع ہو گئی

یاد یورپ کی روایت سے وابستہ ہے۔ پھر ایک پر تکلف ڈنر ہوا اور ڈنر کے بعد تھوڑے سے تفریحی پروگرام۔ رات بارہ بجے کے قریب یہ پارٹی ختم ہوئی۔ اور اس کے بعد وہ انوار کے ساتھ اس کار میں واپس چل چڑی۔ یہاں اٹھلا موجود تھی۔ جس نے اسے شب خوبلی کا لباس دیا اور اس کے بعد مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ پھر ایک خوب صورت گاؤں میں ملبوس انوار اس کے پاس پہنچ گیا۔

”وطن سے دور ہو کر ہمیں ان لوگوں کی روایت اپنانا پڑتی ہیں فاخرہ۔ جن کے درمیان ہم ہوتے ہیں جنہیں یہ سب اجنبی سا لگا ہوگا۔ لیکن یہ یہاں کی تہذیب میں شامل ہے اور ہمیں ان ہی لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہے۔ اس لیے ان باتوں کو محسوس نہ کرنا۔ مجھے معلوم ہے کہ ابتدا میں تمہیں تکلیف ہوگی۔ لیکن رفتہ رفتہ تم ان تمام باتوں کی عادی ہو جاؤ گی۔ تاہم اپنے وطن کی روایات کے طور پر تمہاری حسین معیت کا اعتراف اور اس کا خراج۔ یہ ایک عمدہ جو میری طرف سے تمہاری نذر ہے۔“ انوار نے ایک مسکین ہمارا اپنی جیب سے نکالا اور فاخرہ کی گردن میں ڈال دیا۔

فاخرہ سچائی سی بیٹھی رہی۔ تب انوار نے کہا..... ”دیکھئے محترمہ فاخرہ! بات دو غریب اولیوں کی ہے۔ دونوں ہی ایک کیفیت کے شکار ہیں۔ پھر کیوں نہ درمیان سے یہ تکلف ہٹا دیا جائے۔“ اور فاخرہ نے مسکراتے ہوئے گردن جھکا دی۔ یہ تاجے آپ کو یہ سب کچھ کیسا لگا۔“

”بہت عجیب.....“ فاخرہ نے کہا۔

”یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔ یہ ایک سچا جواب ہے۔ جس سے آپ کی شخصیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ ماحول دلکش ہے۔ مجھے پسند ہے۔ جنہیں بھی یقیناً پسند آئے گا۔ بس خود کو اس ماحول میں ضم کرنا ضروری ہے۔ زندگی کے بارے میں میرے کچھ نظریات ہیں۔ فاخرہ! جن کے بارے میں آہستہ آہستہ تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ میں زندگی کو جو ملے اقدار کی رسی میں باندھ کر رکھنا پسند نہیں کرتا۔ میں ان ناکام لوگوں کی ٹھہرت میں شامل نہیں ہوں۔ جو پہلی ناکامی اور کم ہمتی کو اخلاقیات سے منسوب کر دیتے ہیں۔ میں تو زمین کے مختصر شب و روز بیش و عشرت سے گزارنے کا قائل ہوں۔“

”جی“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”بھئی کچھ اور بھی تو کہو..... اپنی بات کرو۔ میں منتظر ہوں۔“

”کیا کہوں.....“ وہ ہنسنے لگی۔

”میرے بارے میں پوچھو اپنے بارے میں بتاؤ۔ ہم دونوں ابھی ایک دوسرے کے



تری یادوں کے گلاب

رشتوں کی تخلیق بھی قدرت نے خوب کی ہے۔ وہ انجمنی ہستیاں چند وعدوں کے ساتھ ایک دوسرے کی زندگی میں داخل ہوتی ہیں اور پھر مرکز اور جاتی ہیں۔ سارے رشتے نامہ پڑ جاتے ہیں پھر نئے رشتوں کی تخلیق ہوتی ہے اور دونوں ان رشتوں کا فرض نبھانے لگتے ہیں فخر و غلے اپنے کمر کو پائنت کی نگاہ سے دیکھا۔ اپنے بالکل نزدیک سوئے ہوئے اس انجمنی کو دیکھا جواب انجمنی نہیں تھا۔ اس کی اذات کا گھس تھا۔ اور پھر وہ مسکراتی ہوئی ہاتھ روم میں چلی گئی۔

دل میں احساس کی رنگینیاں لئے ہوئے جب وہ ہاتھ روم سے نکلی تو انوار جاگ چکا تھا۔ وہ بستر میں گھسا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا اور اخبار رکھ دیا۔ وہ اس سے نگاہیں نہیں ملا رہی تھی۔

”تھریف رکھیے خاتون! آپ صبح بخیر کی عادی ہیں؟“

”جی ہاں۔“

”میں دیر تک سو رہا ہوں لیکن آج آپ کی وجہ سے جاگ گیا ہوں۔“

”شکریہ۔ دفتر۔ میرا مطلب ہے آپ کی کاروباری مصروفیات کس وقت شروع ہوتی ہیں؟“

”فون کی گھنٹی بجتے پھر کاروبار شروع ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ گھنٹی کئی گنی دن نہیں بجتی اور بعض اوقات ایسے بجتی ہے کہ پھر رگتی ہی نہیں۔ ویسے چند روز کے لیے میں نے اپنے کرم فراہم سے معذرت کر لی ہے کہ یہ گھنٹی نہ بجائیں۔ کیونکہ میں فخر و غلے کی مسین آواز میں اس حرکت آواز کا تحمل نہیں ہو سکتا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ بھی مسکرا دی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بلاوجہ خوفزدہ تھی۔ انوار تو بے حد دلکش ہے۔ اس کی حقیقت تو روح کی گہرائیوں میں سرور گھونکتی ہے۔

”ناشیا کس وقت؟“

”صبح کو صرف چائے ناشیا اس بجے تک لیکن ابھی تم اس کی حرکت کرو۔ نو بجے چائے آ جائے گی۔ دراصل میں نے اٹھنا کو یہ عیادت دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آپ بھی نو بجے سے پہلے نہیں جاکیں گی۔“

”میں چائے پالاتی ہوں۔“

”رہنے دو ڈارنگ! تمہاری قربت چائے سے کہیں زیادہ لذت آمیز ہے۔“ اس نے

بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ میں ایک دوسرے سے واقف ہونا چاہئے۔“

”آپ کے والدین؟“ فخر و غلے نے خود کو گھٹکھٹکے کیلئے تیار کر لیا۔

”دیکھیے ہی نہیں۔“

”کیوں؟“ وہ تعجب سے بولی۔

”بچپن ہی میں مر گئے تھے۔“

”پھر آپ کی پرورش؟“

”ایک بچانے کی تھی۔ بچا کا بھی انتقال ہو گیا۔“

”رب نواز بھائی آپ کے۔۔۔۔۔“

”کوئی نہیں بس شاسانی ہے۔ وہ بھی اس طرح کے میرے بچا رب نواز کے پردی تھے۔“

”ارے تو وہ آپ کے سگے بھائی نہیں ہیں۔“ اسے سخت حیرت ہوئی تھی۔

”نہیں فخر و غلے البتہ ان کے اور میرے درمیان تحائف کا رشتہ ضرور برقرار ہے۔ میں جب

بھی لندن سے جاتا ہوں ان دونوں میاں بیوی کیلئے بہت کچھ لے جاتا ہوں۔ تحائف محبت کی بنیاد بن جاتے ہیں۔“

”تعجب ہے۔“

”آپ یہاں کیا کاروبار کرتے ہیں؟“

”مختلف۔ امپورٹ ایکسپورٹ بھی کرتا ہوں۔ سمندری جہازوں کے ذریعے جو مل ہاہر

سے آتا ہے اور یہاں سے باہر جاتا ہے۔ اس کی ٹوڈنگ اور ان ٹوڈنگ کے ٹیکے بھی لیتا ہوں۔“

”کوئی دفتر ہے آپ کا؟“

”نہیں اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ میں مختلف کہنیوں سے رابطہ ہوتا ہے۔“

”یہ کاروبار آپ کے لیے مطمئنان عمل ہے۔“

”مکمل طور پر۔ عرصے سے کر رہا ہوں۔“ اس نے جواب دیا اور فخر و غلے خاموش ہو گئی۔ اس

سے زیادہ اور کیا گھٹکھٹکرتی؟ پھر انوار اس سے اس کے بارے میں پوچھنے لگا اور دفتر دفتر فخر و غلے اس

سے بے تکلف ہو گئی۔ والدین کی جدائی کا جو بوجھ انجمنی ماحول میں آنے کی کوفت اس کے وجود

میں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ زائل ہونے لگی اور دوسری صبح وہ مطمئن تھی۔ اس کے اندر ایک خود اعتمادی

اُبھرتی تھی۔

فاخرہ کا ہاتھ پکڑ کر مسیری پر بٹھالیا۔ اور فاخرہ بری طرح جھپٹ گئی۔ "آپ کے آج کیا پروگرام ہوں گے خاتون؟" انوار نے پوچھا۔

"آپ کے امکانات کی تفصیل۔" اس نے جواب دیا۔

"ہوں۔ سوچ لیجئے۔ اتنی سعادت مندی منگنی نہ چر جائے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"آپ کی اخروی میری زندگی ہوگی۔" وہ شرمیں لہجے میں بولی۔

"تمہارے یہ الفاظ میں نے ذہن میں محفوظ کر لیے ہیں۔" اس نے فاخرہ کی کھائی پکڑ

کر جھٹکا دیا اور فاخرہ خود ہی اپنے الفاظ کی گرفت میں آ گئی۔ بھلا ہوا لکھنا کا اس نے فوراً

مداخلت کی تھی۔ دروازے پر دستک دے کر اس نے اندر آنے کی اجازت مانگی تھی اور انوار

نے مہری سانس لے کر اجازت دے دی تھی۔ فاخرہ نے بے اختیار اپنے کی کوشش کی لیکن انوار

نے اس کی اس کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا اور وہ بے بس ہو گئی۔ اٹھٹھا چائے کی ٹرافی دیکھتی

ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

"صبح بخیر محترماً!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور ٹرافی میں سے ایک خوبصورت نگہداشت

نگاہ کر مسیری کی سائینڈیکل پر رکھ دیا۔ فاخرہ کسمپاسی تھی۔ اسے انوار کی اس حرکت پر تعجب ہوا

تھا۔ اس کے نزدیک تو شہرام بھٹی کی قربت تو ایک مقدس راز ہوتا ہے جو ہمیشہ ان دونوں کے

درمیان رہتا ہے۔ لیکن انوار کی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ کیا یہ بھی مرہب کی تہذیب کا

کوئی اہم جزو ہے۔

"صبح بخیر کس اٹھٹھا! آج آپ نے بھی کچھ جلدی کر دی۔ خیریت تو ہے؟" انوار بولا۔

"مجھے آپ لوگوں کے جاننے کی آتشیں مل گئیں تھیں۔ میں نے سوچا ان پر مسرت لمحات

میں چائے کی گری بھی مثال کر دوں۔" مس اٹھٹھا نے ہنسنے ہوئے کہا۔ اور چائے بنائے گئی۔

"آپ کیلئے شکر۔۔۔" اس نے فاخرہ سے پوچھا۔

"صرف ایک چپ۔۔۔" فاخرہ کو مٹھاس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود شہد میں ڈوبی ہوئی

ہیں۔ انوار نے جواب دیا اور فاخرہ نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپالیا۔

اٹھٹھا چائے رکھ کر چلی گئی تو انوار اسے جھپٹنے لگا۔ فاخرہ نے اس سے اس بات کی

شکایت نہیں کی تھی۔ وہ انوار کے مزاج کو سمجھنے میں بڑی محتاط تھی۔ چائے کے دوران بھی چھوٹی

چھوٹی باتیں ہونے لگیں۔ پھر انوار نے کہا۔ "اٹھٹھا کو میں نے یہاں تین ماہ کیلئے بھیج دیا ہے۔

ترکی یادوں کے گلاب

ایک ماہ اور چھ دن ہو چکے ہیں۔ باقی رہے ایک ماہ چوبیس دن۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس دوران

اس سے بہت سی باتیں سیکھ لو۔ اب یہ تمہاری ذہانت ہوگی کہ کس طرح اس سے اپنا مطلب نکال

لیں ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس مختصر وقت میں اس کے ذہن پر اپنی انگریزی بہتر چا سکتی ہو اور یہاں

نے آداب سے پوری طرح واقفیت حاصل کر سکتی ہو۔ کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ میں ایسا ہی کروں گی۔ لیکن یہ تین ماہ والی بات میری سمجھ میں نہیں

آتی؟" وہ بولی۔

"بھئی لندن میں مگر غلطی لازم نایاب ہیں۔ کچھ ایسے ادارے ہیں جہاں لوگوں کی وقتی ضرورت

جمادی منادفہ کے گر پوری کر دیتے ہیں۔ اٹھٹھا ایسے ہی ایک ادارے کی رکن ہے۔ اگر ہم نے

اسے مستقل ملازم رکھا تو ہماری آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ اس کی نذر ہو جائے گا۔ کیا خیال ہے۔

اگر تمہاری خواہش ہو تو؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میں کس لیے ہوں۔"

"بالکل یہ چھوٹی سی دنیا اب تم ہی نے سنبھالی ہے۔ مس اٹھٹھا سے تو یہ فائدہ ہو جائے گا

کہ وہ روزمرہ کی ضروریات سے تمہیں آگاہ کر دے گی۔"

"اس حد تک تو ٹھیک ہے۔" فاخرہ نے گردن ہلا دی۔

وہ بجے ٹاٹھ ہوا اور اس کے بعد دن بھر کا پروگرام طے ہونے لگا۔ لندن کے حسین شب و

روز کی ابتدا آج ہی دن دو پہر کو ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

ٹرینٹر اسکوائر بجلی سی دھوپ میں نہایا ہوا تھا۔ چمک کے وسط میں استود بلند و بالا ستون کی

بڑی پر کھڑے لارڈ نٹن کی فوٹو دھوپ میں چمک رہی تھی۔ پینٹل میٹری کے پوانی ستونوں اور

تخت پال کر گاہ کے گنبد سے اترے والے کپڑے لوگوں کے التفات سے محفوظ ہو رہے تھے۔ ایک

جانب ایک بڑے فوارے کے وسط میں ایک دیوڑا پھیلی کا مجسمہ ٹھہرے پھلائے منہ سے کیلیوں

پانی اٹھ رہا تھا۔

منگنی چھت کی خوب صورت کار میں یہ بجلی سی دھوپ ذرا بھی ناگوار نہیں مگر رہی تھی۔

فاخرہ جیسے خواہوں کے جہان میں آ گئی تھی۔ اسے یہ خواب بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ اس کی سوچیں بار

بار بھٹک جاتی تھیں۔ کہیں اس خواب سے آنکھ نہ کھل جائے۔ چائے تو اسی گھر کے روزگار کے



ترقی یاروں کے گھاپ

اس احساس کے ساتھ اسے اپنی کیفیت کا تجزیہ کرنا مشکل ہوتا تھا۔ آیا کوئی کیفیت اس کیلئے خوشگوار ہے۔ انوار اسے لندن سے روشناس کروا رہا تھا۔ اور تمام دن وہ خوبصورت جگہوں کی سیر کرتے رہے۔

”ٹھیک ہے۔“ انوار نے کہا۔ اور دونوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے نمبر ڈائل کیے۔ ریسپونڈر کاں سے لگا یا۔ چند ساعت منتظر کرنے کے بعد یو۔اے۔ ”بھئی بیگم قریب ہی موجود ہیں۔ آج سارا دن آوارہ گرد رہی ہے۔ ذرا ان سے معلوم کر لوں اس کے بعد ہی جواب دے سکوں گا۔“ انوار نے کہا۔ اور باؤتھ میں پرہاتھ رکھ کر بیٹا۔

”میں کیا بتاؤں جیسے آپ پسند کریں۔“

ہوتا ٹھیک ورنہ معذرت کر لیں گے۔“

”بس ٹھیک ہے۔ قبول کیے لیتے ہیں۔“ اس نے کہا اور پھر ماؤتھ میں سے ہاتھ ہٹا کر بولا۔ ”ٹھیک ہے اکبر، ہم رات نو بجے پہنچ جائیں گے۔ لو کے۔“ اور اس نے فون بند کر دیا۔ ”یہ اکبر بھی منجھلا ہے۔ ایک وقت کی کئی لڑکیوں سے عشق کر رہا ہے اور ہر ایک سے شادی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ مجھے تو خطرہ ہے کہ کسی دن سب کیجا ہو گئیں تو اس کے سر پر ایک بال نہیں بچے گا۔“

”اچھا ملائی جی! لباس کا انتخاب کر لیں کون سا لباس زیب تن کریں گی۔ ارے ہاں فخر خواہ!

Courtesy of [www.pdfbooksfree.pk](http://www.pdfbooksfree.pk)

یہ کیا دوا ہے؟

اس وقت کیلئے اس نے شام کے وقت کی مناسبت سے گھرے غیلے رنگ کی سادھی منتخب کی اور پھر جس اخیلا کی حد کے بغیر میک اپ کیا۔ میک اپ کا اسے خاص طبع تھا۔ انوار اسے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔ اور اس نے بہت سے خوشی کلمات کہے اور یلا۔

☆☆☆☆

”بہت جلد میں جھپٹیں مس ایلین سے شادی کی خوشخبری سنانے والا ہوں۔ ویسے انوار، بھائی! کوڑھ کر میری نسبت خراب ہو گئی ہے۔“ آخری الفاظ اس نے اردو میں کہے تھے۔

”مسوری..... میرا مطلب ہے۔ اپنا دلوں اپنا دلوں ہی ہوتا ہے۔“ اکبر نے غائرہ کو اوپر سے دیکھ کر کہا۔

سے ذرا بھی بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کھانا اٹھایا گیا اور ٹھنڈی دیر کی خوش پیوں کے بعد انوار نے رخصت کی اجازت چاہی۔ اکبر انہیں باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ غار نے احتیاطاً اکبر کے بارے

حزکتوں کو وہ شرارتوں سے تشبیہ دے رہا تھا۔ اور ظاہر کو ایک نامور ساحس اس طور پر تھا۔ اس سے دل میں سوچا کہ ظاہر ہے کہ انوار بھی ایسے ہی لوگوں کی صحبت میں رہا ہے۔ اس سے قبل اس کی

گھر آئی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اب اس کے دوستوں کا انتخاب میں کروں گی۔ اور اسے ایسے مکیا کردار کے ٹوکوں سے بچاؤں گی۔ اس نے اس بات پر انوار کی طرف سے ذل خراب نہیں کیا تھا۔ دوسرے دن تقریبات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس دن وہ شام کے سرگرمی دھندلوں میں گھر سے نکلے تھے۔ مشہور زمانہ پیکاڈی سرکس کے گرلاکھوں روشنیوں جیگہاٹھی تھیں۔ پکاڈی میں ایرواز کے جیسے کے گرہ پیوں کا مسکن تھا۔ جہاں سے ناقوس کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ اور ان آوازوں کے اور میان بری کر شاہ ہرے رام کا چاپ ہور ہا تھا۔ سفید سل کے لڑکے لڑکیاں ہندوؤں برہمنوں اور دیو دیویوں کا روپ دھارے فٹ پاتھ پر تاج رہے تھے۔ اور لڑکوں کے سر منڈے ہوئے تھے۔ بعض کے سروں کے درمیان چڑیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ ان بہروپیوں نے سفید دھوپیاں اور کھڑاویں پہن رکھی تھیں۔ ہاتھوں میں گھنٹیاں اور گلے میں دھونگیاں ڈال رکھی تھیں۔ جنہیں بجا بجا کر وہ لندن کے ہندو مندہ کیلئے چندہ جمع کر رہے تھے۔

بے انتہا خوبصورت دوکانیں اور شور وحر بازار میں گھرے ہوئے تھے۔ یہ شور وحر اسے حسین تھے کہ ان کے سامنے سے نظر چر کر گزر جاتا ہے حد مشکل تھا۔ راکھروں سے فٹ پاتھ اٹنے پڑے تھے۔ اسی بھیڑ میں انوار نے فاخرہ کیلئے زبردست خریداری کی اور لاکھوں روپے کے ملبوسات، زیورات اور دوسری آرائشی چیزیں خرید لیں۔ صبر ایذا نہ لار لارڈ اینڈ لیلڈی کے جوہرات کی دوکانوں سے اس نے کافی خریداری کی اور جب فاخرہ روپائی ہوگئی تب کہیں دو وہاں سے نکلا۔

”آپ نے اس وقت شدید زیادتی کی ہے۔“  
”کیوں؟“

”کیسے کیسے لباس خریدالے کیا میں یہ لباس پہنوں گی؟“  
”یہ تو آنے والا وقت بتائے گا۔ لندن انجینئروں کو اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے۔“  
”لیکن مجھے اپنا رنگ پسند ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ دل چاہے تو ان لباسوں کو پہن لینا اور نہ شافروں اسٹریٹ میں حسین ترین سازدھاریاں اور شلواریٹ بھی لیا جائیں گے۔“ انوار نے کہا۔  
اور یہ جراتی رقم پر بارہوئی؟

”ہوئے دو ہاتھ کمانے والا میں ہوں۔ جس میں فکر کیوں ہے؟“

ترکی یادوں کے گلاب

”میں جناب آپ کمانے والے ہیں تو میرا فرض آپ کی کمائی کو سنبھالنے کا ہے۔ اب آپ اس بے دردی سے خرچ نہیں کریں گے۔“ وہ بولی اور انوار نے ایک تہقہہ لگا دیا۔

”بہتر ہے جناب آئندہ خیال رکھیں گے۔“ اس نے کہا۔ اور بات آئی گئی ہوگئی۔ بہر حال انوار کے اس اعزاز سے بھی فاخرہ نے یہی نتیجہ نکالا کہ وہ اسے خوش دیکھنا چاہتا ہے۔

ایک ماہ اسی طرح گزر گیا کہ فاخرہ کو احساس بھی نہ ہو سکا۔ لندن کی کھر زوہ شامیں، پارٹیں، جو کسی وقت بھی ہو جاتی تھیں اور ان میں موسم کا تقین نہیں ہوتا تھا اور تفریح کا ہیں جہاں جا کر وہ ایسی مشکل ہو جاتے۔ انوار اسے پورے لندن سے روشناس کر رہا تھا۔ اس نے یہاں کے ٹائٹ کلب، کبھر سے ہال اور آجرا ہاؤس بھی دکھائے تھے۔ جہاں قدم رکھنے سے بھی شرمندگی ہو۔ عریانیت اور فحاشی کے ایسے مظاہرے کہ فاخرہ کی آنکھیں بند ہو جاتیں تھیں۔ ان مظاہروں کے بعد وہ شوہر سے آنکھ ملانے کے قابل بھی نہیں رہتی تھی۔

ایک بار اس نے شکایت کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”انوار! میں ایسی بچیوں پر جانا پسند نہیں کرتی۔ جہاں تفریح اور رقص و موسیقی کے نام پر انسانیت کی تبدیلی کی جاتی ہو۔ آپ مجھے ان بچیوں پر نہ لے جایا کرو۔“

”اوہ..... فاخرہ! انسان کو زندگی کی تمام حقیتوں سے روشناس ہونا چاہئے۔ میں تمہارا شوہر ہوں۔ ان بچیوں پر تمہارے ساتھ ہونا ہوں۔ پھر تمہیں کس بات کی فکر ہے۔ بخئی انسان کو کشادہ ذہن ہونا چاہئے۔ یہ دنیا نوہیت ہمیں کیا دیتی ہے۔ یہ اس جہان کی حقیقتیں ہیں۔ آنکھیں بند کر لینے سے بلی نہیں بھاگتی۔ تمہیں ان ساری تقریبات میں دلچسپی لینا چاہئے۔ کیونکہ میں انہیں پسند کرتا ہوں۔“

انوار نے یہ الفاظ لازم لہجے میں کہے تھے۔ لیکن اس میں حق شوہریت چھپا ہوا تھا۔ یہ الفاظ عمر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک لمبے کیلئے فاخرہ گم م ہوگئی۔ انوار ان چیزوں کو زندگی کی حقیقت بتا رہا تھا۔ جرز زندگی کا مذاق اڑاتی تھیں۔ لیکن اس سلسلے میں کوئی بحث کر کے وہ انوار کے دل میں کوئی ہال ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے وہ خاموش ہوگئی۔

تب انوار نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”تم خود کو میری مرضی پر چھوڑ دو فاخرہ! میں تمہیں ایک جدید اور مازن لڑکی بنا دوں گا۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میرے دوست تم پر کیسے کیسے تھرے کرتے ہیں۔ تمہارا نام لے کر ان کے لہجوں میں حسرت جھانکتی ہے۔ بس تمہاری سی کی ہے۔ جو دور



تو جاسے گی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ ایسی جمہوں پر تم تنہا عورت نہیں ہوتیں۔ دوسرے لوگ بھی اپنی دوستوں اور بیویوں کے ساتھ آتے ہیں۔ آخر وہ بھی انسان ہیں۔ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں اگر اس کی دلچسپیاں نہ پتا نہیں گئے تو ان کے درمیان اجنبی بن کر رہ جائیں گے۔ سمجھ نہیں تم؟“

اس نے گردن ہلا دی۔ اس کے دل نے ان باتوں کو ذرا براہر بھی قبول نہیں کیا تھا۔ لیکن.....

انوار اس دوران صرف تین بار پورے دن گھر سے غائب رہا تھا۔ ایک رات کو اس نے فون کر دیا تھا کہ وہ گھر نہیں آئے گا اور یہ رات اس نے تنہا گزار لی تھی۔ اس کا مطلب بھی رات کو نہیں جلی گئی تھی۔ پوری زندگی میں یہ پہلی رات تھی وہ نہ وہ کبھی تنہا نہ رہی تھی۔ چار بجے تک وہ سو سکی تھی۔ دوسرے دن صبح ہی صبح انوار واپس آ گیا۔ لیکن یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ساری رات جاگ رہا ہو۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اور کپڑے تھکے تھے۔

”کیا آپ رات بھر نہیں سو سکے؟“ اس نے پوچھا۔

”کہیں ڈارلنگ۔ ساری رات جہازوں کے درمیان گزاری ہے۔ اجازت دو تو سو جاؤں۔“

”ناشتا کر لیں۔“

”بالکل جی نہیں چاہ رہا ہے۔ پلیز تم ناشتا کر لیتا۔ میں سونے جا رہا ہوں۔“

”لہاس تو بدل لیں۔“

”ایں۔۔۔ ہاں لہاس دے دو۔“ انوار نے کہا۔

وہ بچکا بچکا سا تھا۔ قاہرہ نے سوچا کہ رات بھر جانے کی وجہ سے اس کی یہ کیفیت ہے۔ اس نے بڑے پیار سے انوار کو سلا دیا تھا۔ کمرے کی جتیاں بجھا کر اس نے کھڑکیوں کے پردے مگر دیے تاکہ وہ سون سے سو جائے۔ انوار کا اتارا ہوا لہاس کے گرد باہر نکل آئی۔ لہاس ہر دو بجے تھے اور ان سے عجیب سی بوا آ رہی تھی۔

نہ جانے کبھی ہو ہے۔ اجنبی اجنبی سی۔ جیسے کسی دوا کی بو ہو۔ بہر حال یہ انوار کا کاروبار تھا۔ وہ کیا کر سکتی تھی۔ اس نے ذہن میں کسی بات کو کوئی جگہ نہیں دی۔ دوپہر کو انوار چاگا۔ تو وہ تازہ دم ہو چکا تھا۔ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر ان دونوں نے لچ کیا اور لچ پر انوار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب تم بناؤ تمہارا ت کیسے گزری؟“

”نہایت تکلیف دہ۔ میں زندگی میں کبھی تنہا نہیں رہی۔“ اس نے جواب دیا۔

”لیکن اب آپ ایک لمبے دار خاتون ہیں۔ اب تو آنکھ آپ کو تنہا رہنا پڑے گا۔ میری

مسرونیات ہی ایسی ہیں۔“

”ٹھیک ہے عادت ازل لوں گی۔ یہ سچھلا بھی مجھے کہاں جلی گئی ابھی تک نہیں آئی۔“

”ممکن ہے وہ اب نہ آئے۔“

”کیوں؟“

”میں نے جھپٹ لیا تھا ناں کہ وہ صرف تین ماہ کیلئے آئی تھی۔ اس کا عرصہ تقریباً پورا ہو چکا

ہے۔ ویسے میرا مشورہ ہے کہ اب دوسروں کے سہارے چھوڑ دو۔ خود اعتمادی پیدا کرو۔ دوست

بناؤ۔ لندن کی زندگی میں یہ بہت ضروری ہے۔“

”لیکن میں دوست کیسے بناؤں؟“

”بھئی اچھے لوگوں سے ملی ہو۔ ان میں سے کوئی تمہارے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ انہیں

میں سے انتخاب کر لو۔ وقت کاٹنے کی فن کی قویات ہے۔“

”آپ اپنے دوستوں کی بات کر رہے ہیں؟“

”ہاں۔“

”لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کے ساتھ اس کی فیملی ہو جبکہ لندن میں بے شمار

پاکستانی گھرانے بھی رہتے ہوں گے۔“

”فیملی نہ ہو خود تو ہیں۔ دوستوں کیلئے ضروری نہیں کہ مرد اور عورت کی خصوصیات کی جائے۔“

انوار نے ردوار میں کہا۔ جیسے یہ کوئی خاص بات نہ ہو۔ لیکن وہ ششدر رہ گئی تھی۔ اسے یہ الفاظ

ایک شہر کے الفاظ محسوس نہیں ہوئے تھے۔ وہ تحیرانہ انداز میں انوار کو گھٹی رہی۔ ایک لفظ بھی نہیں

نکل سکا تھا اس کے منہ سے۔

”آج ساؤتھ ہی چل رہے ہیں۔ لندن سے تیس میل کے فاصلے پر ایک بڑا فضا مقام ہے۔

تیار ہو جاؤ۔“

”بہتر۔ میں گھر چلا آتی ہوں۔“ قاہرہ نے کہا۔

”کل لکھو بتا۔ میں پوسٹ کروں گا۔“ انوار نے کہا۔ اور پھر گھڑی دیکھ کر بولا۔ ”وہ لوگ

مقتصد یہ تھا کہ وہ تیار ہو جائے۔ اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ لیکن انوار کے الفاظ اب بھی اس کے ذہن میں دھمک پیدا کر رہے تھے۔ اس نے اپنے دوستوں سے دوستی کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ٹھیک ہے۔ ماحول آدمی کا حلیہ بدل رہا ہے اس کا خمیر تو نہیں بدل رہا۔ یہ بات ایک پاکستانی شخص کے ہونٹوں سے کیسے نکل سکتی ہے۔ وہ اپنی افتادہ کیسے بدل سکتا ہے۔ لیکن انوار نے یہ کہا تھا۔ اس نے یہ ہی سنا تھا۔

ٹھیک تین بجے گاڑیاں فلیٹ کے نیچے آکر کھیں۔ چھ بوجھیں لڑکیاں اور چھ پاکستانی مردانہ کراؤ آگئے۔ ان میں اکبر بھی تھا اور اس کے ساتھ جولاڑی تھی وہ چلی لڑکی نہیں تھی کوئی اور تھی۔ چائے کا تقاضا ہو اور وہ جلدی جلدی چائے پلانے لگی۔ پھر چائے پینے کے بعد وہ سب چل پڑے۔ انوار کی کار میں صرف وہ تھی۔ انوار خود ڈرائیج کر رہا تھا لیکن وہ بھی جھمی سی تھی۔ انوار نے درمیان میں اسے نوکا بھی۔ "بہت خاموش ہو؟ ناخروہ؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" وہ بولی۔

حالا نکہ خاص بات تھی۔ انوار کے یہ سارے دوست ہی اسے لے لینگے لگ رہے تھے۔ کسی کے چہرے پر شرافت نہیں تھی۔ ان میں سے کسی کے ساتھ اس کی بیوی نہیں تھی۔ یہ سب لڑکیاں گرل فرینڈ تھیں۔ اور پاکستان میں گرل فرینڈ کا تصور ذرا مختلف ہوتا ہے۔ انوار کو اسے ان لوگوں میں شریک نہیں کرنا چاہئے تھا۔ وہ اس کی عزت تھی۔ وہ تو اس کی بیوی تھی۔ اس کا مقام ان لڑکیوں سے کبھی بلند تھا۔ لیکن انوار نے یہ بات ایک بار بھی نہیں سوچی تھی۔ انوار نے اسے وہ مقام نہیں دیا تھا۔ اس نے خود کو سنبھال لیا۔ لیکن انوار کو یہ خاموشی گراں نہ گزرتی۔

☆.....☆.....☆

یہ ایک حسین ترین قصبہ تھا۔ جہاں گاڑی سڑ کر رہی تھی۔ رستے پھر برے پھرے باغات کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور اس کے بعد مسند رکھی گئی کا احساس ہوتا تھا۔ اس پارک کے اوپر گولا تھا اور قہوہ خانے پھیلے ہوئے تھے اور میلے سالکا ہوا تھا۔ جگہ جگہ پھول کا بیج لگا ہوا تھا۔ وہیں ایک دور افتادہ مقام پر منصوبی آرٹسٹ کے نزدیک ٹھہرے گئے۔ منصوبی آرٹسٹ کا بیٹا ہندی سے کراتا تھا۔ ایک چھوٹی سی ندی بننا تھا اس پر چلا جاتا تھا۔ اس کی پھواریں دور دور تک بکھری رہیں۔ سات بجے لگائے گئے تھے۔ ہر جواز اپنے اپنے خیمے میں تھا۔ وہ لوگ بچکانہ خوش فطریں

میں معروف ہو گئے۔ حالا نکہ ان کی عمریں ایسی نہ تھیں۔ لیکن وہ سب کچھ بھول گئے تھے۔ لڑکیاں ان کے ساتھ تھیں۔ "آؤ ناخروہ۔ ان سب میں شریک ہو جاؤ۔" انوار نے کہا۔

"میں آپ کے ساتھ ہوں۔" وہ چنچلی چنچلی آواز میں بولی۔

انوار نے اس کی ذوقی ہوئی آواز پر توجہ نہیں دی۔ یہاں سارے ہی خباثت جمع ہو گئے تھے۔ سکھ آندہ ایک گٹار لے آیا تھا۔ جس کے کسی تار سے اس کی کوئی واقفیت نہیں تھی۔ لیکن وہ گٹار بجا رہا تھا اور سٹیڈ لڑکیاں اس کے گرد جمع ہو کر رقص کر رہی تھیں۔ قہقہہ لگا رہی تھیں۔ پھر اکبر دونوں ہاتھ بلند کر کے ان کے ساتھ ہانپنے لگا اور اس کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ لیکن جب انوار بھی ان کی طرف بڑھا تو اس نے انوار کی آستین پکڑ کر کھینچ لی۔ ایک سوہوم سے آسرے پر کدو رک جائے گا۔ انوار ان جیسا نہیں ہے۔ وہ ناخروہ کا شوہر ہے۔ ایک سنجیدہ اور شریف نوجوان۔

دوسرے لمحے انوار نے اسے بھی اس مجمع میں محسوس کیا۔ وہ اس کی کمر پکڑ کر اٹھنے لگا۔ "انوار! وہ کس سا؟ لیکن انوار نے اسے نہ چھوڑا۔ تو وہ زور سے گرتی۔ "انوار!"

دور رک گیا۔ صرف ایک لمحے کیلئے اس نے رک کر اسے دیکھا۔ پھر پٹکیاں بجا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اسے یہ سب دیکھانے لگ رہے تھے۔ جوا نہا مذاق اڑا رہے تھے۔ ناچنے والوں نے اب جڑوں کی شکل اختیار کر لی۔ انوار کیلئے اس کے ساتھ تھا۔ اور اسے دیکھ کر اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ شمشیر عقب سے اس کے پاس پہنچ گیا۔ اور اس کی ہتھی کر میں ہاتھ ڈال کر اسے آگے دھکیلے گا۔ جب ہی نہانے کہاں سے اس کے بدن میں یہ قوت آگئی۔ نہانے کہاں سے اس کے اندر یہ جرات آگئی۔ اسنے زور سے خیمہ مارا تھا اس نے شمشیر کے گال پر کدو کرتے کرتے بجا۔ چٹناخ کی آواز گٹار کی آواز پر بھاری پڑ گئی۔ گٹار رک گیا۔ سب رک گئے اور اسے دیکھنے لگے۔ شمشیر کو دیکھا تو وہ اپنا گال سہارا ہاتھ اور اس کا گال سرخ ہو گیا تھا۔

اس وقت اکبر علی نے ایک بلند بانگ قہقہہ لگایا اور پھر گانے لگا۔ "پاکستانی لڑکی ابتداء میں تھپڑی مارتی ہے۔" بھونڈا اور بے لگا بگاتا تھا۔ لیکن سکھ آندہ نے اسی پر گٹار کے سر ملا تا شروع کر دیے اور لڑکیاں تھرکتے لگیں۔ رقص پھر شروع ہو گیا۔ لیکن انوار اس رقص میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کا آثار تھے۔

ناخروہ وہاں نہ رہی اور اپنے خیمے میں آگئی۔ اس کی آنکھوں میں تاریکیاں گردش کر رہی



تھی یادوں کے گلاب  
 تھیں۔ معاشرہ کے کچھ اصول بھی ہوتے ہیں۔ دوسرے میں اچھا کھانا بھی تو ممکن نہیں ہے۔ اس  
 کا خیال تھا کہ انوار بھی اس کے پیچھے آجائے گا۔ لیکن کافی دیر گزر گئی انوار نہیں آیا۔ شاید رات ہو  
 گئی۔ پھر رات گہری ہو گئی۔ اس کا بدن دکھ دیکھا تھا۔ جب انوار خیمے کے دروازے میں داخل ہوا۔  
 ”روشنی جلاؤ۔ تاریکی کیوں کر رکھی ہے۔“ اس کی آواز بری طرح لڑکھاری تھی۔

فاخرہ کے پورے بدن میں خود خیال کاٹنے لگیں۔ انوار کی آواز ابھی تھی۔ اس سے قبل  
 اس نے یہ آواز نہیں سنی تھی۔ ”انوار۔“ اس نے اندھیرے میں اس کی کھائی پکڑ لی۔ اس کی آواز  
 سسکی میں کر طعن سے نکلی تھی۔

”کون؟“ کبھی سترین، مایا۔ کون ہے؟“ انوار نے اسے ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

”میں تمہاری بیوی ہوں انوار۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“ وہ رو پڑی۔

”جی؟“ انوار نے کہا۔ اور اس کے لہجے میں تعجب تھا۔ جیسے اس لفظ پر اسے حیرت ہوئی  
 ہو۔ ”اوہ۔۔۔۔۔ کوئی یہ تم ہو۔“ اس نے بے سبب انداز میں ہنسنے ہوئے کہا۔ اور یہ سن نام فاخرہ کے  
 دل میں بھالوں کی طرح لگے۔ انوار کے بدن سے بواٹھ رہی تھی۔ ایسی ہی بوجھ اس نے اس کے  
 کپڑوں میں محسوس کی تھی۔ تو وہ بھی شراب کی بو تھی۔

ساری رات ایک لمبے کیلئے بھی آنکھ نہ لگی۔ وہ انوار کے بارے میں سوچتی رہی اور حیران  
 ہوتی رہی۔ انوار کی محبت میں اسے کچھ بھی یاد نہ رہا تھا۔ وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ لیکن آج رات  
 اسے سب یاد آئے تھے۔ یہاں انوار کے سوا کون تھا؟ کوئی بھی تو نہیں۔ لیکن انوار۔۔۔۔۔  
 دوسری صبح انوار سو جا رہا تھا۔ آٹھ گھنٹے گھول کر اس نے فاخرہ کو دیکھا۔ دیکھا رہا۔  
 اور پھر ایک گہری سانس لے کر اٹھ گیا تھا۔ فاخرہ نے اس سے کچھ نہیں کہا تھا۔ انوار خیمے سے باہر  
 نکل گیا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد واپس آ گیا۔

”ناشتہ کلاؤ۔“ اس نے بھاری آواز میں کہا۔ اور وہ جلدی سے اٹھ گئی۔ اس نے وہ پکٹ  
 نکالنے لپے جو وہ ساتھ لائے تھے۔ دیکٹوں میں باقی کھانا تھا۔ انوار کھانے لگا۔ اور اسے یونہی بیٹھے  
 دیکھ کر بولا۔ ”کھاؤ ناں۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ وہ کزور آواز میں بولی۔ کھانا تو اس نے رات کو بھی نہیں کھایا تھا۔

”فاخرہ۔۔۔۔۔“ وہ کڑخت لہجے میں بولا۔ ”کھانا کھاؤ۔“ لہجہ فیصلہ کن تھا۔

وہ خود بخود ہو گئی اور پھر اس کے ساتھ یہ بے عزت کھانا تازہ ہر مار کرنے لگی۔ اسے اپنی بے بسی پر

تھی یادوں کے گلاب

۱۱۔ آ رہا تھا۔ وہ خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر انوار نے اسے تیار ہونے کو کہا۔  
 اور اس نے گردن ہلا دی۔

تیس میل کا سفر طے کرنے کے بعد وہ واپس غلیٹ پہنچ گئے۔ فاخرہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا  
 تھا کہ آخر یہ لوگ وہاں کیوں گئے تھے؟ نہ تفریح ہوئی نہ بیرونی سیاحت۔ بدعمر کی اہلیت ہو گئی تھی۔  
 پھر انوار نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ غلیٹ پر آ کر پہلے اس نے غسل کیا۔ پھر دوسرے  
 کمرے میں جا کر سو گیا۔ اس دوران وہ بیٹھی سوچتی رہی تھی۔ انوار کے بارے میں کسی بے  
 انداز میں سوچنا بھی اب اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ اس کے دل میں انوار کی محبت تھی۔  
 ایک شرمیلی عورت کی مانند اس نے انوار کو اپنا سب کچھ تسلیم کر لیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ پیار  
 سے انوار سے بات کرے گی۔ اسے سمجھائے گی۔ ظاہر ہے وہ یہاں کے ماحول میں ڈوبا ہوا  
 ہے اسے یہ سب کچھ یوں برائیں لگتا کہ اس نے ایک طویل زندگی لندن میں گزار دی ہے۔ اس  
 کی نہ ہاں ہے نہ بہن جو اسے عورت کی عظمت کا احساس دیتا۔ پھر اس نے کھانا تیار کیا اور انوار  
 کو بچانے پہنچ گئی۔

لیکن وہ جاگ رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر سسکائی لیکن انوار سنجیدہ رہی رہا۔ ”کھانا نہیں کھائیں  
 گئے۔“ اس نے محبت سے پوچھا۔

”بھوک نہیں لگ رہی۔ تم نے کھانا کیا؟“

”آپ کے بغیر کیسے کھائی؟“

”میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”ماضی ہوں۔“

”تم نے ششیر سے منہ پر تھپڑ مار کر میری سخت توہین کی ہے۔“

”اس نے میرے بدن کو چھوا تھا۔ انوار۔“

”تقص کیلئے۔“ انوار بولا۔

”لیکن انوار! عورت کا بدن صرف اس کا سوہرہ چھو سکتا ہے۔“

”پاکستان میں۔ لیکن یہاں کی ریت دوسری ہے۔“

”ہم پاکستانی ہیں انوار۔“ وہ بولی۔

”ٹھیک ہے لیکن اب ہم یہاں کے پلجر میں سانس لے رہے ہیں۔ یہاں کا کھانا ہے

تری یادوں کے گلاب

جس۔ کسی کے گھر میں رہ کر اس کے اصولوں سے بننا تو ہاں ہی ہے۔  
 ”ممکن ہے لیکن یہ میری دگ وہ ہے میں کسی ہوئی ہے۔ میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتی۔  
 اس نے جواب دیا۔

”خدا میرے دوست مجھ پر نہیں؟“

”میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں جن لوگوں کو تم دوست کہتے ہو۔ وہ اچھے انسان نہیں ہیں۔“

”فاخرہ! یہ میرے بہت پرانے ساتھی ہیں۔ تم نے ڈیڑھ ماہ میں انہیں پہچان لیا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ میں نے انہیں عورت کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ جن میں سے کوئی بھی شریف انسان نہیں۔“

”میں بھی انہی میں شے ہوں محترم! آپ کو اپنے اندر تہذیبیاں پیدا کرتی ہوں گی۔ آپ اسے براہِ رحم سمجھ سکتی ہیں۔ چاہے کھانا کھائے آجے۔“ انوار نے کہا۔

وہ اٹھ گئی۔ اس نے سوچا تھا کہ انوار سے بہت سی شکایتیں کرے گی۔ اس سے ہاتھ پرں کرے گی کہ اس نے شراب کیوں پی۔ لیکن انوار کی گفتگو سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ انوار اس سلسلے میں قائل نہیں ہوگا۔

کھانا کھانے کے بعد انوار چلا گیا اور وہ بہت سے فیصلے کرتی رہی۔ آخری فیصلہ اس نے یہ کیا کہ تھوڑی سی پلک پیدا کر کے پیار سے انوار کو رونا راست پر لانے کی کوشش کرے گی۔ خود بھی اس کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ رات کو انوار واپس آیا تو اس کی کیفیت بھی بدلی ہوئی تھی۔

”یہ خط آیا ہے تمہارا۔ کل تم بھی خط لکھ دو اپنے گھر۔ میری بہت سی شکایتیں لکھ دو بنا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”خدا نہ کرے۔ مجھے اگر آپ سے کوئی شکایت ہوگی تو وہ میرے اور آپ کے درمیان رہے گی۔“ اس نے کہا۔

افتخار احمد کا خط آیا تھا۔ جس میں لاتعداد دعائیں تھیں۔ اس کی ہدائی کے آئسو تھے۔ لیکن یہ تحریر اب کی نہیں تھی۔ ایٹلا اور نائل کی بھی نہیں تھی۔ وہ ان تینوں کی تحریر پہچانتی تھی۔ بہر حال یہ کوئی قابلِ توجہ بات نہیں تھی۔ اس نے دوسرے دن جواب لکھ کر انوار کو دے دیا۔ انوار نے کہا۔ کہ وہ اس خط کو پوسٹ کر دے گا۔ لیکن انوار کے ذہن میں نہانہ کیا تھا۔ گھر سے باہر آ کر اس نے لٹاؤ کھول لیا اور خط پڑھنے لگا۔ خط میں اس حسین زندگی کی روداد تھی۔ جو وہ وہاں گزار رہی تھی۔ اپنی

تری یادوں کے گلاب

لوہیوں کے تذکرے تھے۔ انوار کی تقریبیں تھیں لیکن انوار نے وہ خط پوسٹ نہیں کیا۔ اس نے اس کو ہر کو اپنے ہاتھ سے لکھا۔ اور اس میں کچھ سطروں کا اضافہ کر دیا۔ تاکہ اور ایٹلا کیلئے کچھ تحائف بھیجنا ہوائی ہوں۔ لیکن اس میں مشکلات ہیں۔ اس لیے یہ ڈرافٹ بھیج رہی ہوں۔ انہیں اس کی پسند کی چیزیں اس رقم سے دلوا دیں۔ فاخرہ نے اس غلطی کا پتہ بھی لکھا تھا۔ جسے انوار نے بدل دیا اور پھر ادا پوسٹ کر دیا۔

وقت گزرتا رہا۔ کافی دنوں تک کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ سوائے اس کے کہ انوار نے اب کبھی کبھار گھر میں شراب کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ ایک بار جب فاخرہ نے اعتراض کیا تو وہ غصہ کر پڑا۔ ”اس سے وہی لوگ نفرت کرتے ہیں جنہوں نے کبھی اسے استعمال نہیں کیا۔ تم اسے ایک بار بچھو۔ اس کے بعد جو تم کو بھی منظور ہوگا۔“ اور فاخرہ کا نوس کواٹھ لگا کر رہ گئی۔

پاکستان سے افتخار احمد صاحب کے خط آتے رہتے تھے۔ ایک بار بھی انہوں نے یہ نہیں لکھا تھا کہ فاخرہ پاکستان آنے کی کوشش کرے۔ فاخرہ بھی ہر خط کا جواب دیتی تھی۔ لیکن یہ خط اصل نہ ہوتے تھے۔ انوار پاکستان سے آنے والے ہر خط کا مضمون بدل دیتا تھا۔ اور فاخرہ کے جو خط پاکستان جاتے تھے۔ ان کی تحریر بھی انوار کی ہوتی تھی۔ ان تحریروں کے ساتھ کبھی کبھی تورات کے ڈرافٹ بھی ہوتے تھے۔ انوار کی مصروفیات کی داستان ہوتی تھیں۔ اپنی حسین زندگی کی کہانی ہوتی تھی۔ لندن کے قصبے ہوتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

پھر ایک دن انوار نے کہا کہ وہ دو تین دن کیلئے دوسرے ملک جا رہا ہے کچھ کام سے۔ اکبر علی سے کہہ دیا ہے کہ وہ گھر کا خیال نہ رکھیں۔ تم بھی ان سے تعاون کرنا کوئی جہالت نہ ہونے پائے۔ ”علی اکبر صاحب کی کیا ضرورت ہے۔ تم میری طرف سے بے فکر رہو انوار! میں یہ وقت گزاروں گی۔“

انوار بری طرح چڑ گیا۔ ”فاخرہ! میری کسی بات سے اختلاف کے یہ آخری الفاظ ہونے چاہئیں۔ اس کے بعد کوئی اختلافی بات کہی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور غصے میں پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔ اس نے کپڑے وغیرہ بھی نہیں لئے تھے۔ رات ہو گئی لیکن وہ واپس نہ آیا۔ ہاں تو بچے تلخ بھی تو اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ اس کے ذہن میں انوار ہی تھا۔ لیکن اکبر علی صاحب کو کہہ کر وہ ایک لمحے کیلئے ساکت رہ گئی۔



۔ ہند جوڑے یہ کون سی خاص بات ہے۔ کیوں آپ اس بات کی قائل ہیں۔  
 ”کون سی بات کی.....؟“

”یہ ہی کردوستانوں کی ہر چیز اپنی ہوتی ہے۔“ اکبر علی نے کہا اور ہنس پڑے۔ اس ہنسی میں  
 بیگانہ تھی ان جملوں میں کیسکی چھٹی ہوتی تھی۔ تاخیر خوف سے کاٹنے لگی۔ کئی منٹ وہ ساکت و  
 ہاد ہنسی رہی پھر اکبر علی کی آواز ابھری۔ ”تو کیا فیصلہ کیا آپ نے؟“  
 ”کس بارے میں؟“ وہ خراب کے عالم میں بولی۔  
 ”فیضان چلیں؟“ اکبر علی نے پوچھا۔

اکبر علی صاحب آپ کا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔ انوار نے آپ جیسے کہنے انسان پر غلط  
 بھروسہ کیا ہے۔ اٹھیں نکل جائے یہاں سے۔ ورنہ میں آپ کا دماغ درست کر دوں گی۔“  
 ”ارے آپ تو برا مان گئیں۔ میری تو خواہش تھی کہ آپ.....“ جب کی بات ہے۔ اسے  
 عرصے میں آپ اس ماحول کو نہیں سمجھ سکیں۔ سحر سے یہ ہی زندگی ہے۔ اس زندگی سے لطف  
 اٹھائیے۔ جس طرح آپ کا شوہر اغیار ہوا ہے۔ آپ کیا سمجھتی ہیں وہ فرانس میں ہے۔ یا کسی  
 دوسرے ملک گیا ہے۔ آئیے میں دکھاؤں آپ کو کہ وہ کہاں ہے؟“  
 ”کہاں ہے انوار؟“ تاخیر نے پوچھا۔

”خوشی کے قلیف پر۔“ لیکن اس کی دوست ہے اور میں انوار کی اجازت سے یہاں آیا  
 ہوں۔ سمجھیں آپ۔ آپ کے انوار نے مجھ جیسے کہنے انسان پر بھروسہ کر کے کوئی احسان نہیں کیا مجھ  
 پر۔ بلکہ میں آپ کی مدد میں اسے ایک لاکھ روپے دے چکا ہوں۔ تقریباً آج ہی رقم اس نے شمشیر  
 سے وصول کی ہے اور اب وہ آپ کے تیسرے سووے کی فکر میں ہے۔ کھنت ہمیشہ ہی ایڈوانس  
 سووے کرتا ہے۔ چنانچہ اسی وقت آپ کو میرے امکانات پر عمل کرنا ہوگا۔“

تاخیر کے کانوں میں جھٹلا ہوا سیراز ہوا تھا۔ اس کے پورے وجود میں آگ سبک اٹھی  
 تھی۔ اس کی سوانیت خاکستر ہو گئی تھی۔ مجازی خدا کا بت پاش پاش ہو گیا تھا۔ چاروں طرف اس  
 کے کانوں میں سمیٹتے قہقہے ابل رہے تھے۔ اسی طوفانی کیفیت میں وہ اٹھی اور دروازے سے باہر  
 نکل گئی۔ لیکن جس جا کر اس نے سبزی کاٹنے والی لمبی چھری اٹھائی اور باہر نکل آئی۔ لیکن جس انداز  
 سے وہ باہر نکلی تھی۔ اس سے اکبر علی کا ماحول خراب ہوا تھا۔ اور وہ بھی اس کے پیچھے باہر نکل آئے تھے۔ اور  
 جب انہوں نے اس کے ہاتھوں میں چھری دیکھی تو بے اختیار ان کے حلق سے ایک آواز نکل گئی۔

”ہیلو بھائی۔“ اکبر علی نے کہا اور اندر گھس آیا۔ ان کے لباس سے خوشبو نہیں اٹھ رہی تھی  
 وہ دروازے کے پاس سے ہٹ گئی۔

”کیا ہو رہا ہے؟ بھتر مر!“ اکبر علی ڈراٹھک دم کی طرف چلتے ہوئے بولے۔  
 اس نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ انوار کے الفاظ اس کے کانوں میں گونج رہے  
 تھے۔ ”تم بھی ان سے تعداد کرنا کوئی جہالت نہ ہونے پائے۔ میری بات کے اختلاف کے یہ  
 آخری الفاظ ہونے چاہئیں۔“ وہ بکتے کے عالم میں تھی۔ اکبر علی کے ساتھ ساتھ وہ ڈراٹھک دم  
 میں چلی آئی۔ اکبر علی اسے اپنے باپ کا گھر سمجھ کر آرام سے بیٹھ گئے۔

”کھانا تو کھا لیا ہوگا آپ نے؟“  
 ”جی ہاں۔“ اس نے بے شکل کہا۔  
 ”تو پھر تیار ہو جائیں۔“ اکبر علی صاحب بولے۔  
 ”کیا مطلب؟“

”آئیے آپ کو لندن کی اصل دیکھیں اور دکھائیں۔“ فیضان میں گئی ہیں کبھی آپ میرا خیال  
 ہے نہ لگی ہوں گی۔ وہاں کی ایک رات ہی انوار کی ایک بھتی کی آمدنی کے برابر ہوتی ہے۔ آئیے ہم  
 آپ کو وہاں لے چلیں۔“

”وہ کس خوشی میں۔“ اکبر علی صاحب! وہ طعنے انداز میں بولی۔  
 ”آپ کی رفاقت کی خوشی میں۔“ اکبر علی نے اسے بھونکی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”آپ کسی کام سے آئے ہیں اکبر صاحب!“  
 ”ہاں بھئی۔ ہمیں آپ کا دل بھلانے کی ذمہ داری دی گئی ہے تاکہ یہ کیا کریں آپ  
 کے لئے۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ انوار کہاں گئے؟“  
 ”بھروسے۔“  
 ”لیکن گھر سے تو انہوں نے کوئی سامان نہیں لیا۔“  
 ”آپ نے ہمارا فرض کر دیا ہوگا۔“  
 ”لیکن اس طرح.....؟“

”بھئی اس کے بہت سے دوست ہیں دوستوں کی ہر چیز اپنی ہوتی ہے۔ لے گیا ہوگا کچھ

انہوں نے اس طرح باہر جانے والے راستے کی طرف چلا جگ لگائی کہ گرتے گرتے پہنچ گئے۔ کسی نہ کسی طرح وہ دروازے سے باہر نکل گئے۔

فاخرہ نے بھوکی شیرینی کی طرح دروازے تک ان کا پیچھا کیا تھا۔ لیکن وہ دروازے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ اس کے سامنے بدن میں قہر خراہٹ تھی۔ وہ خود کو بھڑیوں کے گھیرے میں محسوس کر رہی تھی۔ تنہا جان اور چاروں طرف بھڑیوں کے قہقہے۔ جن کی صورتیں تو انسانی تھیں لیکن فطرت بھڑیوں کی ہی تھی۔ انہی میں اسے انوار بھی نظر آ رہا تھا۔

دیو ننگ وہ غصے سے لرزتی رہی اور پھر اپنی بے بسی کا خیال آیا تو اس کی آنکھیں برسنے لگیں۔ ایسی بلک بلک کر روئی کہ درد و ہمار پکھل گئے۔ "ہائے ابھی آپ نے باپ ہونے کا حق نہیں نبھایا۔ آپ نے اس بوجھ کو جنم میں جھونک دیا۔ ایسا تو کوئی نہیں کرتا۔ کچھ تو معلوم کرتے ہیں لوگ اس کے بارے میں۔" غصے میں دیتے ہیں۔ یوں تو نہیں پکھل جائے کسی کی شان دیکھ کر۔ اپنی بھی تو ایک آن ہوتی ہے۔ ہائے ابھی۔"

نہ جانے کب تک وہ روئی رہی۔ رونے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو اس نے دوسرے انداز میں سوچا۔ ممکن ہے وہ کبھی صفت انسان جھوٹ بول رہا ہو۔ ممکن ہے اس نے انوار کے خلاف یوں ذہر لگ کر اسے انوار سے باغی کرنا چاہا ہو تاکہ اپنے مذموم ارادوں میں کامیابی حاصل کر سکے۔ اور اس بات کا امکان تو ہے۔ کیا انوار ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا اس کی شخصیت اتنی کمزور ہو سکتی ہے؟ پکھل سے کام لیتا چاہئے۔ انوار کی حقیقت معلوم کرنا چاہئے۔ وہ شوہر ہے اتنا ذلیل تو نہیں ہو سکتا۔ اس خیال سے دل کو کچھ حادس ہوئی تھی۔

ساری رات جاتے گزر گئی۔ دل میں ہنگاموں خیالات تھے۔ بڑبڑوں دوسرے تھے۔ انوار کی شخصیت کے چند روپ سامنے آ چکے تھے۔ گرین تھبے کی وہ رات جس میں اس نے شیرینی پر قبضہ کر رکھی تو وہ نہیں دیکھی تھی اور ایک غیر لڑکی کی ہانپوں میں رہا تھا اور اس نے شراب بھی پی لی تھی۔ اور پھر ۶ بجھا۔ ۱۰ بجھا۔ تو وہ بہت بے تکلف تھا۔ سہاگ رات کی وہ صبح جب اسٹرخا چائے لے کر آئی تھی اور انوار نے اس کا کوئی احساس نہیں کیا تھا۔ یہ باتیں۔ امید کے اس کچے دھماکے کو بھی تو زری تھیں۔ جس کا سرا اس نے ایک منہ بومی آس پر پکڑ کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود۔ اس کے باوجود۔

تین دن گزر گئے اور ان تین دنوں میں وہ خیالات کی سولی پر لگی رہی تھی۔ انوار اگر لندن

میں ہی تھا۔ تو کیا اکبر علی نے اس سے ملاقات نہیں کی ہوگی۔ اسے تفصیل نہیں بتائی ہوگی۔ وہ اس تفصیل کو سن کر یہاں ضرور آتا۔ مجھ سے باز پرس کرنے غصے کا اظہار کرنے خدا کرے یہ سب جھوٹ ہو۔ اس طرح ہی انوار کی آنکھیں مکمل چائیں۔

ان تین دنوں میں اس نے کچھ کھا یا پیا نہیں تھا۔ بھوک اڑ گئی تھی۔ بس جب زیادہ حالت خراب ہونے لگتی تو چائے بنا کر پی لیتی۔ پورے دن صبح پانچ بجے کسی نے تل بجائی۔ اس نے دروازہ کھولا تو انوار کھڑا تھا۔ وہی سوٹ پہنے ہوا تھا۔ جو وہ گھر سے پہن کر گیا تھا، جواب دیا گیا ہو گیا تھا۔ اس کے کاندر سے پر ایک انٹیر لاکن کا بیگ لٹکا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرایا۔

"طیوڑا رنگ یہ کیا حال بنایا ہوا ہے۔ یہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" اس کی مسکراہٹ عکس گئی اس نے بیگ ایک طرف حق دیا۔ فوراً گئے بڑھ کر اس نے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ "فاخرہ ڈارنگ کیا ہوا تمہیں؟" وہ..... خدا کی پناہ کہیں اس دن کا قصہ تو نہیں چل رہا ابھی تک؟"

فاخرہ کا پیچھا چاہتا تھا کہ انوار سے لپٹ کر اتار دے کہ اندھی ہو جائے۔ لیکن اس نے ضبط کیا۔ اگر یہ وہی انسان ہے جس کی تصویر پیش کی گئی ہے تو اس سے زیادہ قابلِ نفرت اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور کسی قابلِ نفرت انسان سے بھی لپٹ کر رو نہ بھی انسان کی تو جین ہے۔ اس لیے اس نے خود کو سنبھالا۔

"کہاں سے آ رہے ہو۔ انوار؟" اس نے سر دلچے میں کہا۔

"تھریں سے۔ کیا تازہ ڈائریکٹریں آ جاتا۔ لیکن کام ختم نہیں ہوا تھا۔ لڑائی بھڑائی اپنی جگہ لیکن تم سے دور رہنے کو کس کا دل چاہتا ہے۔ اور۔" وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر آگے بڑھا۔ "تو جناب! جب تک ہم فصل کریں۔ ہمارے لیے عمو ہی کافی تیار ہو جائے۔ غے کی سرکار؟" اس نے پوچھا۔

"میں لاتی ہوں۔" وہ دستور سر دلچے میں بولی۔

انوار مسکرا ہوا تھا۔ حاصل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن کی طرف جاتے ہوئے وہ بیگ اپنے ساتھ لے گئی تھی اور پھر کافی کیلئے پانی رکھ کر اس نے پھرتی سے بیگ کھولا۔ جیلری کے چند ٹکس۔ ایک خوبصورت سا زمی اور اس انٹیر لاکن کا ایک استعمال شدہ گٹ جس کا یہ بیگ تھا۔

جیلری کے ٹکس اس نے کھول کر نہیں دیکھے۔ بہتی رفتار سے بیگ بند کر کے چلی اور اسے اپنی جگہ رکھ دیا جہاں سے اٹھا یا تھا۔ حاصل خانے سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اور اس کے



تری یادوں کے گھاب

ساتھی انوار کے تنگنا نے کی۔ وہ کس قدر مطمئن ہے۔ اگر اکبر علی سے اس کی ملاقات ہوگئی ہوتی تو وہ اتنا خوش نظر نہ آتا۔ اور پھر یہ کت۔ یہ بیک؟

اس کے کانوں میں چاندی کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ کینٹ اکبر علی نے جھوٹ بولا تھا۔ اپنی مطلب بدآری کے لیے اسے یہ اذیت ناک دھوکا دیا تھا۔ جھوٹ ہو خدا کرے یہ سب جھوٹ ہو۔ اس نے جلدی جلدی کافی بنائی۔ اور فرانی دھکیلتی ہوئی اندر لے آئی۔ انوار تولیہ کے گاؤں میں پلٹا ایک کمری پر بیٹھا ہوا تھا۔

”بہت بہت شکریہ۔“ اس نے دیالی لیجے ہوئے کہا۔ ”پھر اس کے چند گھنٹے لے کر بولا۔  
بھئی بس اب لڑائی ختم ہو جانی چاہئے۔ یوں بھی کسی مسلمان کو تین دن سے زیادہ دل میں کینٹ نہیں رکھنا چاہئے۔“

”آپ کہاں گئے تھے انوار؟“ اس نے پھر وہی سوال کیا۔

”کم از کم یہ بات تمہیں معلوم ہے۔“

”اس بے سرو سامانی کے عالم میں؟“

”ہاں۔۔۔ بعد میں افسوس ہوا۔ رات کے پہنچنے کے پکڑے بھی نہیں تھے۔ میں نے خود سے کہا۔ انوار صاحب تم کو یہ سزا ملنی ہی چاہئے۔ بس میں نے تمہاری طرف سے سزا دے دی۔“  
اس نے کہا اور پھر پیالی رکھ کر دور دکھا ہوا بیک اٹھالیا۔ اسے کھول کر جیولری باکس نکال لیے۔  
”خضرو کی خدمت میں یہ چند چیزیں۔“ اس نے کبکھول دیے۔ بے انتہا غصہ صورت سیٹ تھے جن سے آنکھوں میں چمکا چوند ہو رہی تھی۔ ”بھئی لاخرو اب ٹھیک ہو جاؤ۔ یاد مرہ نہیں آ رہا ہے۔“

”انوار میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتی ہوں۔“ لاخرو نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔  
”اتنی سنجیدگی اور اتنے خضفے لہجے میں کوئی بات نہیں سنوں گا۔“  
”انوار براؤ کم میرے وجود میں کون جن ہو رہی ہے۔ تم اکبر علی سے کیا کہہ کر گئے تھے؟“  
”تمہارے بارے میں؟“

”ہاں۔“

”بھئی میں اس سے کہہ گیا تھا کہ میرے جاننے کے بعد ذرا گھر کا خیال رکھنا۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو فراہم کر دے۔“

”اور۔“

تری یادوں کے گھاب

”بس اور کیا؟“

”اسی رات اکبر علی آیا تھا اور تمہارے دوست نے بڑے عجیب امکشافات کیے۔“ لاخرو نے اسے پوری تفصیل بتادی اور انوار کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

وہ خاموشی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ لاخرو چند ساعت کیلئے حیران رہ گئی۔ پھر وہ خود دوسرے کمرے میں پہنچ گئی۔ انوار کپڑے پہن رہا تھا۔ ”کہاں جا رہے ہو انوار؟“ اس نے پوچھا۔ لیکن انوار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لباس پہن کر اس نے ایک الماری کھولی۔ اور پھر اس خفیہ دراز سے ایک پستول نکال کر اس کا جیسپر بھرنے لگا۔ لاخرو کو یہ بات پہلی بار معلوم ہوئی تھی کہ انوار کے پاس پستول بھی ہے۔ لیکن وہ انوار کی عکسین خاموشی سے غور نہ ہو گئی۔

”میں اس وقت تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی انوار۔“ وہ اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔  
”میں اس کیسے کوڑمہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس نے میری دوستی کا مذاق اڑایا ہے۔ اس نے میرے مذاق کا خون کیا ہے۔“ انوار غرایا۔

”نہیں۔۔۔ انوار تمہیں میری قسم پستول رکھ دو اور لعنت بھیجو اس بد بخت پر۔ تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔ یہی کافی ہے۔ خدا کی قسم انوار مجھے سارے جہان کی دولت مل گئی۔ مجھے کسی سے انتقام نہیں لینا۔ میں نے اپنی حفاظت کی ہے۔ خدا نے میری حفاظت کی ہے۔ بس میں اور کچھ نہیں چاہئے۔ ہم غیر ملک میں ہیں۔ یہاں تمہارے علاوہ میرا کون ہے۔ خدا غواست۔ خدا غواست۔ تمہیں کچھ ہو گیا۔“

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا لاخرو کہ وہ میری شخصیت کو اس طرح مسخ کرنے کی کوشش کرے گا۔“

”جانے دو اس کینٹ بزدل کو۔ میرے ہاتھ میں چھری دیکھ کر ہی وہ اس خراب ہو گئے تھے اس کے۔“ اس نے انوار کے ہاتھ سے پستول لے کر رکھ دیا۔ اسے اس کمرے سے نکال لائی۔ اس کے سارے وجود پر سرت بھری کپکپاہٹ طاری تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کے قبا بے سہارا بدن کو کسی مضبوط ستون کا سہارا مل گیا ہو۔ ہاں شوہر سے زیادہ مضبوط ستون اور کون سا ہو سکتا ہے۔

بڑی مشکل سے اس نے انوار کا غصہ ضبط کیا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ انوار نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ اپنے سارے دوستوں کو چھوڑ دے گا۔ اب ان سے کوئی رابطہ نہیں رکھے گا۔ اور وہ نہال





تری یادوں کے گلاب

”کیا یہ پاگل خانہ ہے؟ کیا اسے پاگل سریناؤں کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ لیکن کیوں؟ کیوں؟ اور گزرے ہوئے واقعات پر غور کرنے لگی۔ اور اس کے چہرے کی سراسیمگی بڑھتی گئی۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور دو سیاہ فام اندر گھس آئے۔ یہ افریقی تھے۔ انہیں دیکھ کر لڑکیاں پھر کائی کی طرح جھٹ گئیں۔

”بہت شور ہو رہا ہے۔ کیا بات ہے؟“ سیاہ فاموں میں سے ایک نے کمرے کے دروازے پر کھٹکی دیا۔ سب چپ چپ گئیں۔ ”اب کوئی آواز نہ ابھرے سمجھیں تم لوگ۔“ اسی سیاہ فام نے کہا۔ اور پھر دونوں ان لڑکیوں کو گھورتے ہوئے باہر نکل گئے۔

فاخرہ اس پورے ماحول کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے اندازہ ہوتا جا رہا تھا کہ یہ ترقی پزیر ملک ہے اور نہ ہی ہسپتال۔ کوئی اور ہی بات ہے۔ گزرے ہوئے واقعات اس کے ذہن کے پردوں پر دھبے رہے تھے۔ اور اس کا دل سینے میں پڑ پڑ رہا تھا۔

لڑکیاں بد دل سی ہو گئیں تھیں۔ ان میں سے بعض اپنے بستروں پر لیٹ گئیں اور بعض کتا ہیں اور رسائل دیکھنے لگیں۔ وہ ان سب کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کی نگاہ اپنے بائیس بست پر پڑی۔ گیارہ نمبر بیڈ پر ایک لڑکی سو رہی تھی۔ یہ شہزادہ فیض میں تھی۔ اور چہرے سے پاکستان یا ہندوستان کی باشندہ لگ رہی تھی۔ یہی ایک نکل اسے کسی قدر شناسا محسوس ہوئی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ سیاہ فاموں کے آنے کے بعد لڑکیاں بالکل خاموش ہو گئیں تھیں۔

کافی وقت گزر چکا تھا۔ شہزادہ فیض والی لڑکی جاگ گئی۔ اس نے بستر پر پڑے پڑے آنکھ لائی۔ یہ دیکھی اس کی نگاہ بھی فاخرہ کی طرف اٹھ گئی۔ وہ چند لمحوں کے لیے فاخرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے گھورتی رہی۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ”ہیلو“ اس نے فاخرہ سے کہا۔

فاخرہ شگ ہوئی پڑ زبان پھیر کر رہ گئی۔ لڑکی اٹھ کر اس کے بستر پر آ گئی۔ نزدیک سے وہ بہت خوبصورت نظر آئی تھی۔ چہرے کا میک اپ بگڑ چکا تھا۔ اس کے باوجود اچھے اچھے بالوں کے پیچاس کی دلکشی نہیں چھٹی تھی۔

”تم اردو اور انگریز دو؟“ لڑکی نے پوچھا۔ فاخرہ نے گردن ہلادی۔ ”پاکستانی ہو؟“ اس بار لڑکی نے اردو میں پوچھا۔

”ہاں۔“ فاخرہ کے سینے میں سے ایک گہری سانس نکل گئی۔ پاکستان کا نام اس کے سینے میں جھپک رہا تھا۔

تری یادوں کے گلاب

”شاید رات کو آئی ہو۔ جب اس رات کو تین بجے کے قریب آئی تھی۔ تو میں نے تمہیں سوتے ہوئے دیکھا تھا۔“

”تھ۔۔۔ تو کیا صبح ہو چکی ہے؟“ فاخرہ نے حیرانی سے پوچھا۔ اس نے وارڈ میں جھک کاتی روشنیوں کو حیرت سے دیکھا اور لڑکی مسکرائے لگی۔

”ہاں۔۔۔ صبح ہو چکی ہے۔ یہاں کا ماحول انسان کے فٹھے میں ہے۔ روشنیاں بند کر دو۔ رات ہو جاتی ہے۔ روشنیاں جلا دو صبح ہو جاتی ہے۔ میرے منہ کا حڑ بے حد غراب ہو رہا ہے۔ ذرا ہاتھ روم ہواؤں۔ اس کے بعد باتیں کریں گے۔“ لڑکی نے کہا اور اس کے پاس سے اٹھ کر ایک سمت چل پڑی اور پھر ایک دروازہ کھول کر غائب ہو گئی۔

صبح ہو گئی ہے۔ گویا میں پوری رات بے ہوش رہی ہوں۔ لیکن الوار۔ اس کے حلق سے سسکی نکلی۔ دل بڑی طرح بھرا آیا تھا۔ پھٹ پڑنے کے لیے بے چین تھا۔ لیکن یہاں کون تھا۔ آنسو بھی کسی دھڑکے سا سانسے نکلتے ہیں۔ تنہائی کا رونا بھی کوئی رونا ہے۔ وہ روئی تو یہ بیدار لڑکیاں سننے لگیں گی۔

شہزادہ فیض والی لڑکی تھوڑی دیر کے بعد واپس آ گئی اور اس نے فاخرہ سے کہا۔ ”جاؤ ہاتھ روم جو آؤ۔“ بال سنوار دیا کیا حالت بنا رہی ہے۔ جاؤ۔۔۔ ابھی ناشتا آنے والا ہے۔ ساتھ ہی ناشتا کریں گے۔“

وہ اٹھ گئی۔ دروازے کی جانب کئی ہاتھ روڑھ ایک قطار میں بٹے ہوئے تھے۔ شیشے کی طرح بے شمار اور شفاف یہاں پر حفظان صحت کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ بال سنوارے اور پھر باہر نکل گئی۔ اس دوران دوسری لڑکی نے اپنا اور اس کا بستر درست کر لیا تھا۔

”بیٹھو۔۔۔ وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”فاخرہ۔“

”مجھے کوثر کہتے ہیں سناؤ کوئی درد بھری کہانی۔ تم ان لڑکیوں کو دیکھ رہی ہو۔ ان کے سینوں میں ایک ایک کہانی پوشیدہ ہے۔ لیکن انہوں نے کہا نیاں دل کی گھبراہٹوں میں دفن کر لی ہیں۔ کبھی کبھی یہ کہانیاں ابھرتی ہیں۔ تو ان کی حالت قابل دیدہ ہوتی ہے۔ ہاں ایسا کبھی بھی ہوتا ہے۔ یہ مختلف نسلوں اور مختلف ملکوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ لیکن سبھی لی کہانیوں میں یکسانیت ہے۔“ کوثر نے ایک شہابی سانس بھری۔ ”تم پچھلی رات میں

”ہاں۔“ اس نے گردن ہلادی۔

”کون لایا جہیں یہاں؟ پاکستان سے کیسے آئیں؟“

”انوار۔ میرا شوہر۔“ اس نے سسکتے ہوئے کہا اور کونڑا جھل پڑی اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں جنون نظر آنے لگا۔ درجہ وہ مختلف کیفیات کا شکار رہی۔ پھر اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

”اب تم اپنی کہانی تم سے سن لو۔ پاکستان کے کسی غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہوگی۔ والدین اپنا اوقات سے کہیں اونچے گھرانے میں تمہاری شادی کے خواہش مند ہوں گے۔ چھوٹے سونے رشتے ان کی نگاہوں کو نہ بھاتے ہوں گے۔ پھر انہیں پتہ چلا کہ ایک لڑکا لندن میں رہتا ہے۔ عمدہ کا دربار ہے۔ اور وہ فوری شادی کر کے لندن واپس جانا چاہتا ہے اور تمہارے والدین نے لندن کا باہم سن کر آنکھیں بند کر لی ہوں گی۔ تم نے کہا ہوگا پناہ دیکس نہیں چھوڑنا چاہتی ہوں۔ تب تمہارے والدین نے کہا ہوگا کہ وہ تمہارے وطن تھوڑا سی ہیں۔ تم لندن میں جا کر دراج کرو گی۔

لڑکیاں تو اس شہر بے مثال کے خواب دیکھتی ہیں۔ تمہاری شادی ہو گئی ہوگی اور پھر تمہارے شوہر نے جنہیں لندن بلا لیا ہوگا۔ ابتدائی کچھ ماہ بڑے میٹھ و عشرت میں گزرے ہوں گے۔ اور اس کے بعد شیطان بے نقاب ہو گیا ہوگا۔ اس نے جنہیں داریہ معاش بنانے کی کوشش کی ہوگی اور تم نے شدید مخالفت کی ہوگی جس کے نتیجے میں تم یہاں موجود ہو۔“

فاخرہ کا منہ حیرت سے ہلکا ہوا رہا۔ وہ ہانگوں کی طرح کونڑا کود بکھیتی رہی۔ پھر اس کے مطلق سے پریشانی آواز آئی۔ ”جہیں یہ سب کچھ کہے معلوم ہوا؟“

”میں نے کہا ہاں کہ یہاں سب کی کہانیاں یکساں ہوتی ہیں۔ میں نے جنہیں اپنی کہانی سنائی ہے۔ اور تم سے میرا ایک رشتہ اور بھی ہے فاخرہ۔ میں بھی انوار کی بیوی ہوں میرا تعلق لاہور سے ہے۔“

”کونڑا..... فاخرہ کے ذہن میں ایک چمکا کا ہوا۔ ہاں ایک بار نشے کے عالم میں انوار نے کونڑا نام پکارا تھا۔“

”قصود انوار کا بھی نہیں تھا۔ قصود ہمارے والدین کا ہے۔ ہم لڑکیاں ان کے اشارے پر

بکھیتی ہیں۔ ہم ان کی عزت و ناموس کی حفاظت کرتی ہیں۔ پھر وہ ہماری ذمہ داری کیوں قبول نہیں کرتے۔ والدین کو اپنے معیار کا خیال رکھنا چاہئے۔ وہ اتنے بلند پرواز کیوں ہو جاتے ہیں۔ فیک ہے معاشرے میں کچھ خرابیاں جنہیں لیکن انوار نے حد چالاک ہے۔ اس نے ان کے خط تم تک نہیں پہنچنے دیے ہوں گے۔ نہ تمہارے خط ان تک گئے ہوں گے۔ ہاں اس نے دونوں کو ایک دوسرے کے خطوط سے محروم رکھا ہوگا۔ لیکن یہ خط اس کی تحریر میں ہے اور اس کی پسند کے ہوں گے۔“

”کونڑا.....“ فاخرہ رونے لگی۔ ”اب کیا ہوگا کونڑا؟“

”کچھ نہیں بی بی..... کچھ بھی نہیں۔ ان ساری لڑکیوں کی طرح قہقہے لگانے ہوں گے۔ ماحول کو بھول جانا ہوگا۔ اپنی کہانی سننے کی قبر میں دفن کرنا ہوگی۔ نت نئے گاؤں کا دل بھلا نا ہوگا۔ صرف ایک راستہ اور ہے۔ دل چاہے تو خود کشی کر لو۔ اس کے علاوہ کوئی اور ترکیب نہیں ہے۔ یا پھر ان سے انتقام لو جنہوں نے جنہیں اس جہنم میں بھونکا ہے۔ انتقام کرو کہ کسی دن تمہارا بھائی یا کوئی عزیز تمہارے پاس گا جیک کی حیثیت سے آئے اور تم سارے ہاڑ دھوئے لٹا کر اس کا استقبال کرو۔ اور اس سے کہو کہ وہ پاکستان جا کر تمہارے والدین کو تمہاری خبریت بتا دے۔ ان سے کہے کہ تم بڑے سکون اور اطمینان سے لندن میں ہو۔“ کونڑا زہر پینے لگا اور میں بول رہی تھی۔

”میں خود بھی فاخرہ میں خود بھی اسی انتقام میں ہوں اور شاید اور یہ دوسری لڑکیاں بھی اسے دیکھو۔ وہ منداوتی ہے۔ ایک کھل لڑکی وہ وہ سلوٹیا ہے اندر ویشیا سے تعلق رکھتی ہے۔ سب کی کہانیاں کسی نہ کسی طور ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں۔ بہت معمولی سا فرق ہے۔ تم جن لوگوں کے درمیان ہو۔ وہ بہت سفاک اور ذہین ہیں ہم جیسی لڑکیوں کو کنٹرول کرنا جانتے ہیں۔ اگر ہم بھاد کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں تیزاب سے جلا دیا جاتا ہے۔ گڑھے کھود کر اس میں زندہ دفن کر دیا جاتا ہے۔

یہاں سے پھر اگر کسی طوطا منگن نہیں ہے بہت جلد جنہیں ان باتوں سے آگاہ کر دیا جائے گا۔“ کونڑا نے درست ہی کہا تھا۔ ایک ہفتے کے تریخی گورس میں فاخرہ کو ان تمام امور سے آگاہ کر دیا گیا۔ اسے یقین دلایا گیا کہ اگر وہ ایک بہترین سوت چاہتی ہے تو دوسری بات ہے۔ ورنہ اسے ان کے اشاروں پر چلنا ہوگا۔ اب وہ انوار کو بھول جائے۔ انوار اس کی قیمت سے منافع وصول



تری یادوں کے گلاب

کر چکا ہے۔ اور شاید سنے شکار کی تلاش میں پاکستان چلا گیا ہے۔

میڈم کیرولین کی خوبصورت رہائش گاہ کے انتہائی حسین کمرے میں فاخرہ نے جس پہلے گاہک کا استقبال کیا۔ وہ بھی ایک پاکستانی تھا۔ لندن کی مسموم فضاؤں میں حصول تعلیم یا نوکری کیلئے آنے والا نوجوان پاکستانی جو ایک بھاری رقم لہا کر کے لندن کے قیام کو باہر لے جانے آیا تھا۔ تا کہ وطن واپس جا کر اپنے دوستوں کو کھانا لیاں سنائے۔ اس نے مادام سے کسی پاکستانی لڑکی کی فرمائش کی تھی۔

لیکن فاخرہ کے سامنے آکر اس پر سخت طاری ہو گیا۔ وہ جگہ جگہ کروڑ اور فاخرہ حیران ہو گئی۔ پیشکش تمام وہ چپ ہوا۔ فاخرہ نے اس سے رونے کی وجہ پوچھی۔

”قدرت مجھے یقین دلانا چاہتی تھی کہ تم میری بہن ہو۔ تم میری بہن صوفیہ کی جھلک ہو۔ میرا نام احسان ہے۔ میری بہن مرگئی ہے۔“

فاخرہ متاثر ہو گئی تھی۔ احسان نے اسے بہن بتالیا۔ فاخرہ نے اسے اپنی کہانی سنائی تو اس نے کہا۔

”تم بے فکر ہو۔ میں یہاں ملازمت کرتا ہوں۔ بہت کمائی کی ہے میں نے، یہ سب کچھ میں اپنی بہن کی عزت کیلئے لے دوں گا۔ میں تمہیں یہاں سے نکال لوں گا۔ میں روزانہ تمہارے پاس آؤں گا۔ اور پھر ایک دن..... لیکن ہمیں چالاک سے کام کرنا ہے۔ ہم ان لوگوں کے وطن میں ہیں۔ ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن بہر حال تم فکر مند نہ رہو۔“

کافی دیر کے بعد احسان چلا گیا لیکن اس نے اپنا قول نبھایا تھا۔ میڈم سے اس نے گھر سے سراسیمہ کر لیے۔ اس نے میڈم کو بھاری رقم لہا کر لی۔ اور اسے بتایا کہ یہ لڑکی اسے بہت پسند آتی ہے۔ اس لیے یہ اس کیلئے ریزرو کر لی جائے۔ اس نے درحقیقت اپنی ساری کمائی لے لی۔ اس دوران وہ ضروری تیاریوں میں مصروف رہا۔ اس نے ایک چھوٹے سے کمرے سے فاخرہ کی تصویریں اتاریں۔ پھر بھاری رقم خرچ کر کے جعلی نام سے اس کا پاسپورٹ بنوایا۔ اور آخری پروگرام کے تحت ایک شام میڈم کے پاس پہنچ گیا۔ ایک آوارہ رہنمائی کے ذریعے کی حیثیت سے۔ اس نے میڈم سے فرمائش کر کہ وہ لڑکی کو باہر لے جانا چاہتا ہے اور وہ محکمہ پھر کر واپس آ جائیں گے۔ چونکہ اس نے میڈم پر دولت خرچ کی تھی۔ وہ اسے کوئی نواب یا بہت بڑا رئیس سمجھنے لگی تھی۔ اس لیے میڈم نے اس کی بات نہ مانی۔ ہاں اس نے تمام احتیاطی تدابیر اختیار کر لی

تری یادوں کے گلاب

تھی۔ اور احسان اس کیلئے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ اس لیے اس نے اپنی نوکری اپنا مستحق سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ اور اسے لے کر باہر نکل آیا۔ تھوڑی دیر تک وہ ادھر ادھر گھومتا رہا۔ اور پھر ضرورت پر انٹرپورٹ پہنچ گیا۔

پہلی آئی اسے کی پرواز پاکستان کیلئے چل پڑی تھی۔ ایک زندہ لاش اس میں سفر کر رہی تھی۔ ایک داستان عبرت اپنے وجود پر کندہ کیے وہ حالات کے ہاتھوں لٹ گئی تھی لیکن ممکن ہے اس کی کہانی بہت سے لوگوں کیلئے داستان عبرت ہو۔ ان والدین کیلئے بھی جو چھان بین کیے بغیر صرف چند جھوٹے خوابوں میں گم ہو کر اپنی مصوم بچیوں کو اپنی مجبوری کی جینٹ جڑھا رہے ہیں۔

☆.....☆.....☆

ساتھ کر دی۔ دوسری بیٹی نعمانہ کو اس کے ماموں نے اپنے بیٹے کے لئے مانگا تو اس شرط کے ساتھ وہ بھی بیاہی گئیں کہ رضوان کو رخصت ہو کر اس کو بھی میں آنا پڑے گا۔

سب سے چھوٹی بیٹی فرحانہ کیلئے انہیں بڑی پریشانی اٹھانی پڑی۔ وہ اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ جو ادھر صرف خاندان سے باہر کا تھا بلکہ برادری بھی بالکل الگ تھی جبکہ شہباز صاحب کا اپنی کسی اولاد کو برادری سے باہر بیاہنے کا قلعی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اب تک چاروں اولادوں کی شادیاں کئے لیکن بھائیوں کے گھروں میں کی تھیں۔

فرحانہ ان کی بے حد لڑائی اولاد تھی اور لڑائی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت خود مر بھی تھی۔ بچپن سے آج تک اس نے اپنے ہر معاملے میں اپنی سن مانی کی تھی۔ ان کی خواہش کے برعکس اس نے انجینئرنگ پڑھی تھی۔ اپنے کلاس فیلو جو اد کو ان کے سامنے لاکھڑا کیا تھا۔ جو نہ خاندان میں ان کا ہم پلہ تھا نہ امداد میں اور نہ گھر و اماں بننے پر چار تھا۔ مگر پھر بھی بیٹی کی محبت سے مجبور ہو کر انہیں اس کی شادی کرنا پڑی۔ وہ رخصت ہو کر سسرال تو گئی۔ مگر سال کے اندر ہی جو اد کو مرضی کر کے واپس اپنے پورتن میں آ کر بس گئی۔ جو اد چوری کے مجبور کرنے پر آ تو کیا تھا مگر آکھڑا آکھڑا سنا رہتا تھا۔ سب کے ساتھ مکمل مل نہیں پایا۔ مگر شہباز گیلیانی کی دلی آرزو پوری ہو گئی تھی کہ ان کی ساری اولاد اس گھر میں رہے اور ان کی لڑائی بیٹی ان کی نظروں کے سامنے تھی۔ اس ہی لئے یہ بات ان کے لئے باعث اطمینان تھی۔ مگر دل میں ایک غلط سی رہتی تھی کہ فرحانہ کی خاطر ان کو اپنے اسٹینڈرڈ سے مگر کر ایک چھوٹے خاندان سے رشتہ کرنا پڑا تھا۔

سب لوگ بڑی محبت سے مل کر رہتے تھے اور رشتوں کو مزید مضبوطی دینے کیلئے شہباز گیلیانی عرفانہ کے بڑے بیٹے عمار کا نکاح عمران کی بیٹی نازش سے ان کے لڑکپن میں ہی کر دیا تھا۔ ”بچپن میں کئے جانے والے اس نکاح کی فرحانہ نے بہت مخالفت کی تھی۔ والد صاحب اس کی ہر بات اسنے تھے۔ مگر اس سلسلے میں انہوں نے فرحانہ کی ایک نکتہ تھی۔ بلکہ اس پر واضح کر دیا تھا کہ یہ ناکامی انہوں نے کیا ہی اس لئے ہے کہ پھر کوئی اور خاندان سے باہر شادی کرنے اور اس باپ کی محبت سے بے جا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔

”بابا کا بس چلے تو پالے میں پڑے بچوں اور آنے والی رگوں کا ابھی ہے نکاح پڑھاؤں۔“

فرحانہ، ماں، اور بہن بھائیوں کے سامنے یہ بڑی رہتی مگر باپ کو اس کے ارادے سے باز

## ہمیں اپنا نہیں..... غم تمہارا ہے

مسافر تو چمکتے ہیں رفاقت کب بدلتی ہے  
محبت زندہ رہتی ہے محبت کب بدلتی ہے  
پرانے رزم کو ارشد بھلا دینا ہی اچھا ہے  
اگر چاہے نہ خود کوئی تو قسمت کب بدلتی ہے  
ارشد ملک

کوٹھی کے لان کی طرف بڑھتے ہوئے عمار نے عمران ماموں کی چٹلی کو ڈھونڈا۔ وہ سامنے ہی نظر آ گئے۔ مگر بہت سے مہمانوں میں گھرے ہوئے۔ عمار نے ذرا ہلکا کر جاؤڑ لیا۔ وہاں اس کے لئے کوئی نشست خالی نہیں تھی۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ بہت مہمان آچکے تھے۔ ان میں بہت سے شاسا چرے تھے۔ وہ فردا فردا ہر ایک سے ملنے لگا۔ یہ تقریب دیمہ کے بیٹے کے حقیقی کے سلسلے میں تھی اور وہ ایک طویل عرصے کے بعد خاندان کے دیگر افراد سے مل رہا تھا۔

اس جہازی سائز کی کوٹھی میں ان سب کا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا۔ شہباز گیلیانی نے اپنی پانچ اولادوں کو ایک ہی جگہ بسانے کے لئے یہ شاندار کوٹھی بنوائی تھی۔ باہر سے ایک محل بھی نظر آنے والی یہ عمارت اندر ہی اندر چھ حصوں پر مشتمل تھی۔ دو بڑے بیٹے عمران اور عرفان کے بعد تین بیٹیاں تھیں۔ سب سے پہلے بڑی بیٹی عرفانہ بیاہی گئیں۔ جسے شہباز صاحب نے اپنے بچپنے کے ساتھ بیاہا تھا اور شرط یہ تھی کہ عمار گیلیانی اپنا گھر مجبوراً اس کوٹھی کے ایک پورتن میں آ کر رہیں گے۔ اس کے بعد دونوں بیٹوں عمران گیلیانی اور عرفانہ گیلیانی کی شادیاں اپنی دو بھانجیوں کے



رکھے میں نہیں روک سکی تھی۔

بارہ سالہ حماد اور پانچ سالہ نازش اس وقت نکاح کے بندھن میں باندھ دیئے گئے جب وہ ابھی اس کا مطلب بھی نہیں جانتے تھے۔ اس نکاح کی تقریب کے چند دنوں بعد ہی گیلانی صاحبہ بالکل اچانک حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ ان کی گدڑی نازلی گیلانی نے سنبھالی۔ ان کے دونوں بیٹے، بہو ہیں، تینوں بیٹیاں اور داماد ہی طرح فرما میراداری اور تاجدار کی سے ان کے گھر بیٹھنے پر سر جھکاتے رہے۔ مگر گیلانی صاحب کی طرح پھر وہ کسی رشتے کو بچپن ہی میں نکاح کے بندھن میں نہ باندھ سکیں۔ ان کی گھٹی اولاد نے ان سے تعاون نہیں کیا تھا۔ حالانکہ ان کے احترام میں کسی نے کوئی کی نہ کی تھی۔ مگر اپنی اپنی اولادوں کے حقوق کے لئے سب نے ہی آواز بلند کی تھی۔

نازلی دیکھ جہاں مدیہ خاتون تھیں اور شہباز گیلانی کی بہ نسبت زیادہ روشن خیال اور زمان شناس تھیں۔ اپنے بچوں کا یہ حق انہوں نے فراہم کرنے سے تسلیم کر لیا تھا اور ان سب کو اپنی اولادوں کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا مکمل حق دے دیا تھا۔

گھر کا ماحول بھی خاصہ آزادانہ ہو چکا تھا۔ سب بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لڑکیوں نے گلوب اداروں میں پڑھا اور اپنی حدود میں رہتے ہوئے ہر طرح کی انجینئرنگ میں حصہ بھی لیا۔

سب سے پہلے حماد ماسٹرز کرنے امریکہ چلا گیا۔ عمران گیلانی کے دونوں بیٹے محمد اور شاہ زیب لندن میں میڈیکل پڑھ رہے تھے۔ مگر نازش کو انہوں نے کراچی میں ہی میڈیکل کالج میں داخل کر دیا تھا۔ البتہ یہ وعدہ تھا کہ وہ اسپیشلائزیشن کے لئے اسے بھائیوں کے پاس لندن بھیج دیں گے۔ عمران گیلانی کے اکلوتے بیٹے راجیل نے انجینئرنگ کی تعلیم میں جھٹکے چار کھانے جس کے ساتھ نعمانہ کے بیٹے ریزہ نے بھی ای سی انڈر سٹی میں دھوم مچا دی تھی۔ فرق بڑا واضح تھا۔ راجیل نے اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑے تھے، وہ ایک غیر معمولی ذہین ترین شاگرد تھا۔ اور ریزہ اسٹوڈنٹ لیڈر۔ یونین کا صدر بن کر تقریریں مجاز کر میدیں اور چکا تھا۔ ریزہ سے چھوٹے عمر نے ایئر فورس جوائن کر لی تھی۔ شوق شہادت اور جذبہ وطنی اسے کسی دھمکی، کسی خوشامد سے باز نہ رکھ سکا تھا۔ مگر میں کوئی بھی اس کے فورسز جوائن کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ مگر اس نے ناں

کی بھی نہیں سنی تھی۔

پھر جب وہ ہر امتحان میں کامیاب ہوتا چلا گیا اور کیشن مل گیا تو نعمانہ نے بھی یہ سوچ کر مبرا کر لیا کہ اللہ کی رضا اسی میں ہے۔ ماہ نور اپنے بھائی حماد سے بہت چھوٹی تھی اور اس کی بے حد ذہنی بین تھی۔ نازش اس کی ہم عمر تھی۔ انٹرک دونوں نے ایک ہی سکول اور کالج میں پڑھا تھا۔ بہت گہری دوستی تھی۔

فرمان کی دونوں بیٹیاں رشتہ اور مکان ابھی سکول میں پڑھ رہی تھیں۔ حماد چار سال بعد انیس سے لوٹا تھا۔ نازلی گیلانی نے اس کی کامیابی کی خوشی میں ایک بڑی تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ خوشی کا وسیع و عریض لائن مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ زیادہ تر مہمان آپکے تھے۔ تاہم حماد کو جس کا انتظار تھا وہ اب تک نہیں آئی تھی، اس نے پھر گزری دیکھی۔

"اسے اب تک آ جانا چاہئے تھا۔ وہ تو وقت کی بہت پابند ہے۔" اس نے سر جھٹک کر ایک بار پھر گیٹ سے باہر سرک پر وہ بارہ نظر دوڑائی، ریزہ اس کی چٹائی بھانپ گیا تھا، حماد کو وہ بار بار گزری دیکھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اب زبان میں کھلی ہوئی۔

"کیا کوئی خاص مہمان آنے والا ہے؟"

"آں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہاں۔۔۔" حماد گڑبڑا گیا۔

"ایک بات پر قائم رہو بھائی۔ ہاں یا ناں۔۔۔" وہ شرع ہوا۔

"ہاں" حماد بڑی دقت سے مسکرایا۔

"مہمان آنے والا ہے۔ یا آنے والی ہے؟" اس نے عادت کے مطابق پھر پچھڑا۔

"دیکھ لینا بارجلدی کیا ہے۔" حماد اسے جواب دے کر فوراً ہی آگے بڑھ گیا۔

اس کا مہمان آ گیا تھا اور جب وہ اسے ساتھ لے کر پلٹا تو اس خاص مہمان کو دیکھ کر ایک پلٹ کو ریزہ بھی گنگ رہ گیا تھا۔

وہ تھی ہی اتنی دلکش اور پک کشش لیکن جس بات نے ریزہ کو کھٹکے میں ڈالا تھا۔ وہ اس کا حماد نے بازو میں ساتھ ڈال کر پلٹ چاہا اور حماد اس کے لئے یہ قرار ہوا تھا۔

ادوں کے انداز بکھواری کہانی سنا رہے تھے۔ حماد نے ریزہ سے اس کا تعارف کرایا۔

وہ میس تھی۔۔۔۔۔ حماد کی اس فیلوری تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کے ملک کی سیر کیلئے آئی تھی اور کسی جیسٹ ہاؤس میں ٹھہری تھی۔ آج حماد نے اسے اپنی پوری فحش سے ملوانے کے لئے بلایا تھا۔

سے اس کی کرسی پکڑ کر جھٹک گیا۔

”ماہ نور تم نے میری مہمان کا خیال نہیں رکھا۔“ دوسری سانس میں اس نے ماہ نور کو نوازا،  
وہ سے کو جاکر گرم گرم اسٹیکس میلہ کی پلیٹ میں رکھیں اور قریب سے کرسی اٹھا کر اس کے پاس  
لو کر بیٹھ گیا۔ نازش کو اس نے نرمی طرح نظر انداز کیا تھا۔

نازش جو پہلے ہی میلہ کے پروگرام سن کر اندر سے ڈری ہوئی تھی۔ عدا کے روئے کو شدت  
سے محسوس کر رہی تھی۔ پہلی دفعہ نظر اٹھا کر اس نے بغور عدا کا جائزہ لیتا شروع کیا۔ مگر وہ میلہ میں  
اس دبیج کو جھٹکا کہ اسے اپنے اطراف بیٹھے ہوئے لوگوں کا ہوش ہی نہیں تھا۔ اس کے ہر ہر انداز  
میں اس قدر وارفتگی جھلک رہی تھی۔ آنکھوں میں ایسی والہانہ چمک تھی کہ سارے راز کھول دے  
ہی تھی۔ خود بخود نازش کو ایک عجیب حقیقت کا ادراک ہوتا چلا گیا۔ اس کو شدت کی پیمائش تھی اور اس  
کے مطلق میں کانٹے جیسے تھے۔ وہ معذرت کر کے اپنی جگہ سے اٹھی اور پھر پلیٹ کر واپس نہ آئی۔

میلہ کے چلے جانے کے بعد ماہ نور اسے دھو مٹاتی ہوئی اس کو شے میں بیچتی جہاں وہ پہلے  
ایک کھینے سے بیٹھی ہوئی تھی۔

”تم کہاں مر گئی تھیں؟“ آتے ہی اس نے نازش کے ایک ہاتھ رسید کیا پھر دھپ سے اس  
کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کیسی کھینے اس میں ایسی بطور کی بھانگی کے پاس چھوڑ دیا۔ پچھلے پیر پر حاصل تجربہ کر کے  
میرا بھی خالی ہو گیا۔“

نازش کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”ہنسوت بد تمیز۔“ وہ تپ گئی۔

”تو کیا روکس تمہاری طرح؟“ نازش نے ہنسنے لگی۔

”تم پاس ہو تھیں تو میرا یہ حال نہ ہوتا۔ تو اب اگر بڑی بوتلے بوتلے میری زبان میز می  
دیتی۔“ وہ سخت حیرت میں تھی۔

”ضرورت کیا تھی۔ اس کے ساتھ امریکی انداز میں بن کر بوتلے کی۔ اس نے جھک  
میں اور ابھی اپنے دیسی انداز میں انگریزی بولتیں اسے سمجھ میں تو آ ہی جاتا۔“ نازش نے اپنے  
اہ کو پرسکون نگاہ کرنے کی کوشش کی۔

”آف۔ لگا ہے ہم سے زیادہ اسے ہمارے ملک سے مشتاق ہے۔“

”وہ کس مقصد سے آئی تھی؟ عدا کا کیا ارادہ تھا؟“ رمیز کے دل میں اندیشوں نے سر  
ابھارا۔ مگر اس نے فوراً ہی اپنا سر جھٹک کر اپنے اندیشوں کی نقلی کی۔

”عدا تو پہلے ہی انگلیز ہے میلہ کو بھی پتا ہو گا۔ ایسی دوستیاں تو ہی ہی جاتی ہیں۔“

مہمانوں کو سیر کرنے کے لئے وہ اکیلا ہی رہ گیا۔ عدا تو میلہ کو لٹکر فوراً ہی اندر چلا گیا تھا۔  
جیسے اب کسی اور مہمان سے اسے کوئی دلچسپی نہ رہی ہو جبکہ اس تقریب کا میزبان وہی تھا۔ عدا نے  
سب سے پہلے میلہ کو نازش کی گیلانی سے ملوایا۔ اپنے والدین سے متعارف کرانے کے بعد وہ اسے  
لے کر ماہ نور اور نازش کے پاس چلا آیا۔

”ماہ نور ایہ میری مہمان ہے۔ ان کا خاص خیال رکھنا۔“ وہ ماہ نور کو ہدایت کر کے نازش کی  
طرف دیکھے بغیر وہ اپنے دوسرے دوستوں کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں نے میلہ کو بڑی اچھی کہنی  
دی وہ بھی ان سے کل کر بہت خوش ہوئی۔ نازش صدمہ سے وہ بہت مرعوب ہوئی تھی۔ عدا اسے  
بڑے خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ یہاں اس کی یہاں آ کر پتہ چلا تھا۔

میلہ سیر و سیاحت کی ذمہ دار تھی۔ وہ یہاں کے مثالی علاقہ جات کی سیر کرنے آئی تھی۔ جو  
قدرتی حسن کا شاہکار تھے۔

”کیا ختم کیلی جاؤ گی؟“ ماہ نور کے پوچھنے پر وہ بڑی دلکشی سے مسکرائی۔

”نہیں۔۔۔ عدا ساتھ ہو گا۔“

اس اعلان پر نازش نے بے ساختہ ماہ نور کی طرف دیکھا۔ وہ بھی متحجب ہوئی تھی قہر کیلئے  
پوچھ لیا۔

”کیا کسی ٹورسٹ پارٹی کے ساتھ جاؤ گے؟“

”نہیں بس ہم دونوں ہوں گے۔“ وہ جیسے غواہوں میں سخر پر ٹھک گئی۔

”اودہ میں کتنی سے چینی سے انتظار کر رہی ہوں۔ اس وقت کا جب میں عدا کے ساتھ ان  
میسین وادوں میں ازنی چھڑوں گی، کسی تیلی کی طرح۔“

ماہ نور کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ اور نازش کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔

کھانا سرو کر دیا گیا۔ وہ تینوں اپنی پلیٹوں میں کھانا لے کر واپس اپنی نشستوں پر آ کر بیٹھ گئی  
تھیں۔ میلہ اب ان دونوں کی مصروفیات اور دلچسپیاں کھنچ رہی تھی۔

”میلہ تم تو تکلف کر رہی ہو۔ تمہاری پلیٹ میں یہ کیا ہے۔ صرف سلاوا۔“ عدا آ کر پیچھے



”اے ہمارے ملک سے نہیں۔ تمہارے بھائی سے عشق ہے۔“

ماہ نور کچھ لمحوں کے لئے خانے میں آگئی۔

”کیا تم نے وہی محسوس کیا جو میں نے محسوس کیا۔“ ماہ نور کی آواز بیچک مٹی تھی۔

”بد قسمتی۔“ نازش نے گہری سانس بھر کر ڈوہچے والی کوسنبھالا۔ ”حماد کا مجھ سے جو رشہ ہے

وہ خود بخود چمکتی محسوس پیدا کر دیتا ہے۔ سہا پہل بھی ہو درمیان میں تو صورت کو خیر ہو جاتی ہے۔ یہاں نہ جیتا جا سکتا جو وہ ہے۔ مجھے خبر کیسے نہ ہوئی۔“

ماہ نور سے کوئی جواب نہ ملتا۔ ایک وحشت ناک خاموشی ان کے درمیان چھا گئی۔

☆.....☆.....☆

سورج ڈھل چکا تھا۔ جب حماد کی گاڑی آہستہ روٹی سے پور ٹیکو میں آ کر رکی۔ گاڑی میں بیٹھے ہی اس نے دیکھ لیا تھا۔ لائن میں اترنے والی ماہر کی سفید بڑبڑیوں پر نازش اور ماہ نور باتوں میں مصروف تھیں۔ وہ ان کو نظر انداز کر کے اندر جانا چاہتا تھا کہ ماہ نور نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

”اگر آئیے بھائی جان!“ حماد کو اندر جانا دیکھ کر وہ اوچس سے چلائی۔ نازش نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا بھی نہیں تھا۔ حماد قریب آیا تو ان کے سیک اپ ڈوہچے پھولے ہوئے چہرے دیکھ کر ہنسا۔

”خیریت۔“

”مجھ آپ نے کچھ وعدہ کیا تھا۔۔۔۔۔ یاد ہے؟“ ماہ نور چنکی ہوئی۔

”میں نے وعدہ کیا تھا؟“ حماد نے ایک لمبے کوسوچا۔ ”نہیں تو!“

اس کے کمر جانے پر ماہ نور آہ سے باہر ہوئی۔

”بھائی! آپ نے وعدہ کیا تھا کہ شام کو ہم دونوں کو ٹیکر، میگزینیشن دیکھنے جائیں گے۔“

”اٹو۔۔۔۔۔ ہاں۔“ کہا تو تھا تو پھر؟“ اس نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

”تو پھر یہ کہ ہم گھنٹے بھر سے آپ کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ آپ نے چوبیس آئے تو کہا تھا اب سات بج رہے ہیں۔“

دونوں بہت تک سبک سے تیار ہیں۔ حماد سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے شانے ہنکے۔

”گھر میں تو اگلی دہائی جا رہا ہوں۔ میری اہم میٹنگ ہے۔ بس کپڑے پہنچ کر آنا

تھا۔ ایسا کرتے ہیں کل پر رکھ لیتے ہیں۔“

تری یادوں کے گلاب

”بھائی! آج آخری دن ہے۔“ ماہ نور تنک کر بولی۔ نازش اس سارے عرصے میں بالکل

ناموش رہے۔ نازش نے دوسری طرف دیکھتی رہی تھی۔

”گھر میں اور لوگ بھی تو ہیں۔ میز کے ساتھ چلی جاؤ۔“ حماد نے اسے چکارا۔

”وہ اپنا قیمتی وقت برباد نہیں کرتے ہمارے ساتھ۔ ان کے خیال میں ہم انتہائی فضول

لوگ ہیں۔ بے نیچے کاموں میں وقت ضائع کرنے کی ماہر۔“ وہ جمل جمل کر بولی اور حماد مسکرایا۔

”بھرا راجیل سے کہو۔“

”راجیل۔“ ماہ نور نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ”اللہ، اللہ، تو بے ویسے بھی اس سے ہماری

لڑائی ہے۔“

”اس کے خیال میں تم لوگ کیا ہو؟“ حماد نے کہا۔

”مجھ سے زیادہ بد تمیز اور لڑا کا بلیاں۔“ اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔

”اے میری اتنی پیاری بہن کو وہ ایسا بھگتا ہے، نہ صرف بھگتا ہے بلکہ بنا محبہ دل

کہتا ہے۔“

”فائن۔“ حماد نے سر ہلایا۔ پھر بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ ”میر تم سے کتنا بڑا ہے؟“

”بہوگا چار پانچ سال بڑی مگر بچہ بنا رہا ہے۔“ ماہ نور نے منہ بنایا۔

”اور تم بھی اس کے لئے ایسی بات کر رہی ہو۔ جیسے تم سے چار پانچ سال چھوٹا ہو۔ وہ تم

سے بڑا ہے۔ اس کا کیا فائدہ کیا کرو۔“ حماد نے اسے سمجھایا تو وہ کچھ کہنے کہتے خاموش ہو گئی۔

”اچھا میں میز سے کہہ دیتا ہوں تم لوگوں کو اپنے ساتھ لے جائے۔“ وہ غری سے بولا۔

”آپ کو کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ بھائی۔ ہم کر لیں گے خود ہی اپنے انتظام۔“

نور نے ہلک کر ریت بنی نازش کا بازو پکڑا اور اسے حمیت کر اندر لے گئی۔

حماد نے بھی بے نیازی سے شانے ہنکے۔ اسے سہاس کے ساتھ ڈانٹ پر چاہتا تھا اور وہ اپنا

پارکرام کھینچ نہیں کر سکتا تھا۔

رات گئے جب وہ گھر لوٹا تو لاؤنچ میں ماہ نور سے سامنا ہو گیا۔ وہ میز سے تھروں سے

اسے دیکھ کر کھڑا کر گزار جانا چاہتی تھی کہ حماد نے اسے بازو سے گھسٹ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

”کیسی تھی میگزینیشن؟“

”پتہ نہیں۔“ بڑی مشکل سے جواب آیا۔

تری یادوں کے گلاب

”چہ نہیں کیا مطلب، آنکھیں بند کر کے گھوم رہی تھیں کیا؟“ اس نے ماہ نور کے سر پر چپٹ لگائی۔ وہ ہلک کر اس سے الگ ہوئی۔

”بھائی! آپ کو زیادہ خوش حوازی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ سے ختم ناراض ہوں۔“

”ناراضگی کی کیا بات ہے۔ تم کو ایک پکڑیشن دیکھنے جانا تھا۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا اور ساتھ ہی تاکید بھی کی تھی کہ تم کو تنگ نہ کرے۔“ وہ اسے مناتے ہوئے بولا۔

”تم کو ریمز کے ساتھ نہیں جانا تھا۔ اور تم نہیں گئے۔“

”ارے“ وہ حیرت زدہ ہوا۔

”تم ایک پکڑیشن دیکھنے نہیں گئیں۔“

”نہیں۔“

”کیوں؟ آج تو آخری دن تھا۔“

”کیونکہ میں آپ کے ساتھ جانا تھا۔ آپ کو میرا نہیں تو نازش کا خیال کرنا چاہیے تھا۔ وہ کتنی ہرٹ ہوئی ہے۔“ حواد کا ایک کھلے کو تنگ بدلا۔ پھر تڑپی سے بولا۔

”اتنی ذرا سی بات پر ہرٹ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“

”یہ ذرا سی بات ہے؟“ ماہ نور ہلکی۔

”یہ ذرا سی بات نہیں ہے بھائی۔ آپ نے وعدہ خلافی کی ہے۔“

”اچھا تو اب میں کیا کروں؟“ وہ ہنچھلایا۔ صاف لگ رہا تھا۔ نازش کا حوالہ اس کے لئے بارگراں تھا۔

”کچھ مت کریں۔ آپ کو کیا فرق پڑتا ہے، مگر مجھ سے بات مت کریں۔“ وہ تڑپ کر بٹلی اور دھڑ دھڑ میریاں چڑھتی چلی گئی۔

حواد اسے جانا دیکھتا رہا۔ پہلے تو قصہ آیا اس کے حوازی دکھانے پر مگر پھر لمبوں پر بھی سی مسکراہٹ بھٹی یہ سوچ کر کہ اس نے ناراض تو کیا ہے اسے مگر اسے سنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ جتنا بھڑکی تھی۔ اتنی ہی جلدی مان بھی جاتی تھی۔ اور ری بات نازش کی تو اس کی اہمیت نہیں رہی تھی۔ حواد کے نزدیک، چہ نہیں وہ اس کے نزدیک کبھی اتنی اہم بھی تھی یا نہیں کہ وہ اس کی ناراضگی کی پروا کرتا۔ اب تو ایسا لگتا تھا وہ اسے جانا پہچانتا بھی نہیں۔“

تری یادوں کے گلاب

چھٹی کا دن تھا اور حسب معمول صبح سے لاؤنج میں ایک ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ کیرم کی بازیاں لگ رہی تھیں۔ ریمز اور راجیل مستقل جیت رہے تھے۔ اور نازش اور ماہ نور بے ایمانی اور من مانی کرنے کے باوجود مستقل ہار رہی تھیں۔ پھر بھی سیدان میں ڈلی ہوئی تھیں۔ ہر بازی اس اعلان کے ساتھ شروع ہوتی کہ اس وقت ضرور جیتیں گے۔ مگر شاید آج ان کا نواہن تھا۔ اس پر ریمز کے ہلکے دے دے والے جملے اب دونوں غیر لوڈ کر رہی تھیں۔

”ریمز کے بچے تم نے میری گوٹ کھسکا لی ہے۔“ نازش نے شور مچایا۔

”الزام نہ لگاؤ۔ غواہ کوا۔“ ریمز بھی دھاڑا۔ ”دیکھ لو۔ میں تو ہاتھ باندھے بیٹھا ہوں۔“

”آہا۔۔۔۔۔ اسے محسوس نہیں ہو تم۔ گوٹ کھسکا کر ہاتھ باندھ کر بیٹھے گئے۔ کیونکہ وہ ایسے رکھو میری گوٹ اس کی جگہ پر۔“

”تم خود ہوں گی کیونکہ تری پر کئی۔“ وہ بیٹا گیا۔

”یکومت گوٹ وہ ایسے رکھو۔ نازش لڑنے مرنے پر آمادہ تھی۔ گوٹ وہ ایسے رکھو کہ دم لیا۔

حواد کو ان کی لڑائیاں دیکھنے میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔ وہ اس وقت نازلی بیگم کے ساتھ بیٹھا تھا۔ مگر اس کا سارا دھیان انہی لوگوں کی طرف تھا۔

”تم بھی ان کے ساتھ کیوں نہیں کھیلنے جانا۔“ نازلی بیگم نے اس کا اشتیاق دیکھ کر پوچھا۔ وہ دیکھ رہی تھیں کہ حواد سے الگ تھلک رہتا تھا۔

”مجھے تو معاف کریں، نا تو ایسے طوفان میل میرے بس کی نہیں۔“ اس نے نفس کر ماہ نور کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اب تک اس سے ناراض تھی۔ اور بات چیت بند تھی۔

لڑکیوں کی زبانیں جس رفتار سے چل رہی تھیں اسے حیرت ہو رہی تھی۔ سیر کو سیر تھیں لڑکے ان کے بارے میں سمجھ خیال رکھتے تھے۔ اس وقت تو وہ خود اس بات کا ثبوت دے رہی تھیں کہ تھاکو لہی بھی آ رہی تھی۔

”ریمز کے بچے اب بڑے گھمے۔“ نازش نے مطلق چھاڑا۔

”بچوں تک کیوں پہنچ جاتی ہو؟“ وہ حملہ لایا۔ ”لوگ باپ، دادا تک پہنچتے ہیں۔ یہ اپنی طرف چلتی ہیں، اپنی کھوپڑیاں۔“ ریمز نے ایک چپٹ بھی رسید کر دی۔ گویا اپنی شامت بلوالی۔

وہ کرسی دھکیل کر کھڑی ہوئی۔ دونوں ہاتھوں میں ریمز کے بال پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ اسے دن میں ہرے نظر آ گئے۔ راجیل نے بچہ چھاؤ کر لیا۔



"بس بھی یہ آخری بازی، اب خون خرابے تک نوبت آگئی ہے۔"

دونوں ٹھنڈے ہو گئے، کھیل پھر شروع ہوا۔ جیسے ہی ہارک مرحلے میں داخل ہوا اسی حساب سے تھرم بھی بچا۔ حوادک تجسس بڑھا، اٹھ کر ان لوگوں کے بالکل قریب آ گیا۔

ریزبر کی گولٹ پاکٹ ہوتے ہوتے رو گئی۔ ماہور نے ہاتھ پیچھے رکھ کر گولٹ واپس اچھال دی۔ یہ آخری گولٹ پاکٹ ہو تھی۔ دونوں لڑے۔ وہ اپنی غلطی ماننے کو کسی طور پر تیار نہ تھی۔

نازش نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اپنی طرف دیکھ کر گولٹ پاکٹ میں نچاوی۔ حوادک نے اسے بے ایمانی کرتے دیکھا۔ مگر اسے اس وقت لڑکیوں سے ہمدردی ہو رہی تھی۔ اس لئے اپنی مسکراہٹ دبایا۔ وہ نازش کی پشت پر ہی کھڑا تھا۔

جھگڑا ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ نازش نے اپنی باری لینے کے لئے اسٹریٹجکری طرف ہاتھ بڑھایا۔ حوادک سمجھا وہ پھر بے ایمانی کرنے جا رہی ہے۔ اب وہ رو نہیں سکا۔ بلکہ ارادہ جھک کر نازش کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ارے اتنی بے ایمانی۔"

"ڈونٹ ٹانگی۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"ہاتھ چھوڑیں۔" نازش کا اٹھاننا خاصا ہانت آہیز تھا۔

حوادک چہرہ پر کشر رخ ہوا۔ اس نے جھگڑے سے نازش کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ مگر نازش خاموش نہیں رہی تھی۔

"آپ کون ہوتے ہیں۔ ہمارے کھیل میں دخل دینے والے۔"

"شٹ اپ نازش، تمہیں بات کرنے کی تیز نہیں ہے ان سب نے تمہیں بہت سر پر چڑھایا ہوا ہے۔" اس نے ریزبر اور رائل کی طرف اشارہ کیا۔

"انہی کے سر پر چڑھ کر ناچو میرے ساتھ اگر آئندہ اس لپے میں بات کی تو میں تمہارا دماغ سمجھ کر اڑوں گا۔"

حوادک آواز بچی تھی۔ مگر لپے میں انکار سے دیکھ رہے تھے۔

وہ بھڑک اٹھا۔ تیز تیز قدموں سے لاؤنچ سے نکلا گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد رائل نے سنبھل کر یاد دلایا، کھیل ادھر جا رہا ہے۔ مگر نازش نے تیزی سے کرسی پیچھے دھکیلی اور ان سب کی طرف دیکھے بغیر میز صیال پھلانگی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

حوادک سے دروازہ بند ہونے کی آواز نیچے آئی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے بھی؟" رائل نے تھوٹیش سے ماہور کی طرف دیکھا۔

"جو کچھ ہو رہا ہے کھک نہیں ہو رہا ہے۔" اس کی آنکھیں بھرا آئیں تھیں۔

"نازش نے بد تیزی کی تھی۔" ریزبر نے دخل اندازی کی۔

"اسے اس طرح حوادک سے بات نہیں کرنی چاہئے تھی۔"

"وہ بھلا سے ناراض ہے۔" ماہور نے کزوری طرف اشارہ کیا۔

"ہمارا منگی اپنی جگہ۔ حوادک اسے اس کا چورشت ہے اس میں ادب اور احترام اپنی جگہ لازم ہے۔ ایسی کیا انا منگی تھی کہ ہم سب کے سامنے اس نے اس طرح سے بد تیزی کی۔ حوادک تھوٹیش میں قوی آئی تھا۔ ریزبر اپنی بات پر قائم رہا۔

"ابھی اب تم جاؤ اس کے پاس دیکھو کیا کر رہی ہے۔" رائل نے ماہور کو اٹھایا۔

"میں نہیں جا رہی۔ مجھے پتہ ہے وہ اس وقت کسی سے بات نہیں کرے گی۔"

"ذرا دیر بعد ہی نازش کپڑے بدل کر دوبارہ نیچے آگئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں گاڑی کی چابی تھی اور وہ ان کے قریب سے سر اٹھائے کزورتی چلی گئی۔ تیز خطرناک تھے۔"

"نازش!" ماہور نے اسے بے اختیار آواز دی۔

"نازش نے پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔ ماہور اس کے پیچھے جانے کو بھی۔ مگر رائل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھار دیا۔

"مگر پتہ تو چلے جا کہاں رہی ہے؟" وہ پریشان ہو رہی تھی۔

"نچو چھو کی تو پنہ کی۔ تمہیں پتہ ہے غصے میں اسے پھیلا جائے تو بالکل آؤٹ ہو جاتی ہے۔ کسی کا لٹا نہیں کرتی۔" رائل نے ہاتھ جھانڈے اور جانے کو اٹھا۔ ماہور اسی طرح منہ لٹکائے بیٹھی رہی۔

"ارے بھی تھوڑی سی ریش ڈرا تو جگہ کرے گی اپنا غصہ گاڑی پر نکالے گی اور ابھی پھٹکی ہو کر آ جائے گی شام تک۔"

"اور اتنی دیر میں جڑوا بیٹی رہوں گی کیا کروں؟" وہ بے جا رہی سے بولی۔

"کراہی ہے۔ جا کر صلی پر بیٹھو اور اس سر بھری کی خیریت سے دوا بھی کی دعا نہیں مانگتی رہو۔" ریزبر کوئی اثر نہ تھا۔ وہ اسی طرح ان دونوں کو زچ کر رہا اور اسی لئے ان دونوں کی ریزبر

سے ایک لمبے لمبی نہ بنی تھی۔

”باقی کا سارا دن نازش نے جی سبکی روٹی کے گھر گزرا“

اور حواد سارا دن میسلا کو ساتھ لئے شہر سے باہر پرغضا مقامات پر تفریح میں مگن رہا۔ شام ڈھلنے لگی تھی۔ جب نازش نے گھر واپسی کی راہ لی۔ وہ ایک شاہراہ پر تھی۔ اور ایک سگھل کے سرخ اشارے پر اس نے گاڑی روکی اور بونٹی اپنی بائیں طرف دیکھا۔ اس کی نظریں وہیں ٹھہر گئیں۔ حواد اپنی گاڑی سے اتر رہا تھا۔ مگر وہ اکیلا نہیں تھا۔ دوسری طرف کا دروازہ کھلا اور میسلا ہنسی مسکراتی سرخ لباس میں شیطانی طرح دکھائی باہر نکلی اور وہ دونوں اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس رہینورٹ کے اندر چلے گئے جس کے سامنے حواد نے اپنی گاڑی پارک کی تھی۔

شدت سے نازش کا دل چاہا۔ وہ ابھی اس کے سامنے چائے اور حواد کو اس کی سرگرمیاں بتا دے۔ اور پھر اس نے یہی کیا بغیر سوچے بچھے اپنی گاڑی سائیڈ لین میں اتار دی۔ حواد کی کار کے ساتھ ہی غلطی جگہ پر اسے پارکنگ مل گئی۔ گاڑی وہیں کھڑی کر کے وہ بھی رہینورٹ میں داخل ہوئی۔ نازش کو ان دونوں کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑی بلکہ اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظریں سامنے بیٹھے حواد کی نظروں سے ٹکرائیں۔ حواد ایک لمبے کوخت حیرت زدہ ہوا۔ مگر فوراً ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور میسلا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اور نازش بڑی دیدہ و دلیری کے ساتھ حواد کے ساتھ والی نیکل پر جا کر رہی۔ کرسی حمیت کر اس طرح بیٹھی کہ حواد کی نظروں کے بالکل سامنے رہے۔ میسلا کی اس طرف پشت تھی۔ اور حواد چاہتے ہوئے بھی اس پر نظر ڈالنے پر مجبور تھا۔ نازش بیٹھی ہی اس طرح تھی۔ نہایت اطمینان سے چائے کھونٹ کھونٹ پیتی رہی۔ بظاہر حواد سے بے نیاز لاقطف مگر اس کو پتہ تھا کہ گاہے گاہے حواد جو نظریں پر ڈالتا تھا کسی قدر خوشنوت بھری ہوتی ہے۔

جلدی ہی وہ دونوں کافی قسم کر کے اٹھ گئے۔ میسلا آگے جا چکی تھی۔ حواد ہاتھ جاتے ایک پل کو نازش کے پاس رکا۔

”یہاں سے فوراً اٹھو۔۔۔ اور سیدھی گھر جاؤ۔“

”او کے پاس“ وہ بڑی فرماں برداری سے بولی مگر لہجوں پر آگ لگا رہی تھی۔

حواد تھکا کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے ہی وہ جانے کو ابھی۔ ان دونوں کی گاڑیاں آگے

پیچھے ہی تھیں۔ نازش کا رخ گھر کی طرف ہی تھا اور حواد مخالف سمت میں نکلا چلا گیا تھا۔

حواد بھی جلدی گھر واپس آ گیا تھا۔ رات تک نازش نے بڑی کوشش کی تھی کہ حواد کے سامنے نہ آئے۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی رہی تھی۔ مگر اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اسے ٹھنک کر رکنا پڑا۔ وہ کوریڈور میں اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے ڈٹا کھڑا تھا۔ نازش کے لئے پتہ بھی ممکن نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر وہ ایک قدم آگے بڑھا۔

”رہینورٹ میں کیا کرنے گئیں تھیں تم؟“ اس کے لہجے میں شعلوں کی لپک تھی۔

”چائے پیئے۔“ کمال اطمینان سے دیکھتے ہوئے جواب پر حواد بھٹکا کر رہ گیا۔

”تکس کی اجازت ہے؟“

”اجازت کی کیا ضرورت ہے؟“ وہ استہزاء سے مسکراتی۔

”اتنی خود مختار کب سے ہو گئیں تم؟ کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں تھیں؟“ وہ دھیمی آواز میں خزاہا۔

”آپ بھی تو مجھے تھے؟“ وہ بے غرضی سے بولی۔

حواد کا دل چاہا کہ ایک ٹھنڈا سید کر دے۔

”میری بات اور ہے۔“ اس نے راحت نہیں کر کہا۔

”آپ کی بات اور کیوں ہے؟“ وہ ہنسی۔

”میں اکیلے چائے پیئے نہیں چاہتی۔ آپ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ سوچ منانے پر جگہ

جا سکتے ہیں۔“

”شب آپ“ وہ تانبے کی طرح سرخ ہوا۔

”تم بد تمیز، بد زبان ہی نہیں۔ خود بھی ہو اور اب میں تمہیں اس طرح کی بے لگی حرکتیں

کرتے نہ دیکھوں۔“

”میں اپنے پیڑھس کے سامنے جوابدہ ہوں بس۔“ وہ تلخیص سے بولی۔

”آپ کو میری باز پرس کا کوئی حق نہیں۔“

”مجھے ان سے زیادہ حق ہے۔ تمہاری باز پرس کا۔“ وہ ہنسی کر بولا۔

”اتنا ہی حق میرا بھی بنتا ہے۔ آپ سے باز پرس کرنے کا۔“ وہ بڑے غصے

انداز میں بولی۔



”میں تمہیں صبر کرنا ہوں نازش اپنی حد میں رہو۔“

”میں اپنی حد میں ہوں۔“ نازش بڑے قہر سے بولی۔ نازش کے غصے سے اندازہ چرے پر پھیلا سکون، ہمارا کواور جلائے دے رہا تھا۔

”کیا سمجھتی ہو تم۔“ بڑا اختیار ہے تمہیں۔ میرے دن رات کا حساب رکھنے کا؟ بھول جاؤ کہ کبھی تمہیں اس کا موقع ملے گا۔“ حواد نے اگلی اٹھا کر سخت تنبیہی انداز میں کہا تو نازش کی کپنپاس سب اٹھیں مگر اس نے کمال ضبط سے آنکھوں میں آنے آنسو طلق میں اتارے وہ کسی طرح حواد کے سامنے کمر نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

”میں سب سے شادی کر رہا ہوں۔ آج وہ اسے میری گرل فرینڈ نہ کہنا۔ شی اور مانی فرانس۔“ وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

نازش کے سر پر جیسے چھت آ رہی اور حواد اسے لمبے کتے روکتا ہوا چلا گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ نازش بہت جلد اپنے سوا میں آ گئی۔ وہی لڑائی جھگڑا پھیل تھانے شروع ہو گئے بلکہ ان سب کو لگتا تھا کہ وہ پہلی ہی نہیں زیادہ شور مچانے لگی تھی۔ ہنسنے کی بات ہو یا نہ ہو اس کے بلند قہقہے جیسے گانے نام نہیں لیتے تھے۔ مگر کے بازو سے اس کے تعلقات ضرورت سے زیادہ خوشگوار ہو گئے تھے مگر ایک بات سب نے محسوس کی تھی۔ حواد اور نازش کی بات چیت بالکل بند تھی۔

نازش کو دیکھتے ہی حواد کے چہرے پر ناگواریت پھیل جاتی اور حواد کی موجودگی میں چپکٹی نازش ایسے خاموش ہو جاتی جیسے کھلونے کی چالی ختم ہو گئی ہو۔ وہ صاف حواد سے کڑی تھی اور حواد جانا لگا اسے نظر انداز کرتا تھا۔ بالکل غیر محسوس طریقے سے دونوں ایک دوسرے سے بالکل لائق ہو گئے تھے۔ اب درمیان میں نہ مٹنے والا فاصلہ چکا تھا۔

پر مگر ام کے مطابق سب سے والدین جلد ہی آنے والے تھے۔ اور اس سے پہلے حواد کو مگر میں وہ مدعا بیان کر رہا تھا۔ جس سے ایک طوفان اٹھا اور جس سے مٹنے کے لئے دو اپنے آپ کو پوری طرح تیار کر چکا تھا۔ نازش سے اس نے پہلی ہی کہہ دیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ جلد ہی سارے مگر میں یہ بات بھیل جائے گی۔ مگر نازش نے اپنے لب ہی لئے تھے۔ اب حواد کو خود ہی بڑوں تک بات پہچانی تھی اور اس نے اپنے والدین کے بجائے سیدھے سیدھے مانی بیگم سے ہی ہمت کر کے کہہ ڈالا۔ وہ سب سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

”تم کو اتنی جرأت کیسے ہوئی حواد؟ کیا سوچ کر تم نے اتنا بڑا فیصلہ کیا؟“ وہ شیرینی کی طرح دھاڑیں۔

”میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔“ وہ مضبوطی سے بولا۔

”تمہارا نکاح نازش کے ساتھ ہو چکا ہے۔“ انہوں نے جیسے اسے اطلاع دی۔

”جانتا ہوں۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

”اور بارہ سال کے نابالغ لڑکے کا پانچ سال کی نابالغ، نا بھگہ بچی سے نکاح چہ حواد کے جانے کی میرے بڑے دیک کوئی اہمیت نہیں۔ میں اس نام نہاد نکاح کو نہیں مانتا۔“

”پہلے حواد سے نا کا فیصلہ تھا حواد۔“ وہ جلال میں آ گئیں۔

”ان کی خواہش اور تم دونوں کے والدین کی رضا مندی سے پورے خاندان کی موجودگی میں یہ نکاح چہ حواد کیا گیا۔ یہ نکاح نام نہاد نہیں ہے۔ سارا خاندان اس کا گواہ ہے۔ تم اس سے کیسے انکار کر سکتے ہو؟“

”کیونکہ یہ میرا فیصلہ نہیں تھا۔“ وہ بے غوثی سے بولا۔

”نانا کا فیصلہ تھا۔۔۔۔۔ اور میرے ماں باپ کو اختیار تھا انہوں نے میری زندگی کا فیصلہ اس وقت کر دیا۔ جب میں کچھ جانتا بھی نہیں تھا۔ مگر اب میں یہ اختیار کسی کو بھی نہیں دے سکتا۔ اپنے ماں باپ کو بھی نہیں۔ زندگی مجھے گزارنی ہے اور اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا مجھے پورا حق ہے۔ یہ مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ نہ آپ نہ میرے والدین اور نہ وہ۔ جسے آپ نے میرے نام کے ساتھ ہاتھ رکھا ہے۔“ اس نے نازش کا نام نہیں لیا۔ مگر اس کے لہجے میں جو کڑواہٹ تھی اور حواد کا جیسا جتنی انداز تھا جلدی بیگم جتنی دیر تک کچھ بول ہی نہ سکیں۔

اور جب پولیس تو ان کا جلال سرد چکا تھا۔ لہجے میں ایک تشنگی ہی تھی۔

”حواد تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارے اس اقدام سے کتنے خاندان متاثر ہو سکتے ہیں آج کل میں تعلقات کشیدہ ہو چکے ہیں۔ میرے سب بچوں میں جو ایک ہے، محبت ہے غلوں ہے سب تار تار ہو جائے گا۔“

”مجھے اندازہ ہے۔“ وہ اب بڑے ارب سے بولا۔

”اور اتنا ہی یقین آپ کی فہم فراست پر ہے۔ اسی لئے میں نے کسی کا سہارا لئے بغیر آپ سے ہی بات کی ہے۔ آپ کے فیصلے پر کسی کا اعتراض کرنے کی ہمت نہیں ہوگی۔ غصے سے دل





بہت ہنگامہ بچایا تھا۔ نازش کو وہ بالکل بنی کی طرح چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ اس کی توجہ تھی۔ جو وہ پرناشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ان کے بیٹے راجیل کا جھکاؤ ماہ نو کی طرف تھا۔ ہاں سے خود اپنی خواہش کا اظہار وہ کر چکا تھا۔ اور نازی بیگم بھی اس رشتے کے لئے مایہ جبریلی تھیں۔ انہوں نے راجیل کے لئے نازش کا رشتہ مانگ لیا۔ عمران گیلانی خاموش نہیں رہ سکے تھے۔

”میری بنی مجھ پر بوجھ نہیں ہے۔ ایک نے انکار کیا تو دوسرا صحنے کو آگیا۔“ وہ سخت طیش میں آ گئے۔

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں بھائی صاحب! نازش میری بھی بنی ہے اور میں نے کچھ سوچ کر یہ رشتہ ڈالا ہے۔ حماد کو ماہ نو کا ذرا بھی خیال ہوگا تو وہ اپنے ارادے سے باز آجائے گا۔ نو جوانوں سے ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ان کے آگے ہتھیار ڈال دیئے جائیں۔ ہم کو تدبیر کرنے دیں۔ یہ جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کا موقع ہے۔“ انہوں نے سمجھانے کی کوشش کی مگر عمران صاحب نے ان کی تجویز ماننے سے انکار کر دیا۔

”حماد کے سر پر مشق کا بھوت سوار ہے۔ وہ کسی کی نہیں سنے گا۔ ہاں کی نہ نہن کی جس نے نکاح جیسے آفاقی رشتے کی پاسداری نہ کی اس کے لئے اب کوئی رشتہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اور میں خود ایسے فیصلے کے ساتھ اپنی بنی کا مستقبل وابستہ نہیں کرنا چاہتا۔ جہیں یہ حاجت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ماہ نو زاور راجیل کا رشتہ اماں ملے کر بھی ہیں۔ وہ برقرار رہے گا البتہ اپنے مستقبل کا فیصلہ نازش خود کرے گی۔“

”کچھ فیصلے وقت پر چھوڑ دو۔“ نازی بیگم نے بڑی مضبوطی سے کہا۔

”اس بات سے آپ کا کیا مطلب ہے اماں۔“ دونوں ہی سمجھ نہ سکے۔

”ہمارے خاندان میں طلاق نہیں ہوتی۔ آج تک ایسا نہیں ہوا۔ جو رشتہ تہہ ہاں سے مرحوم باپ نے ملے کیا تھا میں اپنی زندگی میں تو نو نے نہیں دوں گی۔ حماد کو اپنی ضد چھوڑنا ہوگی وقت کا انتظار کرو۔“ روز کی طرح ایک لمبی بحث کے بعد معاملہ پھر جوں کا توں تھا۔

سب بڑے بول بول کر تھک چکے تھے۔ سوچ سوچ کر ہار گئے تھے۔ کوئی حل نہ نکال پا رہے تھے اور وہ افراد جن کی پوری زندگی کا دار و مدار ان کے فیصلے پر تھا۔ بالکل خاموش تھے۔ حماد گھر میں کبھی نہیں تھا۔ سب سے لاشعری اختیار کر رہی تھی۔ وہ اب اس موضوع پر کسی نے بات

نہیں چاہتا تھا اور اس کے کسی انداز سے نہیں لگتا تھا کہ وہ گھر والوں کے آگے کھٹے ٹیکے کا ماراں گزرنے کے ساتھ اس کا فیصلہ مل جوتا جا رہا تھا۔ وہ صرف میسلے کے والدین کے انتظار میں تھیں۔ ان کے آگے ہی وہ اپنے ارادے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے والا تھا۔

اور نازش۔ اتنی گہری تھی کہ اس کے دل کی بات کوئی نہیں جان پار تھا۔ وہ اپنے کسی انداز سے کسی پر کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دی۔ معمول کے مطابق کالج جانا، رات گئے تک اسٹڈیز میں غرق رہنا۔ پورے گھر میں اس وقت وہی ہلچل ہو رہی تھی۔ سارا گھر اس کے لئے پریشان تھا اور وہ خود اپنے آپ میں مگن۔ ہر کسی سے بے نیاز۔

اس رات حماد کو گھر چلنے لگنا پڑا۔ صبح سے کچھ ٹھنڈا تھا۔ شام میں ہلکی ہلکی بارش سے فضا بڑھ چکی تھی اور اب بارش کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے کپڑے پہلے ہی بھیک چکے تھے۔ طبیعت زیادہ خراب ہو جانے کے ڈر سے وہ گھر جلد آنے پر مجبور ہو گیا۔ جس وقت وہ گھر پہنچا۔ گھر کے سب افراد کھانے سے فارغ کرنا ڈیوٹی میں بیٹھے تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ وہ بے کراہت انداز کرنا سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا اسے جلد سے جلد لباس تبدیل کرنا تھا۔

کچھ دیر بعد بارش کی شدت کا اندازہ کرنے کے لئے وہ دھنکی نہیں پر نکل آیا۔ ذرا دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہاں تو نہیں تھا۔ دھنک پر دھنک بھٹکے بھٹکے کروان سوز کر دیکھا اور سرے سرے پر نازش اسی کی طرح دھنک پر دھنک کھڑی تھی۔ وہ بھی اس کی آمد سے بے خبر تھی۔ اس کے کمرے کا اندازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر سے آنے والی ہلکی روشنی میں بھی حماد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ پوری طرح بھیک مٹی ہے۔ حماد بے تدموس اس کی پشت پر جا کھڑا ہوا۔ نازش کو اس کی بھی خبر نہ ہوئی۔ پانی کی اچھی مٹ جو چھاڑ میں کھڑی وہ ہولے ہولے کا پتہ ہی تھی وہ بے اختیار بول اٹھا۔

”نازش! یہاں کھڑی کیوں بھیک رہی ہو؟“ نازش سیدھی ہو گئی اور اس کی طرف مڑ رہی۔

”مجھے بارش میں بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔“

”اور جو بیار پڑ گئیں تو؟“ اس کے لیے جیسے اس کے لئے تڑپا تھا۔ نازش کو آگ لگی۔

”میں بہت ڈھمکتی ہوں۔ میری یہ صفت تو آپ کو معلوم نہیں۔ ایسی ہلکی بھٹکی بارشیں میرا دل نہیں کاڑ سکتیں۔ البتہ آپ کافی نازک حواص ہیں۔ آواز نے لگ رہا ہے بیار پڑ چکے ہیں۔“ اس کے سیدھے سادے حلوں میں گہری کاشت تھی۔

"بہت بولتی ہوں؟" وہ بھنا گیا۔

"چلو۔ اندر چلو۔"

"مجھے کہنے کے بجائے بھڑکا کر آپ خود اندر چلے جاتے۔ تاحق کھڑے ہیں۔"

رہے ہیں۔"

اس کی وضاحتی پر حاد کو فضا آ گیا۔ جل کر بولا۔

"مرنے کا ارادہ ہے کیا؟"

"نہیں تو؟" وہ بڑے سرے سے بولی اور مائی پھیلیوں میں پانی جمع کرنے لگی۔

"کچھ نہیں ہوگا۔" نازش نے پانی جھٹک کر مائی پھیلی پھیلائی۔

"دیکھئے۔ میری زندگی کی گھبراتی گھبرائی ہے اور مجھے زندگی سے بہت پیار ہے

مرنے کی باتیں تو بدول کرتے ہیں۔ میرے سامنے تو ایک جہان پھیلا ہوا ہے۔ میں کیا

مروں؟" وہ نازش کی اس سیدھی سیدھی باتوں کا بڑے حاد مطلب غور ہی جان رہا تھا۔ ٹھک کر بولا۔

"بہت بہادر بنی ہو!"

"تو تو میں ہوں۔ اس میں شک کیا ہے؟" اس کی گھبرائی میں ایک پختہ تھا۔ حاد ہلکا ہوا۔

"تو اپنی بہادری کا ثبوت دکھاؤ۔"

اب وہ اس کی طرف پلٹی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑے حاد سے پوچھا۔

"آپ نے مجھے آزماتا کیا؟"

حاد سے کچھ جواب نہ دین پر انھیں چرا کر رہی بارش کو دیکھنے لگا۔

"مقدمے کی سب سے اہم فریق میں ہوں۔ میرا بیان لینے کی آج تک کسی نے ذمہ

نہیں کی۔ آپ مجھ تک تو آتے۔ بہت پہلے یہ مقدمہ جیت گئے ہوتے۔"

حاد نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اسے یقین نہیں آیا۔

"بہت صاف۔ بہت واضح۔" وہ اسی اطمینان سے بولی۔

"شادی۔ دلوں کی خوشی اور مطمئن کا نام ہے۔ جب دل نہ ملے ہوں تو زندگی میں خوشی"

اطمینان کہاں سے آئے گا۔ آپ کی طرح میں بھی جوں کے فیصلے کی بجائے نہیں چڑھتا چلاؤ

ایک قدم آپ اٹھا چکے۔ دوسرا قدم میں اٹھاؤں گی۔ کل میں خود سب کے سامنے اس کا

بند میں کو بیٹھانے سے انکار کر دوں گی۔"

دوسرا اٹھائے حاد کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بڑے حاد سے کہہ رہی تھی۔

"اتنی ہمت ہے تم میں؟" وہ بے یقینی کا ہنسا تھا۔

"کل کون سا دور ہے۔ دیکھ لیجئے گا۔"

حاد سوچتی نظروں سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کیا وہ سچ کہہ رہی تھی؟ واقعی ایسا کر سکتی تھی؟" وہ اس کا یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اسے

سوچ میں پڑے دیکھ کر نازش مسکرا دی۔ بڑے دوستانہ انداز میں بولی۔

"نہیں! لیکن میں پڑ گئے آپ؟ اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ نہ ڈالیں۔ طبیعت اور خراب

ہو جانے گی۔ رو ٹھیک پنا ڈول کھا پیئے اور آرام سے سو جائیے۔ اب مجھے ذرا بارش کا لطف

اٹھانے دیجئے۔"

وہ مڑی اور بارش کے قطرے پھیلی پر جمع کرنے لگی۔

حاد نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ پہلے کی ہر قدم پر اسے زنجیر کرنی تھی۔ اس کی پشت

پر کھڑے بیٹھالوں کو ذرا دیر دیکھ کر ہاتھ پیر کی سانس بھری۔ لوں پر دھمکی مسکراہٹ نکھری۔

"تم واقعی بہت بولتی ہو۔ ضرورت سے زیادہ۔" وہ پلٹ کر دھمکی قدموں سے اپنے

کمرے میں چلا گیا۔

حاد کے جانتے ہی نازش کی ساری ہمت جواب دے گئی۔ رنگ بے ہوشی وہ ہے آواز

آنسو بہاتی رہی۔ چہرے سے پھلتے بارش کے قطرے کے ساتھ دل کا درد بہتے کسی نے نہ دیکھا۔

دورات اس پر کس قدر بھاری گزری۔ کوئی نہ جان پایا۔

دوسرے دن حاد گھر پر رہا۔ کچھ ناسازی طبیعت کی وجہ سے اور کچھ اس تنہا میں کر

نازش اپنے ذہنی پر کس طرح عمل کرے گی۔ صبح سے ہی وہ سب کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھا رہا۔ اس

کی طبیعت ہمارا دیکھ کر کسی نے اسے جیسے نہیں حالانکہ وہ بڑے دلوں بعد سب کے ہاتھ لگا تھا۔

صبح سے دوپہر ہو گئی۔ اسے نازش کا انتظار ہی رہا۔ وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔ نہ کوئی

اس کے لئے فکر مند تھا کہ وہ نظر کیوں نہیں آ رہی۔ حاد کو تشویش ہونے لگی۔ کل رات وہ جس طرح

بارش میں کھڑی ہو چکی تھی اور غصے سے کانپ رہی تھی۔ کہیں پکار نہ پڑ گئی ہو۔ اس نے چھوٹی

مسکان کو اپنے پاس بلایا۔ چپکے سے بولا۔



”کچھ کراؤ۔ نازش کیا کر رہی ہے؟“

”مجھے پہلے سے پتہ ہے کیا کر رہی ہیں؟“ اس نے آنکھیں میچائیں۔

”اپنے کمرے کی صفائی کر رہی ہیں جو دو سال میں ایک بار کرتی ہیں۔ ان کے کمرے کا دروازہ لاکھ ہے اور وہاں ہرگز نہیں کھولیں گی۔ کسی کے لئے بھی نہیں۔“

”تمہیں کیسے پتہ؟“ حماد کو اس پر شک تھا۔

”مجھ جب ناشہ کرنے آئی تھیں کہ تو کہہ رہی تھیں۔ آج میرے کمرے میں کوئی نہ آئے اور مجھے تو خاص طور پر منع کیا ہے۔“

”تمہیں ان خاص طور سے کیوں؟“ حماد کو اس کے مصمصیت سے کہنے پر ہنسی آگئی۔

”کیونکہ میں ان کی ہر چیز کو جھینڑتی ہوں اور کچھ نہ کچھ ضرور توڑ دیتی ہوں۔ آپنی کے پاس اتنی پیاری پیاری چیزیں ہیں! آپ نے ان کا کمرہ دیکھا ہے نا؟“ اس نے بڑے شوق سے پوچھا۔

”نہیں! احادی نے گہری سانس بھری۔

”یہ صفائی کا پروگرام کب تک چلے گا؟“

”رات تک یا شاید کل صبح تک۔“

حماد کو بے انتہا تازہ آئی۔ جتنی بے تابی سے وہ اس کا منتظر تھا اتنی ہی بے نیازی سے وہ سارے دن کا پروگرام بنا کر کمرے میں بند تھی۔ دوپہر کے کھانے پر بھی وہ غصہ نہ آئی۔ جانے پر اس نے کہا وہ اس کے پاس کھانا کھانے کے لئے ہاتھ نہیں ہے۔ اس کے لئے کھانا کمرے میں بھجوا دیا جائے۔

اور حماد کو یقین ہو گیا اور اس کا سامنا کرنے سے تکراری ہے۔ رات بھوت بول رہی تھی۔ اتنی بہت کہاں ہوگی سب کے سامنے انکار کرنے کی۔ خواہ مخواہ انکے پیچھے اپنا سارا دن خراب کیا۔

جلا جلا خوار ہوا اس کا کھانا کھانے کو بھی دل نہ چاہا۔ تھوڑا بہت کھا کے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سونے کی کوشش کی مگر نیند نہیں آئی۔ طبیعت سخت جڑا ہو رہی تھی۔ دودھ کرنا نازش پر طعنا تارہا۔ اور اس سے زیادہ اپنے آپ پر۔ وہ کیوں اس پر غور نہ کر بیٹھا۔ کیوں امید باندھ لی۔

شام تک اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی وہ گھر میں ٹھہر کر اپنی شام برادیں کرتا چاہتا تھا۔ وہ ننہن گھر کا باہر جانے کے لئے نکلا۔ رات کی بارش کے بعد موسم بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ سبزہ دھل کر گھرا ہوا آنکھوں کو ترواہستہ مل رہا تھا۔ لان میں مگر کے سب ہی افراد جمع تھے۔

چائے کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ ایک نظر میں اس نے اندازہ کر لیا۔ نازش ان میں موجود نہیں تھی۔ وہ بھٹا کر سب کو نظر انداز کر کے نکل جاتا چاہتا تھا۔ نازلی گیلانی نے اسے آواز دی تو اسے رک کر پلٹنا پڑا۔ انہوں نے اشارے سے اسے قریب بلایا۔

وہ بے دلی سے آگے بڑھا اور پھر ٹھٹھک کر رک گیا۔ آف وہاں لہاس میں گھاس پر دوڑا تو چٹخی نازش پر اس کی نظر غبر گئی۔ وہ نازلی گیلانی کے زانوں پر دونوں ہاتھ رکھے ہنس ہنس کر ان سے کچھ کہہ رہی تھی اور وہ ڈاراسنگی سے سرخشی میں ہلارہی تھیں۔ وہ بے اختیار ان دونوں کی طرف کھنچا چلا آیا۔

حماد کو دیکھتے ہی نازش مسکرائی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پریطر نازلی گیلانی کی طرف متوجہ ہوئی۔

”اچھا دادو! اب تو معاف کر دیں۔ حالانکہ نازش مجھے آپ سے ہونا چاہئے۔“

”لو! اٹلا چڑھ کر کوال کوڑا سنئے۔“ وہ اور غصہ ہو گئیں۔

”مجھ سے کیا بھول ہوئی؟“

”آپ سے تو بہت بڑی بھول ہوئی ہے دادو۔“

نازش نے پھر حماد کی طرف دیکھا۔ حماد کی کھلی کھلی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی نازش کا کس بات کی طرف اشارہ ہے مگر اس بہت اور جرأت کی اسے قطعاً امید نہیں تھی۔

”آپ کو ہانکل یاد نہیں دادو۔ آج میری ساگرہ ہے۔“

”اگرے؟“ سب کے منہ سے بے اختیار کچھ نہ کچھ نکلا۔ حماد کے اعصاب اڑھیلے پڑے۔ آج نازش کی ساگرہ تھی۔ آج ہی کی تاریخ میں ان دونوں کا تاراج ہو لگا اور وہ سب کے سب بھولے ہوئے تھے۔

دراصل ان کے گھرانے میں ساگرہ مٹانے کا کوئی رواج نہیں رہا تھا۔ وہ تو نازش ہی ہر سال اپنی ساگرہ سے کچھ دن پہلے سے شور مچانا شروع کر دیتی۔ سب سے تجھے بھی زبردستی سمجھتی، کیک بھی کھا جاتا اور رات میں سب گھر والوں کو ڈنرا اپنی جیب سے کراتی۔ اس واقعہ وہ بالکل خاموش رہی تھی نہ اس نے شور مچایا اور نہ کسی کو یاد رہا۔

مگر اب سب ہی کو یقین ہو رہا تھا کہ اپنی پریشانی میں انہوں نے اس کی زندگی کا اہم دن بھلا دیا تھا۔ اب سب اس کی ساگرہ فوری طور پر مٹانا چاہ رہے تھے۔ تھوکنے کے بعد سے کر رہے تھے۔





تری یادوں کے گلاب

تمہاری آنکھیں، تمہارا چہرہ چمک چمک کر رہا دیتے ہیں۔ تم اتنی آسانی سے ان سے دستبردار نہیں ہو سکتیں۔

"ہاں۔ آسان نہیں ہے۔" اس نے بڑی صاف گوئی سے اقرار کیا۔

"ہوش سنبھالنے ہی جس کے خواب آنکھوں نے دیکھے ہوں جو زندگی کی طویل شاہراہ کا ہم سفر ہو۔ اسے بھولنا آسان نہیں ہے مگر کوشش کر رہی ہوں۔ یہ اللہ کے فیصلے ہیں۔ وہ جوڑے بنا رہا ہے۔ ہم اس کے فیصلے کو چیلنج نہیں کر سکتے۔ اس کی مصطفیٰ دی جانے۔ میں تو اب اپنے لئے بہتری کی دعا نہیں کرتی رہتی ہوں۔ میرے نصیب میں آگے کیا نکلا ہے۔ وقت آ۔ پھر پتا چل جائے گا۔"

گھر کے ماحول پر چھائی انفرادی کو ہر کسی نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ نازش اپنی بی بی صاحبی لندن میں پوری کر رہا تھا جس کی اس کے دونوں بھائی پہلے ہی وہاں چڑھ رہے تھے۔ انہار نے نازش کا وہاں جاگیر لین کر دیا تھا۔ عمران ملک بھی اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ لندن شفٹ ہو رہے تھے۔ ان کے اس فیصلے پر سب کو کچھ حیرانگی کوئی کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا صرف جوا مکیلائی نے انہیں روکنے کی کوشش کی تھی مگر انہوں نے اس کو سمجھا لیا تھا۔

"انسا میرا وہاں مستقل رہنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ جب تک میرے بچے وہاں چڑھ رہے ہیں۔ میں ان کے ساتھ رہوں گا۔ نازش کو ہم اس وقت اکیلے نہیں چھوڑ سکتے۔ اس کو پوری فیملی کی سپورٹ کی ہے اور وہ یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ اس کے بھائی بھی لندن ہیں کہ ہم سب ایک ساتھ رہیں۔ ہم سب ایک ساتھ ہی واپس آئیں گے اور آپ کے پاس اسی گھر میں رہیں گے۔" نازش مکیلائی نے دل کو سمجھا لیا۔ حالات کا تقاضا بھی یہی تھا۔ ان سب کو بخوش جانے کی اجازت دے دی۔ سچ ان سب کی لندن روانگی تھی۔

جانے سے پہلے۔ عوانے نازش سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ یہ پیغام اسے ماہ فور نے پہنچا لیا تھا۔

اسنے مرے میں وہ پہلی دفعہ نازش کے کمرے میں آیا تھا۔ کمرے کی سوائٹ کو اس نے پسندیدہ نظروں سے دیکھا تھا۔ نازش نے اپنے کمرے کی کوئی چیز بیک نہیں کی تھی۔ سب جگہ اس طرح بچا ہوا تھا جیسے اسے نہیں رہنا ہو۔ وہ خود فرش پر دوڑا تو بیٹھی ایک چھوٹے بیگ میں اس ضروری سامان رکھ رہی تھی۔

تری یادوں کے گلاب

"تمہارا کمرہ بہت ٹھیک ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ بہترین اور مکمل۔" اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔

"جھنجھکیس۔" وہ سادگی سے مسکرائی۔

"آپ جیسے پلیز۔"

"مگر تم نے اتنی خوبصورتی سے سجایا کمرہ۔ مکان کو کنڈی کھینچنے کے لئے کھلا چھوڑ دیا ہے وہ تمہاری کوئی چیز باقی نہیں رہنے دے گی۔" عوانے بڑے دوستانہ انداز میں بات شروع کی۔

"نہیں۔ اس کی یہاں کنڈی کھینچنے کا موقع نہیں ملے گا۔ یہ پورا پرش لوکنڈ رہے گا۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔

"اور۔" اچھا! بیکنگ مکمل ہو گئی تمہاری؟" عوانے چپٹے ہوئے کمرے میں ایک طرف دیکھ کر بڑے سوٹ کھینڈ کر دیکھا۔

"تقریباً۔" وہ بیک کھلا چھوڑ کر اپنی اور اس کے مقابلہ دہکی دھری ایڑی چیمبر پر آ بیٹھی۔

"میں تمہارے کام میں خلل تو نہیں ہوا؟" اس نے معذرتی انداز میں پوچھا تو وہ جلدی سے بولی۔

"نہیں۔" بالکل نہیں۔ بلکہ میں تو آپ کا انتظار کر رہی تھی۔" بے خیالی میں کہہ گئی۔ احساس ہوا تو جلدی سی بات مان گئی۔

"آئی مین۔ مجھے آپ کا میسج ملا تھا کہ آپ کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔"

اس کے انداز پر وہ مسکرا دیا۔ بحر خمیدہ ہوا۔

"ہاں۔ مجھے تم سے بے حد اہم بات کہنی ہے۔"

"وہ رک گیا۔ جیسے سوزوں الفاظ ڈھمک رہا ہو۔ بات شروع کرنے کے لئے۔ نازش نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ از حد خمیدگی سے اپنے دونوں ہاتھوں پر نظریں ڈالتے ہوئے بیٹھ گئی۔

"دراصل میں تم سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم نے جس طرح میری خواہش کا احترام کیا ہے اور ایسا فیصلہ کیا کہ کسی کے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔ میں تمہارا ممنون ہوں اور اسی طرح میں بھی تمہاری خواہش کا احترام کروں گا۔ میں تمہیں بانڈھ کر رکھنا نہیں چاہتا۔ تمہیں اپنی زندگی گزارنے کا پورا حق ہے۔ تم جب چاہو گی۔ جس وقت کہو گی میں تمہیں اس نام نہاد بندہ من سے آزاد کروں گا۔"

اور

”کل تمہاری خلافت کس وقت ہے؟“

”طلی المسح پانچ بجے“

”اوکے۔ پھر اللہ حافظ۔ آئندہ مجلس کے اچھے دوستوں کی طرح۔“

حوادث نے چلکے سے اس کا رخسار چھوڑا اور ہار فلک گیا۔ نازش نے آنکھ میں آیا آنسو بے دردی سے صاف کیا۔

”پتہ نہیں۔ میں تمہیں بحول پاؤں کی کر نہیں۔ تم نے نازش کو مار دیا ہے حمار۔ بے سوت مارا ہے۔“

☆.....☆.....☆

اور اب سات سات سال بعد حمار وہاں لوٹ آیا تھا۔ تنہا، غالی دل، تنہا دامن میلا سے شادی کے کچھ دنوں بعد وہ دونوں ایشینس چلے گئے تھے۔ یہ شادی سال بھر بھی نہ چل سکی تھی۔ میلا کے بڑی ماں باپ کو بیٹی کا ایک مسلم سے شادی کرنا نہیں پسند ہو سکا تھا۔ ان کی انتہا سے زیادہ غل غلازی نے دونوں مہیاں بیوی کے درمیان نہ بننے والے اختلافات پیدا کر دیے۔ شادی تو ختم ہوئی۔ ایک طویل عرصے تک حمار کو فانی چنگیں لڑا رہا۔ میلا کے دھوے ان نقض نے اسے اپنی پائی کھناج کر دیا۔ پانسب کچھ لوٹا کے وہ وطن لوٹ آیا۔

حمران ملک کا پورشن ابھی تک لاکھ پڑا تھا۔ حمار کی ہمت نہیں پڑی تھی ان کے بارے میں اپنی ماں سے کچھ پوچھنے کی پچھلے سات سالوں میں وہ گھر والوں سے تقریباً کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس دوران صرف ایک بار ماہ نور اور راضی کی شادی کے موقع پر وہ تنہا ہی بہت مختصر عرصے کے لئے آیا۔ حمران ملک اور ان کی بیگم شادی میں شرکت کے لئے ایک ہفتہ کے لئے آئے تھے۔ دونوں کی رہی رسی ملاقات رہی تھی۔

اور اب اسے آئے ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔ سب لوگ ریجز کے بیٹے کے حقیقی کی غریب کے سلیطے میں آجئے مصروف تھے کہ حمار کو کسی سے غرضت میں بیٹہ کربات کرنے کا موقع کس ملا تھا۔ وہ جانتا چاہتا تھا۔ نازش کہاں تھی؟

اور آج تقریب کے موقع پر سات سات سال کے طویل عرصے کے بعد نازش کو دیکھ کر وہ فوراً ہانپ گیا۔ نہ پایا تھا۔ کس قدر بدل گئی تھی وہ۔

نازش نے بے ساختہ نظریں اٹھا کر حمار کی طرف دیکھا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں کچھ ایسی کیفیت تھی کہ حمار نظریں چراتے پر مجبور ہو گیا۔ نازش نے بھی ذرا دیر بعد نظریں پھیر لیں۔

”گھر والوں کا اتنا سخت رویہ نہ ہوتا تو میں بھی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوتا۔ مگر۔۔۔“ اس نے گہری سانس لی۔

”خیر انہوں نے تو ہمارے لئے کچھ اچھایا سوچ کر فیصلہ کیا تھا مگر وہ شاید ہمارے حق میں اچھا نہ ہوتا۔ ہم ایک دوسرے کے لئے نہیں بنے۔ ہمارے راستے الگ ہیں۔ منزل جدا ہے تم بہت اچھی ہو نازش۔ ایسا پائتھر بڑا در کرتی ہو جو مکمل طور پر تمہارا ہو۔ تمہیں تمہاری ساری خوبیوں، خامیوں سمیت چاہیے اور جب تمہیں ایسی ہستی مل جائے تو دیر نہ کرنا۔ میری طرف سے تم آزاد ہوگی۔ اپنے ہر فیصلے کی مکمل عمار ہوگی۔“

حوادث نے اس کی طرف دیکھا۔ نازش سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ اس کے چہرے کے اثرات تو نہ دیکھ سکا مگر اس کے سیاہ بالوں میں چمکتی ہوئی سیاہ مانگ پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔ ان میں جیسے انفاس کی چمک سی ہوئی۔ ایک لمبے کول طال میں اڑا ہوا۔ یہ لڑکی اس کی منکوحہ تھی۔

اس نے اس کی مانگ میں انفاس بھری تھی۔ نکاح کے وقت۔ وہ بہت چھوٹی سی تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بالوں کو بچوں میں بکڑ کر بڑی خشکوں سے مانگ نکالی گئی تھی اور وہ خود اس وقت لڑکیوں میں ہی تھا مگر اسے اچھی طرح یاد تھا۔ یہ ان کے گھرانے کی رسم تھی۔ وہ اس کی مانگ میں انفاس بھرتے ہوئے شرمناک تھا۔ کسی طرح اچھا آگے نہیں بڑھا رہا تھا۔ آخر کار مانو نے اس کا ہاتھ بکڑ کر یہ دم کروائی تھی۔ اس وقت وہی منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔

اس نے اس لڑکی کی مانگ میں اپنے نام کی انفاس بھری تھی۔ ”اور کچھ؟“ ”پانچ نازش نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”نہیں۔ کچھ نہیں۔“ ”وہ بڑک کر سنبھلا۔ ”ہنس پٹا خیال رکھنا۔“

”اور آج پتا بندہ یاد رکھئے گا۔“ وہ مسکرائی اور اپنی جگہ سے اٹھی۔ ”تمہیں یاد دلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ وہ بھی مضبوطی سے کہنا اپنی جگہ سے اٹھ



نازش کے پاگل خانے میں سوچنے کے لئے بیٹھا جو نہیں۔  
 "رمیز میں کتنے کراہک باروں کی کھوپڑی کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔" وہ اپنے پرانے  
 از میں لوٹ آئی۔

"آیا بھائی دیکھا۔ یہ ہے ان کا طریقہ کار۔" وہ حواد سے ثابت کروانے والے انداز میں  
 "مریض کو اس حویلیا دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ تو نازش کی شکل دیکھتے ہی بے ہوش ہو جاتا  
 ۔۔۔ بس پھر ایک کرائے کا اتھارہ مفت میں کام تمام۔"

"ویری فنی" وہ ناراضگی سے اتھاری کمرنگی۔ جیسی عمران گیا انی جانے کو کھڑے ہوئے۔

"چلو بھئی نازش رات بہت ہوگئی۔ اب چلا جائے۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں ماموں جان؟" اپنا اختیار حواد کے منہ سے نکلا۔

"اپنے گھر۔" وہ مختصر جواب دے کر آگے بڑھے۔

"اپنے گھر۔" حواد نے حیرت سے ہلکے سے دہرایا۔

"ان کا گھر تو ہمیں اس کوٹھی میں تھا مگر....."

سب لوگ ان کے ساتھ ہی اٹھ گئے تھے۔ حواد بھی انہیں باہر تک چھوڑنے آیا۔ ان کے  
 انہوں نے ہی اس نے رانٹیل سے پوچھا۔

"ماموں بیرون ملک سے کب آئے اور یہاں اپنے گھر میں کیوں نہیں رہتے؟"

"وہ تو قرا بھی پچھلے پچھلے ہی نازش کے ساتھ واپس آئے ہیں۔ البتہ شاہد زب اور صمد پچھلے  
 سال سے بڑی اسی کے ساتھ ہیں۔ وہ رہے تھے۔ مگر وہ دونوں بھائی اس کوٹھی میں سب کے  
 نہ رہنا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے آتے ہی شہر کے مضافات میں ایک بنگہ خریدا  
 ۔ مفت ہونے کے بعد قریبی پلاٹ پر ایک میڈیکل کیمپس کی تعمیر شروع کرادی۔ عمارت  
 باکمیل ہو چکی ہے۔ مغرب اس کا افتتاح ہونے والا ہے۔ نازش کا انتظار تھا۔ بس"  
 رانٹیل نے تفصیل جان کر حواد نے غریب سانس لی۔ جانے کیوں ایک پچاس ہی گز کوٹھی  
 ۔۔۔

"شاہد زب اور صمد میل جول بھی رکھنا نہیں چاہتے کیا؟ مجھے دونوں نظر نہیں آئے۔"

"نہیں خیر ایسا کچھ نہیں ہے۔" رانٹیل نے جلدی سے وضاحت کی۔ شاہد زب تو پچھڑی گیا  
 ۔۔۔ سسرال ہے وہاں اس کی۔ اس کی سالی کی شادی ہے۔ بڑے ابوبھی گل جانے والے

وہ دو شیر کی۔ وہ البز پین۔ مگر تے ماہ سال نے اس سے چھین لیا تھا۔ مگر ایک دلہا  
 کشش، ایک دلکش مادہ داخل ہوا تھا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین ہوگئی تھی۔

اتھار سے گردن اٹھائے مناسبت سے ہر کسی سے بات کرتی۔ اپنے آپ کے پیلو میں  
 وہ حواد کو اپنی دھڑ سے بہت دور جاتی لگ رہی تھی۔  
 وہ اب بھی اس کی ہی تھی مگر لگ رہا تھا جیسے اس کی زندگی تھی۔

حواد جس جگہ بیٹھا تھا۔ وہ وہ کر اس کی نظریں نازش کی طرف اٹھیں۔ مگر نازش نے بھول  
 بھی اس پر نگاہ نہیں ڈالی تھی۔

سب مہمانوں کے جانے کے بعد پلا خراسے ان کے قریب بیٹھے کا موقع ملا تھا۔ س  
 لوگ تھک جانے کے باوجود خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ بڑے عرصے بعد اکٹھے ہوئے تھے۔  
 "تم آج کل کیا کر رہی ہو نازش؟" حواد نے مخاطب کرنے میں پہل کر لی ڈالی۔

"یہ بگڑنے ہوئے دماغوں کو درست کرنے کی تیاری کر رہی ہے آج کل۔" جواب دہ  
 نے دیا تھا۔

"رمیز؟" نازش نے حواد کو کرا سے فو کا۔

"ایک بیٹے کے باپ بن گئے ہو۔ بات کرنا ابھی تک نہ آئی نہیں۔"

"کیوں میں نے کیا غلط کیا؟" وہ گڑھا۔

"کبھی نہیں سدھروں گی۔"

حواد نے بگھنے والے اعزاز میں دونوں کی طرف دیکھا رہا۔ رمیز نے اس کی مشکل آسان کی۔  
 "یہ بی بی۔ خیر سے بخیر دوسر جن بن گئی ہیں۔ پاگل خانے میں بھرتی کا کھلا دعوت ہے،  
 جاری کر دیا ہے مگر پاگلوں کو کبھی اب اتنی عقل آگئی ہے کہ نازش کے پاگل خانے میں بھرتی ہونے  
 سے پہلے ایک بار سوچیں گے ضرور۔"

رمیز کے بچے نازش نے دانت پیسے۔ حواد بے اختیار ہنسا۔ اور رمیز نے نازش کی طرف  
 دیکھے بغیر جان جاری رکھا۔

"تو اب یہ کرتی کیا ہیں کہ مریض کی کھوپڑی کو ل کر بیٹھا باہر نکال کر میز پر رکھ دیتی ہیں،  
 زیادہ تر واپس دیکھنا بھول جاتی ہیں وہ تو ان کے خاندان کے ساتھ لگ جاتا ہے۔ نتیجہ میں اپنے  
 کے لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اب وہ کہاں جائیں گے؟"

"کس خوشی میں؟" وہ بولی تو اپنے آپ سے تھی۔ مگر ڈاکٹر زورین نے سن لیا تھا۔  
 "آج آپ کا پہلا دن ہے۔ اپنے کلینک میں۔ اسی خوشی میں جبکہ خواہشات کے ساتھ۔"  
 "وہ خود آنے تھے؟" نازش نے سرسری انداز میں پوچھا۔  
 "جی کافی دیر آپ کا انتظار کیا۔ ابھی دس منٹ پہلے گئے ہیں۔" نازش نے وارڈ  
 ہالے کو بلایا۔

"یہ پھول باہر جا کر کورڈر میں سجادہ یا سریشوں میں بانٹ دو۔ یہاں سے جانا فوراً"  
 وہ اتنی ترقی میں تھی اور اس قدر سنجیدہ تھی کہ ڈاکٹر زورین کو کچھ اور پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی  
 اس نے فوراً ہی اپنی ڈیوٹی سنبھالی اور اس دن کی اپائنٹمنٹ کی تفصیلات دیے گئی۔  
 کل شام بیڈنگ کپیسٹری کی اقتصادی تقریب میں خاندان کے سب افراد نے شرکت کی  
 تھی۔ سوائے حماد گیلانی کے۔

نازش نے نہ تو اس کا انتظار کیا تھا اور نہ ہی اس کو یہاں کوئی گمان تھا کہ وہ حماد راہیلے کی کوئی  
 کوشش کرے گا۔ اپنی طرف سے اس نے سب کچھ برسوں پہلے ختم کر دیا تھا۔  
 "مگر حماد بذات خود صرف آیا تھا۔ بلکہ اس نے نازش کا انتظار بھی کیا تھا۔"  
 "کس لئے؟" اس نے شک کر سوچا۔

"وہ تمہارا شوہر ہے۔" دل نے لپک کر جواب دیا۔ اس سے جو تعلق ہے جو رشتہ جڑا ہے  
 اس حقیقت کو تم جھٹکا نہیں سکتیں۔ اور مان لو کہ تم جی اسے بھول نہیں پائیں۔  
 نازش نے دونوں ہاتھوں سے کپٹیاں دبائیں۔

"کیا بات ہے۔ ڈاکٹر۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔" ڈاکٹر زورین کافی دیر سے اس کے  
 چہرے کے اتار چڑھاؤ اور غصے اور رخ کی تبدیلی کی کیفیت کو جانچ رہی تھی۔  
 "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ چھٹ کو بلائیں۔" وہ سنبھل کر پوری طرح مستعد ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"میں نے جسبیں دہش کیا تھا۔ کم از کم شکر یہ تو ادا کر تیں۔"  
 "رات کے بارونچاز ہے تھے اور وہ اپنے کمرے میں سونے کے ادا اے سے جانے کو ابھی  
 تھی۔ جب یہی ٹی فون کی بیل پر پاس گزرتے ہوئے نازش نے رو بیسوار اٹھایا اور اس کے پیلو کہتے  
 ہی حماد نے ادھر سے شکایت کر دی۔"

تری یادوں کے گلاب  
 ہیں۔ شادی میں شرکت کرنے اور صحتوزی دیر کے لئے آیا تھا۔ اسے کسی اور ڈر پر بھی جانا تھا۔  
 تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ دادو کے پاس تو بیٹھا ہوا تھا۔"  
 حماد کو یاد آیا۔ اسے لگتا تو ہوا تھا صدمہ کو کہ مگر صحتی لا تعلق سے بیٹھا تھا کہ حماد کو اپنا ہوا  
 بدلتا ہوا تھا۔

"نہیں میں نے اسے پہچانا نہیں۔ شاید وہ بھی مجھے پہچان نہیں سکا۔ ایک طویل عرصہ بھی  
 گزر گیا ہے۔ سب لوگوں کو چھڑے ہوئے۔"  
 حماد کے لہجے میں یاسیت تھی۔ جب سے واپس آیا تھا ایک لہلہ میں مگر اب ہوا تھا۔  
 "مگر اب سب ہی واپس لوٹ آئے ہیں۔ تم، بے باور، اپنی پوری فیملی سمیت۔" رانا  
 نے بیٹاشت سے کہا۔

"دادو اس وقت جتنی خوش ہیں۔ پچھلے کئی سالوں میں میں نے انہیں اتنا خوش نہیں دیکھا  
 ان کی سب اولادیں ان کی نظروں کے سامنے ہیں۔"  
 "مگر ان کی جیتی تو ان کی نظروں کے سامنے نہیں۔" وہ افسردگی سے مسکرایا۔  
 "کون جیتی؟" رانا بیل سمجھ نہیں تھا۔

"وہ نازش" اس کا نام لینے ہی نظروں میں اس کی صورت محو مگی۔ حماد کے لبوں پر وہ  
 مسکراہٹ تھی۔

"ہاں..... وہ....." رانا بیل نے حماد کی طرف خاص طور سے دیکھا۔ وہ بکھرا ہوا  
 لگ رہا تھا۔

"مگر دادو اسی میں خوش ہیں کہ وہ ان کے شہر میں تو ہے۔ چند میلوں کے فاصلے پر۔"  
 "اور اب یہ فاصلہ بھی منٹ جائے گا۔ نازش کو اس گھر میں آنا ہوگا اور میں اسے ہر صبح  
 میں واپس لے کر آؤں گا۔" حماد نے ایک عزم سے سوجا۔  
 "یہ بھول گئی نے جیسے ہیں؟"

"نازش نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی سرخ گلابوں سے اپنی ہر بھری دیکھی  
 جیسے والے کا کوئی کارنامہ پا کر پلٹ کر اپنی اسٹنٹ ڈاکٹر زورین سے پوچھا۔  
 "مسٹر حماد گیلانی تھے۔" وہ مسکرائی۔  
 ایک چل کو نازش کا دل ڈکا پھر جیسے سارے بدن میں گرمی بھر دوڑی۔



”شکریہ۔ ویسے اس کی ضرورت نہیں تھی۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

”ضرورت تھی یا نہیں تھی تم اس کے چکروں میں نہ چڑو۔“ تو وہ بے تکلف ہوا۔

”خیر یہ بتاؤ۔ ان بچاروں کا حشر کیا ہوا۔ ڈسٹ بن کی ضرور ہو گئے کیا؟“

”پھولوں کا کیا قصور تھا جو میں انہیں ڈسٹ بن میں پھینکتی۔ ویسے بھی اتنے خوبصورت

پھول پھینکے کیلئے نہیں ہوتے۔“ نازش نے اسی ناراضی ٹون میں کہا مگر حواد کو پیسے خوش فہمیوں نے گھیر لیا۔

”اوہو۔ تو تم نے انہیں اپنے کمرے نہ جایا۔“ وہ ہلک کر بولا۔

”نہیں“ نازش کے بدن میں گرہ لہرا اٹھی۔ مگر بڑے قہر سے بولی۔

”ان کے صحیح مقام تک پہنچا دیا۔“

”مطلب؟“ وہ سمجھا نہیں۔

”مریاضوں میں بانٹ دیے۔“ وہ اسی انداز میں بولی۔

حواد لہلہے جھروکا بالکل خاموش رہ گیا۔

”نازش میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔“ ڈرلور بعد وہ دھڑیر سے بولا۔

”میری اسسٹنٹ سے اپائنٹ لے لیجئے۔“ ترت جواب دیا۔

”میں پاگل نہیں ہوں۔“ وہ بھنا گیا۔

”نہ مجھے اپائنٹمنٹ کی ضرورت ہے۔“

”میں صرف پاگلوں کو تو نہیں دیکھتی“ وہ ہلکے سے ہنسی۔

”بہت سے ہوش مندوں کو بھی علاج کے لئے میرے پاس آنے کی ضرورت پڑتی ہے۔“

اب وہ صاف مذاق اڑا رہی تھی۔

”میں ہوش مندوں میں سے نہیں ہوں“ وہ فحشا ہوا۔

”اور تم کچھ کر بھی انہاں نہ سو۔“

نازش بھی خندید ہوئی۔

”آپ گھر آ جائیے کسی دن بھی میں رات نو بجے کے بعد گھر پر ہی ہوتی ہوں۔“

”میں.....“ وہ حیرت زدہ ہوا۔

”گھر آ جاؤں؟“

”ہاں..... اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟“ وہ سادگی سے بولی۔

”ماسوں..... مہمانی“ وہ زکا۔“ آئی میں، ان کو اعتراض نہیں ہوگا؟“

”انہیں اعتراض کیوں ہوگا۔ حواد۔ آپ ان کے بھانجے ہیں۔“

”میں ان کا دادا دادی تو ہوں۔“ حواد کے بتانے پر نازش خاموش رہ گئی دل میں

بوچھال سا آیا۔

”اس رشتے کا حواد دیے بغیر آپ ان سے کسی وقت بھی مل سکتے ہیں“ ڈرلور میں ہی وہ

اپنے اوپر کا پورا پورا جھگڑا تھا۔ مگر اس کے لہجے میں بالکی لڑش حواد نے محسوس کر لی تھی۔

”اور میں اس رشتے کے حوالے سے ہی ملنا چاہتا ہوں۔“ حواد کے لہجے میں جو کچھ تھا۔ اس

نے نازش کو سنے سنے سے تپا دیا۔

”میں اپنے گھر کے علاوہ اور کہیں باہر آپ سے نہیں ملوں گی۔“ اس نے اپنا ہوجھنڈا رکھنے

کی کوشش کی۔

”نانو کے گھر بھی نہیں۔“ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

”نہیں۔“ اس نے مضبوطی سے کہا اور آہستگی سے فون بند کر دیا۔

☆.....☆.....☆

”اب تم اتنی مصروف ہو گئیں کہ پڑوسی دلوں سے ملنے کا وقت بھی نہیں رہا۔ تمہارے پاس۔“

”دادو۔“ نازش نے فی الفور ٹوکا۔

”آپ پڑوسی نہیں ہوئیں۔“

”کتنے دن ہو گئے شکل نہیں رکھائی۔“ وہ اور فحشا ہوئیں۔ انہوں نے نازش کے ٹوکے کا کوئی

توجہ نہیں لیا۔

”کوئی فرق نہیں آیا میری شکل میں۔“ طہیخانہ رحمن ویسی کی ویسی ہوں؟“

”اچھا اس بات نہ نالو۔“ انہوں نے ڈرائسٹکی سے ڈانٹ دیا۔

”یہ بتاؤ کب آرہی ہو۔ آج یا کل۔“

”آج یا کل۔“ وہ سوچ میں پڑی۔

”مشکل ہے دادو۔“ آپ آ جائیں میں میرے پاس بلکہ اب میرے پاس ہی رہا

کر میں۔“ نازش نے بیٹھ کی طرح ضد کی۔

مگر نازی بیگم بھی ایک اہل خانہ تھیں۔

”میں اچھا گھر نہیں چھوڑ سکتی۔ ایک دن بھی میرا دل نہیں لگتا۔ میری مجبوری سمجھو۔

بس کل تم کو آنا ہے۔ میرے لئے وقت نکال کسی طرح۔“

”اچھا دادو۔ کوشش کرتی ہوں۔“ دوسری ہوئی آواز میں بولی۔

”کوشش نہیں“ انہوں نے فوراً بولا۔

”کل تم کو کچھ میرے ساتھ کرنا ہے۔ میں انتظار کروں گی۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ نازش کو جھپٹا ڈالنے پڑے۔

”مگر رات تک نہیں راتوں کی شام کو مجھے ہاسٹل جانا ہوگا۔ ابھی بیماری ہوں پھر ناراض

مت ہو جائے گا۔“

”تم آؤ تو سہی مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“

”دادو کے ارادے خطرناک لگتے ہیں۔“ نازش نے فون بند کرتے ہوئے گہری سانس بھری۔

”اور مسٹر حاد۔ تم کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔ دادو کی سیر می بنا کر مجھ تک پہنچنے کی ہر کوشش

نا کام ہوگی تمہاری۔“

دوسرے دن دوسرے مریضوں سے فارغ ہوتے ہی دادو کے پاس چلی آئی کوشش کے باوجود

اسے دیر ہوگئی تھی۔ نازی بیگم جلدی کھانا کھانے کی عادی تھیں۔ مگر اس کے انتہار میں اب تک

بھری بیٹھی تھیں۔

”آپ نے کھانا کھا لیا ہو دادو۔“ نازش نے شرمندگی سے کہا۔

”کیسے کھا لیتی؟“ جھپٹیں کھانے پر بالیا تھا۔ تمہارا انتہار نہ کرتی“ انہوں نے بڑی محبت

سے کہا۔

”چلیں پھر قافان شروع کریں۔ اور سب لوگ کہاں ہیں دادو؟“ اس نے ہر طرف نظر

دوڑائی کھانے کی بھرپور صرف دوسری دونوں تھیں۔

”میں نے صرف جھپٹیں ڈالوائے کیا تھا۔“

”اور۔۔۔ اور میں بھی وقت پر نہیں پہنچ سکی۔“ وہ سے سے شرمندہ ہوئی۔

”کیا کروں دادو۔۔۔ میرے ساتھ تو یہی مسئلہ ہے ابھر چکی ہو جائے تو نہ کھانے کا وقت

ہوتا ہے نہ ہوش۔“

”جی تو صحت کا یہ عالم ہے۔“ وہ بچہ اور ہوئیں۔

”ہائیں۔ میری صحت کو کیا ہوا۔ ابھی چلی تو ہوں۔“ وہ حیران ہوئی۔

”خاک ابھی چلی ہو۔ رنگ کتنا کم ہو گیا ہے تمہارا بدن سے آئیں جس تو کیسا گھلا بی گلابی

رنگ ہوا چہرہ تھا۔ اور آپ؟ آئینہ دیکھتی ہو؟“ جھپٹے پڑے ہیں آنکھوں کے گرد جانے نیند بھی پوری

نہیں ہو پائیں۔“

”کچھ نہیں ہوا دادو۔۔۔ آپ بلا وجہ پریشان ہو رہی ہیں۔ وہ پوری طرح کھانے میں

کمن تھی۔“

”بیت بھر کر کھاتی ہوں۔ کھڑے بچ کر سوتی ہوں۔ رنگ آپ کو اس لئے کم لگ رہا ہے

کہ یہ جو شہر کی فضا میں آلودگی ہے ناں۔ اس کی ایک جھجکی ہوئی ہے اس وقت میرے چہرے پر

اور جھپٹے شاید اس لئے پڑ گئے ہیں کہ کل رات میں سو نہیں سکی ایک مریض بہت کڑھیکل کنڈیشن

میں تھا۔ مگر آ کر بھی اس کی نگر میں سو نہیں سکی۔ اب اس وقت کہیں جا کر اس کی حالت آٹھپل

ہوئی۔ مجھے سکون ہوا۔ تو جھوک بھی لگ رہی ہے اور نیند بھی آ رہی ہے۔ نہ بدست۔“

نازش ان سے نظریں ملانے بغیر بولتی رہی اور نازی بیگم کھانے سے ہاتھ روکے اس کا چہرہ

دیکھتی رہیں۔ پھر گہری سانس بھر کر انہوں نے پلیٹ سے ایک لقمہ اٹھایا۔

”ٹھیک ہے کھاؤ کھا کر سو جانا۔ شام میں شوگی تو بات کریں گے۔“

”کیا بات کریں گے دادو۔ بولیں ناں۔۔۔ میں سن رہی ہوں۔“ اس نے لا پر واهی

سے کہا۔

”کھانا تو کھا لو۔ اطمینان سے۔“

”کھا رہی ہوں دادو۔۔۔ ابھی میری کال آ گئی اور جانا پڑا تو آپ پھر ناراض ہو

جائیں گی۔ بات کر لیں ابھی۔“ وہ جلدی کا شور مچا کر انہیں تانا چاوری تھی۔ اور وہ بھوری تھی۔

فوراً اصل بات پر آ گئیں۔

”مجھے تہمدی بڑی فکر رہتی ہے۔ نازش اپنے لئے کچھ سوچا ہے تم نے؟“

”ابھی مصروف زندگی گزر رہی ہے۔ سوچنے کیلئے وقت کہاں ملتا ہے۔ دادو۔۔۔“ وہ دم دم

لجے میں بولی۔

”تو سوچنے کیلئے وقت نکالو بیٹا۔“ وہ آ زردگی سے بولیں۔



"زندگی بہت مختصر ہوتی ہے اور اس کی خوشیاں اس سے بھی کم۔ میں تمہیں ہنستا ہستا اور خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔"

حمار نے آپ سے کہہ کیا ہے۔ دادو؟ "وہ بھی صاف گولی پر اترا آئی۔

"تمہیں اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ مگر میں جانتی ہوں کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ اور وہ خود کہنے کی ہمت نہیں کر پارہا۔"

"سات سال پہلے تو انہوں نے بڑی بہادری دکھا کر اپنا فیصلہ آپ کو سنا دیا تھا۔" وہ سرد انداز میں بولی۔

"وہ اور وقت تھا اور، اور ہی بات تھی۔ اب وقت کی ڈور اس کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

بچپن تو دے اور شرمندگی نے اس کی ہمت تو زدی ہے۔ سچے دنگی ہوں، پریشان ہوں تو ماں پر تڑپ جاتی ہے۔ عرفان بھی جیسے کدو کچھ پر تڑپ گئی ہے۔ حالانکہ حمار نے ماں سے بھی کچھ نہیں کہا ہے۔"

"تو آپ بھی وعدہ کریں دادو پہل نہیں کریں گی آپ۔" وہ قلعی انداز میں بولی۔

"تو کوئی تو پہل کرے گا ماں میرے سچے۔" انہوں نے پیار سے سمجھایا۔

"مگر آپ نہیں۔" اس نے سختی سے ٹوکا۔ "حمار کو ہمت کرنے دیں۔ پہل وہ کریں گے اور

جب وہ آپ سے اپنی ماں سے کہنے کی ہمت کر لیں تو ان سے کہئے گا کچھ سے بات کریں۔ فیصلہ میں کروں گی۔"

نازش کی آنکھیں بھرا نہیں تھیں مگر اس نے کال خوبی سے آنسو لیے۔

"فیصلہ تم ہی کرو گی تمہیں ہمارا اختیار ہے۔ بس میری ایک بات دھیان میں رکھنا۔ کیا وقت واقعی نہیں آتا۔ حمار نے لوٹنے میں سات برس لگا دیے۔ اب تم فیصلہ کرنے میں سات برس نہ لگاؤ۔"

"میں کسی کا ارحار نہیں رکھتی جلد ہی پنکادوں کی۔" اس نے محاسن اٹھا کر محوٹ گھونٹ پانی پیرا۔

نازی بیگم کی شکل دیکھتی رہ تھیں نازش کا اس بات سے کیا مطلب تھا۔ وہ کچھ کچھ سو رہی تھیں۔ دل اٹھانے خدشے سے گلاب اٹھا کر کچھ کہہ نہ سکیں۔

☆ ☆ ☆

تم اگر مجھے اٹھام کرو، جتنی کہ تم ناموں سے ملنے آ رہی ہو تو میں گھر ہی رک جاؤ۔

رات کو حمار نے اسے فون کیا اور چھوٹے ہی شکوہ کر ڈالا۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ دادو نے اکیلے مجھے انوائٹ کیا ہے۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ سب گھر والے ہی موجود ہوں گے۔" اس نے بڑے سکون سے کہا۔ حالانکہ داغ تو کھول اٹھا تھا اس کی اپنا ہمت بھری شکایت پر۔

"مانو بھی بس اپنے نام کی ایک ہی ہیں۔" وہ دھڑ سے ہنسا۔

"تمہارے ساتھ تمہارے گھر والے کو بھی انوائٹ کر لیتیں تو کیا گڑباجا ناں کا۔" اس نے گھر والے پر زور دے کر کہا۔

نازش خاموش رہی۔ کوئی جواب نہ پا کر وہ عجیبہ ہوا۔

"نازش میں تمہیں انوائٹ کر رہا ہوں۔ کل رات داغ میرے ساتھ کرو۔ مگر یہ یا نہیں باہر۔۔۔ جہاں تم چاہو۔"

حمار دھیرا خیال ہے کہ میں آپ کو پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں آپ سے باہر نہیں نہیں ہوں گی۔" وہ دھڑ سے مجھے میں مگر مضبوطی سے بولی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ فوراً مان گیا۔

"تو گھر پر رکھ لیتے ہیں۔ میں پک کر لوں گا تمہیں کس وقت فارغ ہوں گی۔"

حمار کی اس کج ادائی پر نازش کو بری طرح ناؤ آیا۔ اس کی بات کا مطلب کچھ کر بھی وہ ایمان نہ رکھتا تھا۔

"حمار میں جتنی باتیں نہیں ہوں کہ اپنے ہی ٹیٹس کے علم میں لائے بغیر آپ کے ساتھ ڈنر کے پروگرام طے کرتی پھر دوں۔" وہ بڑبڑ کر بول اٹھی تھی۔

"خیر یہ تو نہ کہو۔" وہ دھڑ سے ہنسا۔

"تم سختی بال اختیار ہو اس کا مظاہرہ تو تم سات سال پہلے اپنے شوہر کو دوسری شادی کی اجازت دے کر چکی ہو۔"

نازش چپ کی چپ رو گئی۔ حمار کو خود ہی احساس ہوا اس نے تلو وقت پر تلو بات کہہ دی۔

"سواری میرا مطلب تمہیں برت کرنا نہیں تھا۔ میں تمہیں صرف یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ ہمارا رشتہ برقرار ہے۔ ہم ساری زندگی ریل کی پٹریوں کی طرح متوازی چلتے چلتے نہیں گزار سکتے۔ ہمارا ملنا ایک دوسرے سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔" حمار نے بہت ہی سنجیدگی سے کہا۔





تری یادوں کے گلاب

فیصلہ کرنا تھا کھنٹھن نہیں ہوتا نازش، میں جانتا ہوں۔ فیصلے کا انتظار کیسا جان لیوا ہوتا ہے۔  
 "سب کو اپنے اوپر بڑی آزمائش زیادہ کھنٹھن لگتی ہے۔" نازش نے دھڑکنے سے کہہ کر رخ چھڑایا۔ حوالہ خاموش رہا تھا۔ نازش نے بھی پھر اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ اس وقت چوکی تھی جب حوالہ نے گاڑی اس کے پسندیدہ ریستورانٹ کے سامنے روکی تھی۔ برسوں گزر جانے کے بعد نازش کو اب بھی یہاں کا کھانا بہت پسند تھا۔ اور یہاں کا ماحول بہت پر سکون تھا۔ وہ دونوں بال کے کونے میں چلے آئے جہاں پر نسبت زیادہ پرانی سی تھی۔  
 "کیا کھاؤ گی؟" حوالہ نے مینو کا ردھو کھولتے ہوئے نازش کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے ہارڈ کو چھوا بھی نہیں تھا۔  
 "کچھ خاص نہیں۔ آپ اپنی مرضی سے آرڈر کر دیں۔"  
 "یہ فنگل کا اظہار ہے تمہیں تمہاری مرضی کے خلاف ڈفر پر لانے کا؟" وہ مسکرا کر اپنے کارڈ پر جھک گیا۔  
 "نہیں۔" نازش نے ایک نظر حوالہ پر ڈالی اور اپنی بائیں طرف دیکھے ہوئے اکوریم میں جہتی دیدہ زیب مچھلیوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ جیسے ایک اسی کام کے لئے آئی ہو۔ حوالہ آواز نہیں کر رہا تھا۔  
 انتظار میں تھاتی چکن اور فریش گرین سلاد۔ مین کورس میں فریڈیش اور بھاری کباب۔  
 "کچھ؟" حوالہ نے اچانک نظر اٹھا کر نازش سے پوچھا۔  
 نازش اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں کچھ حیرت کچھ الجھن لئے۔  
 "نہیں۔" اس نے بے اختیار نظریں چرائیں۔  
 "تمہاری پسند میں بھولا نہیں ہوں۔" وہ اب دونوں ہاتھوں کی منہ پر غور ڈی ٹکائے پوری غرائس کی طرف متوجہ ہو رہا تھا۔  
 "یہ بھی یاد ہے کہ تم رات کو چال نہیں کھاتیں۔ البتہ یہ نہیں جانتا کہ آنسکریم اور چاکلیٹ سے فیت کا تہہ بار اسی حال بن جائیں۔" وہ ہلکے ہلکے جھٹکے انداز میں بولا۔  
 "نہیں۔ اب وہ حال نہیں رہا۔ چاکلیٹ تو بالکل چھوڑ دی۔" نازش بھی اب کچھ بڑی بھوری تھی۔  
 "یعنی اب تم واقعی بڑی ہو گئی ہو۔" حوالہ نے اسے چھیڑا۔  
 "سلم اور سمارت بھی۔"

تری یادوں کے گلاب

"جنتاب میں سوئی کبھی بھی نہیں تھی۔" وہ جی۔ "اور ویسے بھی اسٹارٹس کا راز آنس کریم اور چاکلیٹ چھوڑنے میں نہیں۔"  
 "پھر کیا راز ہے۔ خوبصورت خاتون؟" اب وہ سوڈ میں آرہا تھا۔  
 "کم کم کھاتی ہوں۔۔۔۔۔ کم سوتی ہوں اور کام نہ زیادہ کرتی ہوں۔"  
 "بائنو کو تم سے یہ ہی شکایت ہے۔ تم اپنا ذرا خیال نہیں دیکھتیں۔ ایک دکھالے کی اشد ضرورت ہے جس میں۔ یہ ہاں تو کا خیال ہے۔" نازش کے چہرے کے تاثرات بگڑتے دیکھ کر اس نے فوراً وضاحت کی۔  
 "سیرا خیال دیکھنے والے بہت ہیں۔" وہ خاص طور پر "بہت" پر زور دے کر بولی۔  
 "بہت۔۔۔۔۔ سے تو کام خراب ہو جاتا ہے۔" حوالہ بھی جو اپنی طرح بولا۔ "بس ایک کافی ہوتا ہے۔"

"خراب کرنے کو وہ ایک بھی بہت سوں سے بڑھ کر ثابت ہوتا ہے۔" حوالہ جی بات پر بڑی رہی۔  
 "تم بہت بدل گئی ہو نازش لیکن ایک عادت ابھی بھی ویسی ہی ہے۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔  
 "یہ تو بہت ہو۔۔۔۔۔ ضرورت سے زیادہ۔"

نازش کی سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر اس نے ہنس کر کہا۔ اور دھڑکی طرف متوجہ ہو گیا جو انداز سرور کر رہا تھا۔ دھڑکی سو جو گی میں نازش خاموش رہی تھی۔  
 کھانا انہوں نے ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتوں کے درمیان ختم کیا۔ کھانے کے بعد حوالہ نے حوالہ کی طرف دیکھ کر کہا۔  
 "نازش۔" حوالہ کے پیار نے پر وہ اپنے دھیان سے لگی۔ ایک نظر حوالہ کی طرف دیکھا۔ حوالہ نے اس اشارے سے کافی لینے کے لئے کہا۔ اس نے اچانک اٹھایا تھا۔ ایک سپ لیکر وہ پھر کم سم ہو گئی۔  
 "کیا سوچ رہی ہو نازش؟"

"کچھ خاص نہیں۔" وہ ہلکے سے مسکرائی۔  
 "مجھے لگا۔ ماضی کی کوئی بات تمہیں اداس کر رہی ہے۔" وہ خوش فہم ہوا۔  
 "نہیں میں ماضی کو فراموش کر چکی ہوں۔" اس نے حوالہ کی خوش فہمی زور کی۔

فراموش کر چکیں۔ اب اتنے عرصے بعد۔" اس نے خاموش ہو کر کندھے اُچکائے۔  
 "اب اتنے عرصے بعد تو میں اس پراخت پر آمنی ہوں کہ آپ کے ساتھ زندگی بتانے  
 کی خواہش کوئی اُشک، کوئی امید ہی نہیں رہی میرے دل میں۔" وہ بڑے سکون سے بولی۔  
 "واٹ ہاں سنس" وہ بے اختیار جھٹکا گیا۔

”یہ کیا مذاق ہے ہازٹس؟“  
”مذاق نہیں حقیقت ہے۔“ وہ خطرناک حد تک خمیدہ تھی۔

”جس میں مجھ سے ذرا بھی محبت نہیں؟“ کچھ دیر بعد وہ بولا۔

”محبت ذرا ایسا بہت سی نہیں ہوتی۔ یا تو ہوتی ہے یا نہیں ہوتی۔“ اس کی عجیبی اور سکون مٹا  
 ذرا فرق نہیں آتا تھا۔

”اُد کے، فائِز“ دُورِ جِہاں۔ ”مجھے تم سے محبت ہے۔ شادی محبت۔ تمہیں مجھ سے محبت ہے انہیں۔“

”کبھی تھی۔ بہت شدید محبت، بہت چاہا تھا میں نے آپ کو۔ آپ نے اس محبت کو مار دیا۔ میں پرسوں روئی ہوں۔ بہت تڑپتی ہوں اور بلّا خراپے آپ کو یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئی

کہ مجھے اپنی ہماری زندگی آپ کے بغیر تھا گزارنی ہے۔ آپ کو اپنی زندگی سے نکالنا آسان اور ایک دن کی بات نہیں تھی۔ ان گزرے سالوں میں آپ سوچ نہیں سکتے کہ میں کس کرب سے

گزری ہوں۔ کس طرح میں نے اپنے آپ کو مارا ہے۔ اپنے احساسات اپنے جذبات کو بھگدیا ہے۔ کچھ اس طرح کہ دیر سے دل کا کونہ کونہ ویران چڑا ہے۔ کوئی خواہش نہیں ابھارتی۔ کوئی

آہنگ نہیں چاگتی۔ میں آپ کا احترام کرکتی ہوں۔ خدمت کرکتی ہوں۔ آپ کی نسل پروران جڑ چھا  
کتی ہوں مگر۔۔۔ اس نے خاموشی ہو کر گہری سانس بھری۔

”مگر آپ سے محبت نہیں کر سکتی۔“  
 حوادیک نے اس کی حالت میں بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں تازہ کے چہرے پر جمی تھیں۔

”آپ نے کہا تھاں کہ ہم ایک دوسرے کے لئے نہیں بنے۔ ہمارے راستے الگ ہیں۔“

منزل چلا ہے۔ آنکھ پلٹیں مے ابھی دوستوں کی طرح۔ ”دوڑ سے اردو سے منکراؤ۔“

”ابھی بات ہے۔“ اس نے سر ہل کر نائی کی۔ ”میں بھی اپنے تکلیف دہ ماضی کے سارے درد کو چھوڑ چکا ہوں۔ نئی زندگی شروع کرنے کے لئے یہ بہت ضروری ہے۔ ہارٹس امیں نے تمہیں فیصلے کا مکمل اختیار دیا ہے۔ مگر میں تم پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں Reconcil کے حق میں ہوں۔ ہارٹس نے اس کی بات پوری توجہ سے سنی اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بڑی سچی سی ہنسی تھی۔

”ماضی کو بھول جانا ہی بہتر رہتا ہے۔ مگر مجھے امید ہے کہ آپ ہمارا وعدہ نہیں بھولے ہوں گے۔“  
 ”کون سا وعدہ؟“ کب واضح طور پر حواد کے ہاتھ میں لڑا تھا۔

”ایک ہی وعدہ کیا تھا آپ نے اور کیا تھا کہ مجھے یا دلوانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“  
اب وہ نظریں نہٹکا کر اپنے کپ پر انگلی بچھ رہی تھی۔

”اوہ..... اس ہجرت پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔“ عہد نے گپ میز پر دیکھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں ہوا۔ ایک جھنجکی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں پر دم توڑا۔

”تمہارے گریز سے مجھے سمجھ لینا چاہئے تھا۔ مگر دل کو خوش فہم ہونے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ بھول گیا تھا کہ سات سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ درمیان میں ایسے فیصلے تو لکھوں میں بھی

ہو جاتے ہیں۔ وہ چند ساعتوں کے لئے خاموش ہوا۔ نائٹ پر ایک مہر پر جا چٹکی ہوئی نظر آئی۔  
 ”تو کوئی اور آ چکا ہے تمہاری زندگی میں؟“

”میں.....“ وہ ہلکا ہلکا ہنسی۔  
 ”میںیں تک سوچ جا سکتی ہے تم مردوں کی۔“ تھانو کے چہرے پر الجھن کے آثار ابھرے۔

”میں آپ سے منسوب ہوں حماد کسی اور کی جانب دیکھنے کی جرأت کیسے کر سکتی ہوں۔ نہ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ میرے لئے تو کسی فیکر کا تصور کرنا سواہلنِ رواج ہے۔“ وہ مشتعل ہوئی تھی۔

”تو پھر؟“ خدا نے سکون کا سانس بھرا۔  
 ”اچھے سال بعد تمہیں یہ دودھ یاد دلانے کی ضرورت کیوں پڑی جبکہ ہم Neconicle

کی کوشش میں ہیں۔“  
 ”ہم نہیں صرف آپ۔“ ہارٹ نے جھنجکی کی۔

”او کے صرف میں۔“ دوزخی سے بولا۔  
”مگر تہارے پاس کیا جواز بنتا ہے۔ علیحدگی کا۔ کوئی تیسرا اور میان میں نہیں۔ ہاشم



تری یادوں کے گلاب

”میں نے آپ کے ارشادات کو پلو سے باندھ لیا۔ کسی دھنچکی کی طرح چوبیس گھنٹے ورد کا اور اپنے آپ کو چار کر لیا کہ مجھے اب ساری زندگی اپنے والدین کے گھر اپنے بھائیوں کے پاس رہنا ہے کیونکہ یہ تو طے تھا کہ کسی اور کی کوئی گنجائش نہیں میری زندگی میں۔ تو اب وہی میرا گھر ہے۔ وہی میری فیمل ہے۔ وہ سب مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں اور مجھے خوش لاؤ آ باد دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان سب کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اگر میں آپ کے حق میں فیصلہ کرتی ہوں تو کیا آپ ایسی شریک حیات کو قبول پائیں گے جو جذبات و احساسات سے عاری محبت سے خالی وجود ہے کہ آپ کی زندگی میں داخل ہو رہی ہو۔ محبت کے بغیر زندگی کا لہاسفر کا نا بہت مشکل ہے۔ یہ پل دو پل کا ساتھ نہیں۔ ساری عمر کا سورا ہے۔ آپ پہلے ہی ایک ناکام شادی کا دکھ چھیل چکے ہیں۔ سوئی لیجئے حواء۔ ہم جذباتی عمر سے گزر چکے ہیں۔ ہماری سوچ پختہ ہے ہم ہاشعور ہیں۔ آپ بھی سمجھتے ہوں گے کہ آپ کسی سے زبردستی محبت نہیں کر سکتے۔“

بال حواء کے کورٹ میں پھینک کر وہ خاموش ہو گئی۔ تو حواء نے گہری سانس بھر کر کرسی کی پشت سے ٹپک لگائی۔ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھتے ہوئے دو بھر چراغاں میں مسکرایا۔

”میں سمجھتا تھا کہ تم کافی عقلمند ہو گئی ہو۔ مگر تم تو دیکھی کی دیکھی ہو۔“

”کیا مطلب؟“ حواء کا خلاف توقع رد فعل اور اس کے پہلے نازش کو تباہ کر دیا۔

”مطلب یہ کہ میری بیانی سی جہی۔“ نازش نے تڑپ کر بات کہی۔

”اے کسکے زنی۔ میں آپ کی جہی نہیں ہوں۔“

”اچھا۔“ اس نے بڑی دلچسپی سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

”پھر کیا ہو؟“

”سو کا لڑ سگود۔“ اس نے ہنک کر بتایا۔

”اللہ اکبر۔“ وہ بے اختیار ہنسا۔

”تم نے میری ہر بات یاد رکھی ہے۔“ طعن پر طعن دہی ہو۔ کیسے کہہ سکتی ہو کہ مجھے بھول گئی ہو؟“

”میں نے بھولنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ صرف یہ واضح کیا ہے کہ.....؟“

”محبت نہیں کرتی اب۔“ وہ لچ میں سے اس کی بات لے لڑا۔

”لیجی محبت بھی نہیں کرتی محبت مرئی نہیں سکتی۔“

اس نے محبت پاش انکھروں سے نازش کو دیکھا۔ وہ بھی روٹھی روٹھی اس کو دیکھ رہی تھی۔

تری یادوں کے گلاب

محبت تو اللہ تعالیٰ کا ایک بیش بہا تحفہ ہے جسے چاہے لواز دے۔ اللہ نے تمہیں اس تحفے سے نوازا تم نے مجھ سے لگی اور گہری محبت کی اسی کا تحفہ تھی۔ اللہ تم سے اپنا تحفہ ابس کیسے لے سکا ہے۔“

نازش نے پلکیں جھپک کر آنکھ میں آئے آنسو روکنے کی ناکام کوشش کی۔

”اہلہ میں تمہاری اس محبت کا مقروض ہوں۔ تمہارے ان قیمتی آنسوؤں کا مقروض ہوں۔“

نہم نے مجھے بھلائے کی کوشش میں بے درنگی اٹھائے۔ میری بے وفائی کا پیاؤ صیبا دکھتم نے اٹھایا۔

”میں۔۔۔ میں اس دکھ کا مقروض ہوں اور میں ساری زندگی تمہارا قرضہ چکا رہوں گا۔ مگر تمہیں وہ بارہ کھونے کی غلطی ہرگز نہیں کروں گا۔“

حواء نے نازش کے آنسو اپنی پوروں پر لئے اور مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

☆.....☆.....☆

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk

نہ ہوں کہ یہ تصویر اپنے اخبار کو نہیں دوں گا۔"

"ایک بات کچھ نیچے مسٹر یوسف! اگر آپ نے میری یہ تصویر اخبار میں چھاپی تو میں آپ نے خلاف کس کر دوں گی۔"

"نہیں چھاپوں گا۔ آپ سے وعدہ کر چکا ہوں۔ لیکن اگر تصویر اچھی ہوئی تو ایک تصویر آپ کی مذرت کو کر سکتا ہوں۔" یوسف نے ابھی تک ہنگی کی کسی بات کا نہ ٹھیکس مانا تھا۔

"جی نہیں۔ مجھے نہیں چاہئے کوئی تصویر۔ آپ اس قلم کو جلا دیجئے جس میں میری یہ تصویر موجود ہے۔"

"یہ بہت مشکل کام ہے محترمہ! کیونکہ اس میں اور بھی بہت سی تصویریں ہیں، جیسے ہاں! اور دل میں سے آپ کی تصویر نکال کر میں ضرور جلا دوں گا۔" یوسف نے کہا اور پھر لا پراہی سے آگے بڑھ گیا۔

ہنگی غصے میں اپنی جگہ کھڑی رہی۔ لیکن پھر کسی نے اسے مخاطب کیا۔ یہ کالج ہی کی ایک لڑکی تھی۔ وہ اس کے بعد وہاں سے آگے بڑھ گئی۔ پھر تین چار دن گزر گئے اور ایک دن اس وقت جب ہنگی کالج کے گیٹ سے اندر جا رہی تھی۔ اسے یوسف نظر آیا۔ عام طور پر اسے وہ اس وقت نظر آتا تھا جب وہ گھر سے باہر نکل کر کالج جانے کے لئے چل پڑتی تھی۔ لیکن پچھلے چند روز سے وہ اسے نظر بھی نہیں آیا۔ وہ جرات مندانہ انداز میں آگے بڑھ کر بولا۔

"آپ کی تصویر اتنی اچھی بنی تھی۔ محترمہ! کہ میری بہت نہیں ہوئی کہ میں تصویر جلا دوں۔ یہ ایک فوٹو بنانے کے بعد میں نے نیکھنے ضائع کر دیا ہے اور یہ ایک تصویر صرف آپ ہی کی مذرت نے کی جرات کر رہا ہوں۔ مجھے صاف فرما دیجئے گا۔" اس نے تصویر آگے بڑھائی تو ہنگی کا اٹھ بے اختیار آگے بڑھ گیا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ اسے اپنے آپ کو دیکھنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ پھر اس نے تصویر دیکھی اور اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تصویر اتنی خوبصورت ہوگی۔ یوسف اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے کیمرے کو سنبھال ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ ہنگی صبر کر رہی تھی اس نے یوسف کی طرف توجہ بھی نہیں دی تھی۔ تصویر اس طرح اس کی نگاہوں میں صاف گئی تھی کہ اس پر سے نگاہیں ہٹانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ پھر جب تصویر دیکھنے سے جی ہو گیا تو پھر اس نے چونک کر یوسف پر نگاہیں ڈالیں۔ لیکن وہ تو جا چکا تھا۔

ہنگی اپنی تصویر دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اتنی خوبصورت تصویر..... وہ تو خود ہی اب تک سوچتی

## بڑی آرزو تھی ملاقات کی

فوٹو گرافروں کی فلیش بار بار چمک رہی تھی۔ پروگرام شروع ہو چکا تھا اور کالج کے بڑے بڑے اساتذہ آنے والے مہمانوں کی خاطر محارت میں لگے ہوئے تھے۔ ہنگی بھی آرمین ٹیچنگ کیمپلی میں شامل تھی۔ سینے پر کالج کا موٹو گرام سجائے ہوئے وہ دوسرے سے ادھر بھاگی بھاگی پھری تھی۔ اور جو کام اس کی نگاہوں میں آ جاتا وہ چمک رہی تھی کہ اچانک کسی کیمرے کی فلیش گئی کی تھی لائٹ اس کے چہرے پر بھی پڑی اور وہ چونک گئی۔ اس نے پلٹ کر اس فوٹو گرافر کو دیکھا جس نے اس کی تصویر بنائی تھی اور پھر یوسف کو دیکھ کر اس کے چہرے پر غصے کے دمک لہرا گئے۔

یوسف اس کے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک گھر میں رہتا تھا اور اکثر کالج آتے جاتے کتنی ہی بار اس سے سامنا ہو چکا تھا۔ دونوں کے درمیان سلام دعا کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن یوسف کے بارے میں کتنی ہی بار ہنگی نے اس انداز میں سوچا تھا کہ جیسے یوسف خالص طور پر اس کے سامنے آتا ہو۔ اس سے پہلے ہنگی کی ایک ایسی تصویر بنائی تھی جس میں وہ بالکل الگ تنہا تھی۔ ہنگی غصے میں آگے بڑھی اور اس کے قریب پہنچ کر بولی۔

"یہ کیا یہ تیزی ہے۔ کیا تم نے مجھ سے تصویر اتارنے کی اجازت لی تھی؟"

"میزم میں پریس فوٹو گرافر ہوں ہمیں کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

یوسف نے اٹھٹائی سے کہا۔

"ہوں۔ پریس فوٹو گرافر۔" ہنگی غصیلے لہجے میں بولی۔

"آپ چاہیں تو میرا کارڈ کچھ سکتی ہیں۔" بہر حال ہنگی کو غصے کے ساتھ حیرت بھی مل رہی تھی۔ بعد میں یوسف نے کہا۔

"اگر آپ میری اس بات سے ناراض ہیں تو میں آپ سے شرمندہ ہوں اور..."





”سو جاؤ بیٹا۔ طبیعت ویسے ہی خراب ہے۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔“

”میں امی ابھی سو رہی ہوں۔“ اتنا کہہ کر اس نے لائٹ آف کی اوزین پر دوران ہو گئی۔  
آٹھ گھنٹے تو بند کر لیں لیکن پھر گھر میں نہایت دیر تک نیند نہیں آئی۔ اور نہ اس کے پاس تصویر کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں یوسف بھی داخل کیا۔ وہ سوئی تو اس کی آنکھوں میں یوسف بسا ہوا تھا اور نہ جانے کب تک وہ اس کی آنکھوں کا قیدی رہا۔ پھر دوسرے دن وہ کالج پہنچی اس کے دل میں خواہش تھی کہ یوسف نظر آئے تو وہ اس کا شکریہ ادا کرے۔ لیکن یوسف اسے اس دن کے بعد کالج میں نظر نہیں آیا تھا۔ جس دن اس نے اس کی تصویر بنائی تھی۔ حالانکہ وہ اس کے گھر کے بارے میں جانتی تھی۔ لیکن اتفاق کی بات یہ تھی کہ آج تک کبھی اس کے گھر جانا نہیں ہوا تھا۔ امی بھی ڈرا ہوں محمد و قہم کی خاتون تھیں۔ پاس پڑوس میں بالکل آس پاس کے گھر والوں سے ان کی سلام دعا تھی اور بس۔ غالباً پانچواں چھٹا دن تھا کہ یوسف اسے نظر آ گیا۔ وہ کالج کے قریب پہنچی ہی تھی کہ یوسف کی اسکوڑاں کے برابر آ کر رک گئی۔

”ہیلو۔ کس جگہ کیسی ہیں آپ؟“ اس نے اس دن پہلی بار اسے براہ راست اس کے نام سے مخاطب کیا۔ وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔

”آپ خبریت ہے تو ہیں کہاں غالب ہو گئے تھے۔“ نہ جانے کیوں اس کے منہ سے یہ اختیار نکل گیا اور اس نے یوسف کے چہرے پر خوشی کے اثرات دیکھے۔

”معافی چاہتا ہوں۔ بس میں سمجھ لیجے کہ بس بہت نہیں پڑی آپ کے سامنے آنے کی آپ جا رہی پڑوسی ہیں۔ میں اس حساب سے بھی آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔“

”میں آپ سے تصویر کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“  
”یہ تو میری خوش نصیبی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو وہ سامنے جو ہوئی ہے وہاں بیٹھ کر میرے ساتھ ایک کپ چائے پیئیں۔ دیکھئے معافی چاہتا ہوں۔ بہت بڑی جرات کر رہا ہوں لیکن ہم سڑک پر کھڑے ہو کر تو بات نہیں کر سکتے۔“

”ٹھیک ہے۔ آپ وہاں بیٹھیں۔ میں دس منٹ میں وہاں آ جاؤں گی۔“ اس نے بڑی اہت کر کے کہا۔ اور یوسف نے بالکل خاموشی سے اسکوڑاں گے بڑھا دی۔

جب وہ سڑک عبور کر کے اس ہوٹل تک پہنچی تو یوسف اسکوڑاں پارک کر کے کھڑا ہوا اس اٹھارہ گراہ تھا۔ دونوں ایک ساتھ ہی ہوٹل میں داخل بھرے اور یوسف نے ایک میز منتخب کر

اس کے لئے ایک کرسی تھپٹ لی۔

”شکر ہے۔“ وہ بولی۔

”اب آپ یہ بتائیے کیا کھانا پسند کریں گی۔“

”نہیں۔ کچھ نہیں۔“

”آپ کس کرم۔“ وہ بولا۔

”ٹھیک ہے۔“ ہنگی نے بے تکلفی سے کہا اور یوسف نے ویز کو بلا کر آٹھ گھنٹے کا آرڈر دے دیا۔ پھر بولا۔

”پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میرے اوپر اس قدر اعتماد کیا۔ ویسے بھی کس جگہ بہت پڑوسی ہیں۔“

”پہلے یہ بتائیے۔ آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟“ ہنگی نے خوشگوار سوز میں کہا۔

”نہیں جناب یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے جس میں دوبارہ عرض کروں گا کہ آخر کار ہم پڑوسی ہیں۔“

”وہ تو ہیں۔ بالکل پڑوسی کی حیثیت سے بھی ہماری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔“

”جب بھی ہو جائے۔۔۔۔۔ اچھا اب آپ مجھے تصویر کے بارے میں بتائیے۔“

”تصویر بہت خوبصورت ہے۔ لیکن میری نہیں ہے۔“

”جی؟“ لاسف حیرت سے بولا۔

”ہاں۔ میں اس تصویر بھی نہیں ہوں۔ تصویر بہت خوبصورت ہے اور مجھے آپ دیکھتی رہے ہیں۔“

”جی ہاں۔ میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ کو گھر ایک بات عرض کروں آپ سے۔ آپ کو یہ تو پتہ ہی ہو گا کہ کمرے کی آنکھ کبھی جھوٹ نہیں پڑتی۔ آپ جیسی ہیں۔ ویسی ہی تصویر آئی ہے۔“

”میں نہیں مانتی۔ آپ کے کمرے نے جھوٹ بولا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ اگر آپ چاہیں تو مجھے بھی جھوٹا کہہ سکتی ہیں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں سو رہی۔۔۔۔۔ ایسی بات نہیں ہے۔ آپ یقین لیجئے کہ آپ نے بہت خوبصورت تصویر بنائی ہے۔“

”اب اگر آپ میری بات مان لیں تو میں آپ سے عرض کروں گا کہ آپ کو دیکھنے کی





”رہا اور ساری رقم اپنے شوق پر خرچ کر دی۔“  
 ”مگر اس کی بھائی ہوئی تصویریں تو شاید کسی فیشن میگزین میں.....“  
 ”ہاں..... بابا ہاں..... سنہ میں جو آتا تھا کہ دیتا تھا۔ کبھی کسی فیشن میگزین سے اس کا کوئی قسط نہیں رہا۔ بس وہ خود کو پریس فوٹو گرافر ظاہر کرتا تھا کہ لڑکیوں کی تصویریں وغیرہ بنانے میں اسے آسانی ہو جائے۔“  
 ”کیا واقعی؟“

”میں نے کہا تھا..... کہ اس نے اپنی ساری زندگی اپنے اس شوق کی نظر کر دی۔ اس کی ایک ہی خواہش تھی کہ وہ بہت بڑا فوٹو گرافر بن جائے۔ دنیا میں اس کا نام ہو۔ کسی رشتے کو نہیں ماننا یہاں تک کہ وہ اپنی ماں کے سطلے میں بھی اس کا کہنا تھا کہ یہ اس کے پاؤں کی بیڑی ہیں جس دن یہ بیڑی ٹوٹ جائے گی وہ آزاد ہو جائے گا۔“ بڑی عجیب سی صورت حال ہے۔ نہانے وہ اور کیا کیا کتنی دہی۔ لیکن ہنگامی پر قیامتیں ٹوٹ رہی تھیں۔

یہ کیا ہو گیا..... یہ کیسے ہو گیا؟ بہر حال وہ وہاں سے چلی آئی۔ اس کا دل خون میں ڈوب گیا تھا۔ یوسف سے اس نے محبت کی تھی۔ اور ہمیشہ یہ محسوس کیا تھا کہ یوسف بھی اسے چاہتا ہے لیکن یہ کیا ہوا؟ کئی دن تک وہ خاموش رہی لیکن ایک دن پھر یوسف کے گھر پہنچی گئی۔ آج یوسف کی بہن شادی کا کافی پریشان تھی۔

”کچھ پتہ چلا یوسف کا؟“

”بالکل نہیں۔ اسی بہت بیمار ہیں۔ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہیں اور اس کی اس کشش کی سخت فخر وہ ہیں۔“

”کہاں ہیں وہ؟“

”ہسپتال میں۔ میں وہیں جا رہی تھی۔“

”میں بھی چلوں آپ کے ساتھ۔“ شاید نے ایک نگاہ اسے دیکھا۔ پھر بولی۔

”آؤ۔ چلو۔“ راستے میں شاید نے کہا۔

”ایک بات کہوں تم سے جتنی؟ اور تو نہیں مانو گی۔“

”نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”کیا تم یوسف سے محبت کرنے لگی ہو؟“

”جی ہاں۔ کون ہیں آپ؟“

”میں اصل میں مجھے یوسف صاحب کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھیں۔“

”وہ تو ملک سے باہر چلا گیا ہے۔“

”جی؟“ وہ دھچک سے روٹ گئی۔

”ہاں..... وہ چلا گیا بہت عرصے سے وہ ملک سے باہر جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔“

”ملک سے باہر؟“ ہنگامی نے بڑے قہقہے سے پوچھا۔ اس کا سر پکڑا سا گیا تھا۔ ”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ وہ اچانک ہی اسے بتائے بغیر اس طرح باہر نکل جائے۔“

”اصل میں وہ اپنی بھائی ہوئی تصویروں کی فرائض کے چکر میں تھا۔ اور اس کا خیال تھا کہ اس ملک میں اسے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچے گا۔“

”لیکن وہ گھر میں بتائے بغیر چلے گئے۔ میرا مطلب ہے۔“

”ہاں..... لیکن وہ اسی انداز کا لڑکا ہے۔ لانا ہالی۔ بے پروا وہ دنیا سے الگ تھک جس روز سے وہ گیا ہے اسی کی طبیعت خراب ہے لیکن خود ہماری کچھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اسے کہاں اطلاع دی جائے۔ بس..... مگر سے چلا گیا اور یہ بھی نہیں بتایا کہ کہاں جا رہا ہے۔ یہ تو صرف میرا اندازہ ہے کہ وہ ملک سے باہر نکل گیا ہے کیونکہ اس نے کئی بار اس کا تذکرہ بھی کیا تھا۔“ یوسف کی بہن کے ایک ایک لفظ پر ہنگامی کو چکر آ رہے تھے۔ لیکن اس نے خود کو سنبھالے رکھا تھا۔

”لیکن لانا ہی آپ نے مجھے اپنے بارے میں نہیں بتایا۔“ یوسف کی بہن نے کہا۔

”جی میرا نام ہنگامی ہے۔ اور میں اسی کتے میں رہتی ہوں۔ آپ کے گھر کے قہوڑے سے

فاسلے پر۔“ ہنگامی نے سامنے اپنے گھر کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

”ارے واہ..... ملاقات ہی نہیں ہوئی آج تک آؤ..... امداد جاؤ۔“ یوسف کی بہن نے

بے تکلفی سے کہا۔ اور ہنگامی اس کے پیچھے پیچھے دوڑ گاتے قدموں سے امداد داخل ہو گئی۔

”میرا نام شاید وہ ہے۔ اور یوسف میرا اکیلا ہی بھائی ہے۔ ماں اکیلی تھیں اس لئے میں

اپنے شوہر کے ساتھ یہاں آ گئی۔ لیکن میں جنہیں یوسف کے بارے میں بتاؤں کہ سچیدگی سے اس

کا دور کا بھی رشتہ نہیں ہے۔ البتہ تمہارا ذکر اس نے گھر میں کبھی نہیں کیا۔ ویسے بھی ایک بات میں

جنہیں بتاؤں۔ صرف فوٹو گرافی اس کا شوق ہے۔ بظاہر وہ کبھی مجھے کسی لڑکی سے متاثر نظر نہیں آیا۔

اس نے اپنے شوق پر بڑے پیچے برباد کئے ہیں۔ اسی کا ایک مکان اور تھا۔ جسے اس نے فروخت



”کیوں پوچھ رہی ہیں آپ۔“ وہ غم آلود لہجے میں بولی۔

”مجھے لگتا ہے۔ میں بھی عورت ہوں۔ اور عورت ہی عورت کی بے چینی کو کبھی کبھی ہے۔ میں جیسے یوسف کے بارے میں بتاؤں۔ وہ کسی کا نہیں ہے اس دنیا میں۔ اس نے جو کچھ بھی تم سے کہا ہوگا۔ وہ سب جھوٹ کہا ہوگا۔ اسے کسی سے محبت ہوئی نہیں سکتی۔ میں تمہارا دل نہیں توڑ رہی۔ اس لئے تم سے کبر رہی ہوں یہ بات کہ تم سنبھل جاؤ۔ وہ ایک دھوکہ ہے۔ یہ بات ایک بہن اپنے بھائی کے بارے میں نہیں کہہ رہی ہے۔ لیکن حقیقت اس وقت میں ایک بہن نہیں ایک عورت ہوں۔“

جنگی خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی۔ شاید نے اسے یہ بھی بتایا کہ انجی کے خاندان کی ایک بہت ہی حسین لڑکی سے یوسف کے رشتے کی بات چلی تھی اور یوسف نے یہ کہہ کر اس لڑکی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ اس لڑکی کا سکرین ٹیس نہیں ہے۔ اس کی تصویر بہت خراب آتی ہے اور کمرے کی آنکھ بھی جھوٹ نہیں بولتی۔ یہ انداز سے بھی اتنی ہی خراب ہوگی جتنی اس کی تصویر خراب آتی ہے۔

بیوقوفی کی بات ہے۔ لیکن اس کا اپنا نظریہ تھا۔ جنگی کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن ایک بات اس کے ذہن میں بار بار ابھرا اور ڈوب رہی تھی۔ وہ یہ کہ اس کی تصویر تو خراب نہیں آئی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اندر سے بھی اتنی ہی انجی ہے جتنی اس کی تصویر ابھی آئی ہے۔ پھر یوسف نے اسے دھوکہ کیوں دیا۔ جبکہ شاید وہ کی باتوں سے تو یہی لگتا تھا کہ یوسف اب تک اسے یہ خوف ہی مانتا رہا ہے۔ شاید وہ شوہر کا فون آیا۔ جس میں اس نے غائبانہ شاید سے کچھ کہا تھا۔ شاید نے فوری طور پر ہسپتال جانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تم میرے ساتھ آئی سے ملے ہسپتال چلتا چاہتی ہو تو شام کو آ جانا اصل میں منظور کرو گے۔“

سے کوئی کام آچرا ہے۔ اس وقت میں وہ نہیں جاسکتی۔

”ٹھیک ہے۔“

”پھر یہ بتاؤ آؤ گی۔“

ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ میں اسی کو دیکھنے ضرور جاؤں گی۔

”میں بھی چاہتی ہوں کہ تم انجی دیکھنے چلو۔“ شاید نے پوچھیں کہ جذبے کے تحت کہا۔ بہر حال وہ وہیں آگئی اور گھر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کا دل گھر میں نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار اسے یوسف کا خیال آ رہا تھا۔ کیا یوسف اتنا برا انسان تھا۔ اس کی کہی ہوئی ایک ایک بات اسے یاد آ رہی تھی۔

یوسف کا جتنا سکراتا چہرہ بار بار نگاہوں میں محسوس جاتا تھا۔ پتہ نہیں یہ سب کچھ کیا ہوتا ہے۔ میں ابھی خاصی اپنا وقت گزار رہی تھی۔ اس دن وہ کھنت میرے سامنے آیا اور اس نے میری زندگی تہہ بالا کر دی۔ جنگی سوچ رہی تھی۔ اس دوران اسی نے کئی بار پوچھا کہ وہ کیوں کم ختم ہو گئی ہے۔ لیکن اسی کے اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

پھر پانچ بجے اس نے ہسپتال جانے کی تیاری شروع کر دی۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے کپڑے تبدیل کئے۔ اور اسی سے صرف اتنا کہا کہ وہ سول ہسپتال تک جا رہی ہے۔

”کیوں، ضرورت، کوئی بیمار ہے کیا؟“

”ہاں..... میری ایک دوست کی اسی ہسپتال میں داخل ہیں۔“ جنگی نے مختصر سا جواب دیا اور کمرے ابھر نکل آئی۔ جب وہ شاید کے پاس پہنچی تو وہ تیاری تھی۔ رکشہ میں بیٹھ کر وہ دونوں ہسپتال چل پڑیں اور پھر یوسف کی والدہ کے پاس پہنچ گئیں۔ یوسف کی والدہ کے کمرے خراب تھے اور وہ بلڈ پریشر کی مریض بھی تھیں۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتیں۔ شاید نے ان کی طبیعت کا پوچھنے کے بعد جنگی کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”اسی یہ یوسف کی دوست ہیں۔“

”دوست؟“ یوسف کی والدہ نے بڑی مشکل سے کہا۔

”ہاں..... میرا خیال ہے۔“ اسی نے لڑکی یوسف سے محبت کرتی ہے۔ ”شاید بہت ہی کھلی زبان کی مالک تھی۔ جنگی چرک کر اسے دیکھنے لگی۔ لیکن شاید نے کسی بات پر توجہ دینے بجھے کہا اور اس کا خیال ہے کہ یوسف بھی اسے پیو کرتا ہے لیکن وہ اسے تائے بغیر ہی یہاں سے چلا گیا۔“

”کیا نام ہے اس کا؟“

”جنگی۔ اپنے ہی محلے میں رہی ہے۔“ شاید نے کہا اور پھر اس نے بہت ہی تفصیل سے جنگی کے بارے میں اسی کو بتا دیا اور یہ بھی بتایا کہ اس کی تصویر یوسف کے کمرے سے بہت ابھی آئی تھی۔“

”پھر..... پھر وہ کہاں گیا۔ اور کیوں گیا؟“

”معلوم نہیں کیوں گیا۔ جبکہ اس نے بار بار یہی بات کہی تھی کہ جس لڑکی کو اس کے کمرے نے پسند کیا وہ اس سے شادی ضرور کرے گا۔“ جنگی کی تصویر بنانے کے بعد وہ اس سے خود ملا تھا اور اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے ایسے ہی ملتا تھا۔ جیسے اس سے محبت کرنے لگا ہو۔“

تری یادوں کے گلاب

”پھر تو ضرور واپس آ جائے گا۔ واپس آ جائے گا۔“ یوسف کی والدہ کے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

”لیٹی رہیں۔۔۔۔۔ لیٹی رہیں امی۔ دماغ پر زیادہ زور دینے کی کوشش نہ کریں۔“ شاہد نے انہوں سے پکڑ کر اپنی ہاں کوٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

بچگی کی صورت حال اس وقت بہت عجیب تھی۔ اسے نبھانے کیوں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ بیمار لڑکوں جھپک کہہ رہی ہیں۔ یوسف ضرور واپس آ جائے گا۔ جب یوسف کی بیمار ماں کو جو اس کی ف سے بالکل ناامید ہو گئیں تھیں، اس سے ملنے کے بعد اس کی واپسی کی امید ہو سکتی ہے تو پھر تو یہی تو بھی اس کی واپسی کا یقین کر لیتا چاہئے۔ کمرے کی آنکھ نے کوئی دی ہے کہ وہ اندر سے ٹوٹا ہوا ہے۔ پھر تو یوسف ضرور واپس آئے گا۔ بہر حال پھر اچانک ہی ایک خیال اس کے ذہن میں آیا کہ اس کے کمرے کی آنکھ نے کسی اور لڑکی کو پسند کر لیا تو کیا ہوگا۔

”کیوں جی تم بتاؤ کیا یوسف واپس آئے گا؟“ یوسف کی ماں نے براہ راست اس سے سوال کر لیا۔ لیکن بچگی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ البتہ شاہد بول پڑی۔

”کچھ نہیں کہا جاسکتا وہ عجیب و غریب فطرت کا مالک ہے۔ وہ کس وقت کیا کرے گا اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل کام ہے۔ بہت ہی مشکل۔“ بہت دیر تک یہ دونوں ہسپتال میں رہیں اور پھر یوسف کی ماں کو تسلی دے کر کہ وہ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گی۔ بچگی اور شاہد مگر واپس آ گئیں۔

”بچگی جب مگر واپس پہنچی تو مغرب کی لڑان ہو رہی تھی۔ نعمان اپنے کام سے واپس آ گیا تھا اس نے براہ راست اس سے سوال کر ڈالا۔

”کہاں گئیں جس تم بچگی؟“

”وہ میں ہسپتال گئی تھی۔ شاہد باہمی میرے ساتھ تھیں۔“ بچگی نے کہا لیکن نعمان کسی شاہد باہمی کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔

”کون شاہد باہمی؟“

”وہ بڑا دس میں رہتی ہیں۔ میرے ان سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔“ بچگی نے کچھ بچ اور کچھ جھوٹ بولا۔ اس نے یوسف کے بارے میں بھی بتایا کہ وہ اپنی ماں کو بتائے بغیر باہر چلا گیا اس لئے اس کی ماں کی طبیعت زیادہ غراب ہو گئی ہے۔ اس نے شاہد کے بارے میں کہا کہ وہ

تری یادوں کے گلاب

اسے بہت عرصے سے جانتی ہے۔ بہر حال نعمان نے اس پر کوئی شبہ نہیں کیا تھا۔ اس دن کے بعد وہ دو ہفتے تک نہ شاہد کے گھر گئی اور نہ اس نے اس کی ماں کے بارے میں کچھ معلومات کی۔ دو ہفتے کے بعد جب اس کے گھر پہنچی تو اس کی ماں بستر پر تھی۔ معلوم ہوا کہ اب اس کی ماں کی طبیعت قدرے بہتر ہے۔ وہ سوری تھیں اس لئے بچگی کی ان سے بات چیت نہیں ہو سکی لیکن شاہد نے بتایا کہ یوسف کا خط لندن سے آیا ہے اور وہ خبریت سے ہے۔ فی الحال اس کی واپسی کا کوئی ارادہ نہیں ہے کیونکہ وہ کسی فوٹو گرافری کی نمائش میں حصہ لینے والا ہے۔ اس نمائش کے بعد ہی شاہد واپس آئے گا۔“

”اوہ! کیا آپ نے اکی کو یہ بات بتادی۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ اسی خط کی بناء پر ان کی طبیعت ٹھیک ہوئی ہے اور میں انہیں ہسپتال سے واپس کھیلے آئی۔“

”بہر ایشاں ہے شاہد باہمی آپ کو اس طرح انہیں نہیں بتانا چاہئے تھا۔“

”کیوں؟“

”بس ایسے ہی۔“

”میں نے انہیں وہ خط بھی دکھا دیا ہے اور اس سے خامی بہتر ہو گئی ہیں۔“ کافی دیر تک وہ شاہد کے پاس رہی۔ شاہد نے اس سے اتنے دن نہ آنے کی وجہ سے شکایت بھی کی اور اس نے بہت سی دھڑا دھڑکی باتیں کہیں تھیں۔ بہر حال یہ لوگ یوسف کے بارے میں باتیں کرتے رہے جب بچگی مگر آئی تو اس کے دل دو دماغ پر یوسف ہی چھایا ہوا تھا اور وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ فوٹو گرافی کی نمائش کے بعد وہ واپس آ جائے۔ بہر حال وقت گزرتا رہا۔ تقریباً ایک مہینے کے بعد یوسف نے لندن سے شائع ہونے والا ایک رسالہ شاہد کے نام پوسٹ کیا۔ یہ رسالہ فوٹو گرافی سے متعلق تھا اور اس نے لندن میں فوٹو گرافی کی ایک نمائش کی روداد بھی شائع کی تھی۔ شاہد باہمی نے بڑے غرے کے بعد یہ رسالہ بچگی کو دیا اور جب بچگی نے رسالے کا سرورق دیکھا تو ایک دم اس کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ سرورق پر بچگی کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ اپنا فوٹو سرورق پر دیکھ کر اس کی جو حالت ہوئی۔ اسے شاید الفاظ میں بیان نہ کیا جاسکے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو اٹھ پڑے تھے۔

”ارے۔۔۔۔۔ ارے بچگی یہ کیا کر رہی ہو۔ جیسے تو خوش ہو رہا چاہئے۔“



جنگی نے اپنے آنسو خشک کر لئے اور بولی۔

”یہ رسالہ میں رکھ لوں باقی“

”ابھی نہیں۔ ابھی تو اسے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ نہ میرے شوہر نے نہ امی نے۔“ اس

تصویر کے بارے میں اندر ایک مضمون بھی ہے۔ بعد میں یہ رسالہ میں جھپٹیں دے دوں گی۔ یہ میرا

دھوہ ہے۔ جنگی بہت دیر تک شاہدہ باقی کے ساتھ رہی پھر گھر آ گئی۔ اس کے بعد وہ ایک ہفتے تک

روزانہ ان کے گھر جاتی رہی کہ وہ رسالہ اسے دے دیں مگر لیکن انہوں نے رسالے کے بارے

میں اتنی سیدھی باتیں بیان کر دیں۔ جنگی کو صاف لگا کہ وہ یہ رسالہ اسے دینا نہیں چاہتیں۔ جنگی شہر

بھر کے ہلکے سٹالوں اور کتابوں کی دکانوں پر اسے تلاش کرتی رہی اور اسے یہ رسالہ بھی نہیں ملا۔ پھر

ایک دن وہ شاہدہ باقی کے گھر پہنچی تو ایک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

”شاہدہ باقی۔ اگر آپ رسالہ نہیں دینا چاہتیں تو مجھے بتا دیجئے۔ میں اسے منگو لوں گی۔“

شاہدہ باقی نے عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھا اور بولیں۔

”جنگی میں جھپٹیں اس کا سر و دق پھاڑ کر دے سکتی ہوں۔ رسالہ میں جھپٹیں نہیں دوں گی۔“

”کیوں شاہدہ باقی! ایسی کیا بات ہے؟“

”جنگی بات ہے جنگی میں نے اس رسالے کا ذکر اپنے شوہر تک سے نہیں کیا۔ نہ امی کو یہ

رسالہ دکھایا۔“

”مگر کیوں؟“ جنگی کا نہ حیرت سے کل گیا۔

”تھماؤ نے اس کیوں کا جواب میرے پاس ہے۔ مگر میں اسے دینا نہیں چاہتی۔ میرے

اس جواب سے تھماؤ دل ٹوٹ جائے گا اور تم جنگی! میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔“

”باقی پلیز! ایک بار مجھے دکھا تو میں آخر کسی کیا بات ہے؟“

”لو۔“ آخر کار شاہدہ باقی نے رسالہ جنگی کے سامنے پھینک دیا۔

”لو اسے چھو اور خود بخوبی کر لو۔“ رسالے میں یوں تو بہت کچھ تھا لیکن تصویروں کے

درمیان پھوٹے جھوٹے مضمون بھی تھے۔ جن پر نشان لگے ہوئے تھے۔ یہ نشان شاہدہ باقی نے

لگائے تھے۔ ایک مضمون رسالے کے اڈیٹر کی طرف سے تھا۔ اور دوسرا مضمون فوٹو گرافر یوسف

کے سلسلے میں تھا۔ جسے رسالے ہی کے کٹر دے لکھا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ

”یوسف پاکستان کا ایک جنوبی فوٹو گرافر ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ

لاکپاں جن کے اسکرین فیس ہوتے ہیں وہ اندر سے بہت

خوبصورت اور باہر سے دیکھنے کے قابل بھی نہیں ہوتیں۔ اس نے یہ

بھی کہا تھا کہ سرفراز پر جس فوٹو کو نمائش میں اول قرار دیا گیا ہے۔

اس فوٹو کے پیچھے جو لڑکی ہے وہ ایسی بھی نہیں ہے کہ جسے نظر بھر کر

دیکھا جائے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ فوٹو گرافر کی دوسری نمائش

میں وہ جس لڑکی کی تصویر رکھنے والا ہے وہ ایک اور لڑکی ہے اور گڈ شٹ

پندرہ سال سے لندن ہی میں رہتی ہے۔ یہ لڑکی اندر سے اتنی حسین

ہے کہ وہ نمائش کے بعد اس سے شادی کرے گا۔“

اس مضمون میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ یوسف کو جتنی رقم اس نمائش کے بعد دی گئی ہے اس کے

مونس اسے برطانیہ کی شہرت بھی مل سکتی ہے۔ رسالہ ہاتھ میں لئے جنگی نے کہا کیا دیکھتی اور سوچتی

رہی تھی۔ پھر اس نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ یوسف باہر سے جتنا خوبصورت تھا اندر سے اتنا

ی بدصورت تھا۔

☆.....☆.....☆

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY  
www.pdfbooksfree.pk

مجھ سے آتا تو گوشت کا سا سن پک جایا کرتا تھا۔

کھانے کی میز پر شاذب اکثر مہنہ بٹاتے کہ میں ہر روز دوسرے دن ایک سی ہانڈی پکا کر رکھ دیتی ہوں لیکن صبح سویرا اٹھکواتے وقت مجھ میں مان کی بھی نہیں آتا تھا کہ آج پھر کیا پکا جائے۔

میدہ نے یہ مشکل بھی حل کر دی تھی۔ اس نے سب کی پسند معلوم کر کے مجھ سے فہرست بنوائی اور پھر ان چیزوں کو سات دنوں پر تقسیم کر دیا۔ اس طرح کبھی میز پر پسند سے نظر آتے تو کبھی وال بھری روٹی۔ کبھی آلو کا بھرت اور کبھی شامی کتاب اور لکڑی کا رایتھ۔

میں میدہ سے اکثر کہتی کرتی

”اوری اس طبقے پر اگر تو اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتی تو کہیں رانی بن کر راج کرتی۔“ کیونکہ وہ نڈل تک پڑھی ہوئی تھی۔

اور میدہ ہر بار ایک سی جواب دیتی۔ ”بڑی بیگم اب پاٹ طبقے اور تعلیم سے نہیں مقدر سے ملتا ہے۔“

میں نے اسے بار بار قائل کرنے کی کوشش کی کہ مقدر کے دوسرے معنی کوشش کے ہیں۔ انسان کے اپنے حالات اور اس کی جدوجہد ہی وہ چیز ہے جس کے تحت کبھی کامیابی ہوتی۔ چاہے کبھی ناکامی لیکن میری یہ دلیل اسے کبھی قائل نہ کر سکی۔ وہ جواب میں کہتی کہتی۔

”بڑی بیگم، اللہ میاں نے ہر انسان کو اس کی ادوات کے مطابق دکھ اور خوشیاں دی ہیں میرے حصے کا یہی کچھ تھا۔ جو مجھے ملا ہے۔ شاید میں اس سے زیادہ کے قابل نہ تھی۔“

اور میں یہ سوچ کر چپ ہو جاتی کہ مصیبت زدہ انسان خود کو بھلائے رکھنے کے لئے کچھ مفروضات قائم کر لیتے ہیں تاکہ دل کے سکون کا کچھ تو سامان ہو۔ پھر میں بحث کر کے ان کا یہ سکون بھی برباد کیوں کروں؟

میدہ ہنسنے میں ایک بار پھنسی لے کر اپنی بیٹی سے ملنے ضرور جاتی۔ کبھی کبھی میں اسے سو پیاس رو پے دے دیتی کہ وہ بچے کے لئے پھل یا سبکٹ خرید کر لے جائے۔ میں نے محسوس کیا کہ بیٹی سے مل کر آنے کے بعد وہ تھنٹوں چھپ چھپ کر روئی تھی۔ میں خود بھی ایک ماں ہوں۔ چنانچہ جہاں میں ماسا کے جذبے کی سرگوشی سے واقف تھی وہاں مجھے اس کے کرب کا اندازہ بھی تھا۔

میں نے کئی بار سوچا تھا کبھی کہ میدہ سے کیوں کہ وہ اپنی بیٹی کو یہیں لے آئے۔ اس مسئلے میں میں نے شاذب سے مشورہ کیا۔ انہوں نے بڑی خوشی سے اجازت دے دی۔ چنانچہ میں نے میدہ

## آئے گا کون ریت کی دیوار تھا منے

خدا بھلا کرے شاذب بیگم کی ملازمہ نور بی کا۔ میدہ کو وہی ملائی تھی۔ میدہ کو ایک نگاہ دیکھتے ہی میں نے اس کی نوکری پہنی کر دی تھی۔

میں نہ کہتی تھی بیگم صاحب کہ آپ کو کام کاج کیلئے بڑی اچھی عورت دوں گی۔ اس چٹاری کا بھی بھلا ہو جاوے گا۔ بٹاری بیچوہ عورت ہے۔“

میں چونکی۔

”اور یہ یہ وہ ہے۔ جی۔۔۔۔۔ جی۔۔۔۔۔ بے چاری، کوئی بچہ بھی ہے اس کا؟“ میں نے دکھ سے پوچھا اور میدہ چپ ہی رہی اس کے بجائے غور ہی ہوئی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ایک لڑکی ہے۔ چھ سال کی ہے غریب“

”کہاں ہے؟“

”جیم خانے میں۔“ اس کے بجائے میدہ نے جواب دیا۔ میں نے دیکھا اس کے زور

چہرے پر مایوسی اور کرب کی سیاہ گھیریں ابھریں اور چہروں دھوس دھواں ہو گیا جیسے دنوں وقت کھل رہے ہوں۔

میں نے اسے قتل دی اور پھر اس نے دھیرے دھیرے چھوٹے چھوٹے سونے کا سون سے لکڑ

بڑے کام تک کچھ اس خوش اسلوبی سے سنبھال لئے کہ میں گھر کے بہت سے کاموں سے ناواقف سی ہو گئی۔ مثلاً دھوئی کو کپڑے سے دھوا دھل کر آنے والے کپڑوں کی مرمت اور انہیں ان کی مناسب جگہ پر رکھنا۔ گھر کے لئے مینے بھر کا سودا اکٹھا منگواتا۔ حتیٰ کہ درز پکتنے والی ہانڈیوں کا تھیں کر لیا گیا تھا۔ اور اب اس کے مطابق ہٹنے کے ساتھ دن مختلف چیزیں پکا کر تھیں اور دس ترخان پر روز ایک نا ڈال دیتا تھا۔ درز پہلے تو روز انسا ہی بات پر تھنٹوں کل کل ہوا کرتی تھی کہ آج کیا کپے گا اور جب کچھ



تری یادوں کے گلاب

سے کہا کہ اب کے جب وہ جائے تو بچی کو سنبھال لے آئے۔ یہ سن کر حیدہ کی چہرے پر گھال سا چہرہ کیا۔ ایسی حقیقت ایسی تباہی میں نے اس کے چہرے پر پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یوں گھٹا تھا جیسے کسی نے بیک وقت اس کے دونوں ہاتھوں پر چاند اور سورج رکھ دیے ہوں۔ وہ پہلے تو ایک نکل جھجھکتی رہی پھر ٹپکیں جھپکا جھپکا کر سسکرائی جیسے یقین کر لیا جا سکتی ہو کہ وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی۔ بلکہ یہ حقیقت ہے اور جب اسے حقیقت کا یقین ہو گیا تو وہ بے اختیار میرے پیروں سے لپٹ گئی۔

”بڑی نیچم! میں آپ کا شکر یہ کس طرح ادا کروں۔ میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔“ اس کے آنسوؤں نے میرے چہرے پر ٹپکنا شروع کیا۔

”افسوس“ میں نے اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

”تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میں بھی اس ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی کہ تمہاری بچی تمہارے پاس آوے اور اس گھر میں رو کر کسی قاتل ہونے لگے۔“

”خدا آپ کی کوکھ غصی رکھے بڑی نیچم اور بٹے بٹیا کو آپکے چپ خوشیاں نصیب کرے۔“ وہ گود پھیلانے لگا۔

ویسے حیدہ اتوار کو صبح ہی بچی سے ملنے چلی جاتی تھی۔ اور پھر شام کو کوئی تھی۔ لیکن اس دن وہ دوپہر کے کھانے کے بعد گئی کیونکہ اسے وہاں ہی میں بچی کو اپنے ساتھ لانا تھا۔ اس دن میں نے اسے بچی کی پسند کی مٹھی چیز پوچھ کر کھانے میں مزہ ایک ڈش کے اضافے کے لئے کہہ دیا تھا۔ جاتے وقت حیدہ کے چہرے پر مسرت بھرتی پڑ رہی تھی۔ اور اسے خوش دیکھ کر خود میرے اپنے اہم نکل کے غرور اور ایک نئی مسرت کی سرشاری تھی۔

شام کو وہ اپنی بچی کو لے کر آئی تو حیدہ میرے پاس آئی۔

”بڑی نیچم صاحب! یہ ہے۔ نویدہ.....“ اس نے بچی کو میرے سامنے کر دیا۔

”میں نے بچی کے سر پر ہاتھ پھیرا اس کے گالوں پر پیار کیا اور پھر اسے اپنے پاس بٹھا کر باتیں کرنے لگی۔ بچی سبھی سبھی ہی جواب دیتی رہی۔ دو ایک بار جب میری نگاہ بچی سے ہاتھیں کرتے ہوئے حیدہ پر پڑی تو میں نے اسے بڑے غور سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ میں کچھ الجھ رہی تھی کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے بچی کا چہرہ کچھ مانوس اور دیکھا دیکھا سا ہے۔ پھر حیدہ کی نظریں جن کے حلقے نہ تو کیا جاسکتا تھا کہ ان میں جتنی بھی نہ اطمینان نہ ہے جیسی۔ اگر وہ

تری یادوں کے گلاب

گروں میں جھپی ہوئی کیفیت کو کوئی نام نہاد یا جاسکتا ہے تو وہ حسرت کی کیفیت تھی۔ میں سوچ نہ سکی کہ حیدہ نے مجھے اس طرح کیوں دیکھا تھا۔ میں نے بچی سے باتیں کرنے کے لئے توڑی دی پر بعد حیدہ سے کہا کہ وہ بچی کو اپنے ساتھ لے جا کر چائے پلاوے۔ حیدہ جلی گئی اور میں نئے نئے حادثات کا سویر بننے لگی۔

حادث اپنے آپ کے ساتھ پارک کی سیر کیلئے گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ حادثات آئے گا تو وہ جینا نویدہ کو دیکھ کر خوش ہوگا۔

حادث کی عمر آٹھ سال تھی۔ اسے اپنے ہم عمر بچوں کی تلاش رہتی تھی۔ شاذب کی خواہش تھی کہ حادثات کا کوئی بہن بھائی ہو۔ لیکن میں چاہتی تھی کہ ابھی کچھ عمر سا اور میں اس مصروفیت سے بچی رہوں۔

سویر بننے ہوئے میں اپنی پھولنی ہی جنت کی بہت سی خوشگوار یادوں میں گم ہو گئی۔ اور پھر اس وقت چونکہ جب حادث میرے گلے میں اپنی باتیں ڈال کر محمول کیا۔

”بہت خوش ہیں تو آج آپ.....“ میں نے اسے اپنی گود میں سمیٹ کر پیار کیا۔

”ہاں..... آئی..... آج پارک میں میرا دوست لڑکا بھی آ گیا تھا۔ ہم خوب کھیلے اس کے ساتھ۔“

”خدا بچہ دوست کے ساتھ کھیلنے کی مسرت سے ابھی تک بے چین ہو رہا تھا۔“

”بٹے اپنی اسی سے کیونکہ تمہارے لئے چھوڑ بھائی لے آئیں۔“ شاذب نے شرارت سے کہا۔ میں نے دیکھا وہ سنگھار بچہ کے سامنے کھڑے آئینے میں شوق نظروں سے مسکرا کر مجھے دیکھ رہے تھے۔

”بٹے ہم تمہارے لئے بھیا تو نہیں۔ بہن نے آئے ہیں۔“ میں نے شاذب کی شرارتوں سے آنکھیں چراتے ہوئے غصے سے کہا۔ فوراً پھر حیدہ کو آواز دی۔

”حیدہ نویدہ کو لے آنا یہاں۔“

”کیا وہ اپنی بچی کو لے آئی؟“ شاذب نے پوچھا اور میرے جواب دینے سے پہلے حیدہ

دو آنسوؤں میں چائے کی ٹپ سے اور دوسرے ہاتھ میں نویدہ کی انگلی قاتلے کرے میں داخل ہوئی۔

”آؤ..... نویدہ..... دیکھو یہ تمہارا بھیا حادث ہے۔“ میں نے نویدہ کو قریب بلا دیا اور وہ

مات کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور اسی لمحے جیسے میرا دل دھک سے رو گیا۔ کچھ دیر بعد میرے

تری یادوں کے گلاب

میں کئی نوید و کود بکھتی اور کئی حادث کو کتنی مشابہت تھی۔ وہ دنوں میں نویدہ کی غمزدگی نے واقعی طرف ایک سیاہی تھا اور حادث کی غمزدگی پر بھی ٹھیک اسی جگہ ایک سیاہی مل تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ نویدہ کا کل ہلکا سیاہ تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے مجھے چکر سا آ رہا ہو۔ حیدر نے میری کیفیت دیکھی اور وہ مکرے سے باز نکل گئی۔

”شاذب۔“ میری آواز میں غیر ضروری طور پر چیزی بھی تھی اور اعتراض بھی شاذب چاہے پیتے ہوئی چونک پڑا۔

”کیا بات ہے۔“ فرزانہ!

آپ نے نویدہ کو دیکھا؟“ یہ حادث سے کس قدر مشابہ ہے اور پھر یہ حق۔ میں بے چین ہو کر بولی۔ لیکن شاذب کے لئے یہ جیسے کوئی انجینے کی بات ہی نہ ہو۔ انہوں نے شام کے اخبار سے سرائی کر ایک نظر نویدہ کو دیکھا اور پھر اخبار کی سرخیوں پر نظر جماتے ہوئے بولے۔

”ہاں۔ بہت مشابہت لیکن اس میں جبریت کی کیا بات ہے۔ ایسے واقعات اکثر ہوتے ہیں۔“ میں خاموش ہو گئی۔ میرا دل اس بات کو اس مشابہت کو اتنا ہی مانتے کو چارہ تھا مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے شاذب نے مجھ سے بہت کچھ چھپانے کی کوشش کی ہے۔

رات کو سوتے وقت کتنی ہی شبہات میرے دل میں پیدا ہوئے۔ لیکن میں نے پہلو بدل کر خند میں ڈوبے ہوئے شاذب کو جب دیکھا تو یہ دوسرے کبھی دم توڑتے ہوئے معلوم ہوئے۔ اور کئی حقیقت کے سنبھلے بن کر مجھے ڈبے لگتے۔ اور میں سوچنے لگتی۔

بھٹا یہ کیوں لیکن ہے۔ جبکہ شاذب حیدر کو پہلے سے جانتے نہیں۔ نہ کبھی ان کی گفتگو سے کبھی کوئی شہداء میرا ہاتھ محسوس ہوئی پھر یہ مشابہت کیا تھی۔ تب میرے دل نے چپکے سے کہا۔

”جانتے کیسی نہ ہوں گے۔ لیکن وہ دنوں نے کامیاب اداکاری کے ساتھ مجھ سے یہ بات چھپانے کی کوشش کی ہو تو مجھے کیا معلوم؟“

اور میرے خدا۔ میں کروٹیں بدلتے بدلتے ٹھک گئی۔ خیر جیسے مجھ سے کوسوں اور بھاگتی تھی۔ پھر فنواری کے عالم میں بھی نویدہ اور حادث کی تصویریں گزرتے ہو کر میرے ذہن کے پردے پر ابھر ابھر کر ڈھکی رہیں۔

مناجیب میں جاگی تو کس قدر سے میرا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ حیدر بیٹنی لے آئی۔ اس نے

تری یادوں کے گلاب

ایک بیانی مجھے بنا کر دی۔ اور ایک شاذب کو۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ لیکن وہاں کوئی اضطرابی کیفیت نہ تھی۔ کوئی نیا تاثر نہ تھا۔

”ہن رچی ہے۔“ میرے اندر کی عورت چیچی اور پھیلی بار میں نے حیدر کے لئے اپنے دل میں رقا بت اور چڑاری محسوس کی لیکن مصلحت کا قحط تھا کہ میں ان جذباتوں پر قابو رکھوں میں بغیر غموس جوت کے شے کی پنکاروں کو ہوا نہیں دینا چاہتی تھی۔

اب ارادی اور غیر ارادی طور پر میری نظر میں حیدر کے چلت بھرت اور اس کے روپے کا جائزہ لینے لگیں۔ اسی دوران شاذب کی ادنیٰ تڑپوں پر سے ہمارے پاس آ گئیں۔ ویسے وہ ہر دوسرے ماہ ایک ہفتہ ہمارے پاس گزارتی تھیں لیکن اس بار میری بڑی تندرستی کی وجہ سے تین ماہ تک وہ ہمارے پاس چکر نہ لگا سکیں۔ میری بڑی تندرستی کے باوجود وہ دانی تھی اس وجہ سے آئے دن اس کی طبیعت کچھ بگڑی بگڑی رہتی تھی۔ وہ کبھی گاؤں ہی میں رہتی تھی۔ لیکن اس کے شوہر شہر میں ایک بینک میں برانچی منیجر تھے۔ عجیب بات ہے کہ میری تندرستی کے سر بھی زمیندار تھے اور میرے سر بھی لیکن ان کی اولادوں نے زمینداری میں کبھی دلچسپی نہ لی۔ انہوں نے شہروں میں زیادہ وقت گزارا۔

شاذب بھی تعلیم کے سلسلے میں زیادہ تر شہر ہی میں رہے اور پھر ملازمت اور شادی کے بعد انہوں نے شہر ہی میں مستقل رہائش اختیار کر لی اور ہم سال میں صرف ایک بار فصل کے موقع پر گھوٹوں جاتے تھے۔ لیکن اماں پابندی سے ہر دوسرے ماہ ہمارے پاس آ جاتی تھیں۔ اب کے اماں آئیں تو وہ بھی حیدر کی مستعدی اور خدمتگاری سے بے انتہا تاثر اور خوش ہوئیں۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ان کی خوشی میں، میں برابر کی شریک ہوتی لیکن اب تو حالات ہی دوسرے تھے۔ حیدر کو دیکھتے ہی جانے کیوں میرے چہرے پر بیزاری کی ٹیکریں ابھرتی تھیں۔ لیکن اماں کے آنے کے بعد میں اور بھی جھکا ہوا ہو گئی تھی۔ میں اپنے چھپے کا اظہار ان کے سامنے کر کے اپنے عورت بنی کی توجہیں کرنا نہیں چاہتی تھی۔ چاہے پس منظر میں جو بھی تھا۔ پھر بھی حیدر ہی جھلا میرا کیا مقابلہ وہ ایک ادنیٰ نوکرانی۔ اور میں بہر حال ایک شریف اور باعزت گھرانے کی بیو اور بیٹی تھی۔ میری رگوں میں شریف خون تھا اور اس کی پاکیزگی کا قحط تھا کہ میں اس معمولی نوکرانی کو کوئی اہمیت نہ دوں۔ پھر بھی ایک قفس تھا۔ ایک جستجو تھی اور وہ جستجو تھی نویدہ اور حادث کی مشابہت! حیدر کو کچھ کہاں بھی چکی تھیں۔



لے راضی کیا جائے۔ آخر بے چاری اس طرح کب تک اپنی جوانی خوار کرے گی۔

نوری چلی گئی تو میں باور پئی خانے کی طرف جاگلی کیونکہ شاذب نے سوئچ کی بجائی وال اور بھوکے طوع کی فرمائش کی تھی۔ میرے ہاتھ کی پکی ہوئی یہ دونوں چیزیں شاذب کو بے حد پسند تھیں اور وہ اکثر و بیشتر مجھ سے ان چیزوں کے پکانے کی فرمائش کرتے تھے۔

لیکن باور پئی خانے پہنچ کر میری تو جان ہی مل گئی۔ حیدر نے یہ دونوں چیزیں پہلے ہی تیار کر کے رکھ دی تھیں۔

”اف یہ غصوں ماری عورت تو مجھ سے میرے گھر کے یہ چھوٹے چھوٹے عکس بھی جھین لیا چاہتی ہے۔“

”اے میرا تو انتظار کر لیا ہوتا۔ اب ایسی بھی کیا جلدی تھی۔ صاحب کے آنے میں تو ابھی دیر ہے۔ میں نے کہا تھا میں خود پکاؤں گی۔ لیکن تم ہو کہ ہر کام کا سہرا اپنے سر لے لیتا چاہتی ہو۔“ میں نے جھلا کر کہا۔

”صاحب تو آگئے بڑی عجم اور میں نے سوچا کہ آپ کو رحمت ہوگی۔ اس لئے.....“ حیدر کی چوڑی بات سننے سے پہلے ہی مجھے لگا جیسے میرے تن بدن میں کسی نے پنکھا دیا ہی بھڑکی ہوں۔ شاذب آگئے اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا۔

میں نے غصے میں اپنے ہونٹ سمجھنے لگے۔ میرا جی چاہا کہ اس کی پٹیا پکڑ کر پوچھوں کہ اپنے میاں کا کام کر کے مجھے رحمت ہوگی اس لئے کہ یہ کام میرے لئے رحمت بن چکے ہیں؟ لیکن میں ضبط کر کے چپ رہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شاذب بستر پر لیٹے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی اور دوسرے میں اخبار۔ میرے ذہن میں آنے والی سی اٹھنے لگیں۔ شاذب مجھے دیکھ کر بولے۔

”کہاں ہو گئی تھیں آپ عجم؟ آپ کے انتظار میں چائے بھی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔“

”تو بلا لیا ہوتا آپ نے مجھے۔ لیکن عجب اس کی ضرورت ہی نہیں آئی ہوگی۔“ میں نے جمل کر کسی قدر غصے سے کہا۔ لیکن شاذب میرے لب والچہ کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔

”ضرورت تو آپ کی ہر لمحے محسوس ہوتی ہے۔ لیکن آپ کیا جانتی ہیں۔ میں نے حیدر کو کہا بھی تھا کہ آپ کو سمجھا دے لیکن.....“

”جس کیا.....؟“ میں خوں کر جلدی سے بولی۔ لیکن شاذب کے جواب دینے سے پہلے

”یہ چہرہ کچھ جانا بچانا تھا۔ جانے میں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟“ انہوں نے پہلے مجھ سے کہا تھا۔ اس وقت اور پھر وہ چار بار بعد میں، میں نے ان کے ذہن کو کھنگالا لیکن وہ اپنے ذہن پر زور دینے کے باوجود یہ یاد نہ کر سکیں کہ حیدر کو انہوں نے کہاں دیکھا تھا۔ انہوں نے حیدر سے پوچھنا چاہا۔ لیکن میں نے خود ہی انہیں منع کر دیا۔ اس لئے کہ مجھے یقین تھا کہ حیدر کبھی بھی حقیقت نہیں بتائے گی۔ کون اپنے کڑو توں ہی پردہ اٹھانا پسند کرتا ہے۔

ایک ہفتے بعد اماں چلی گئیں اور میری چھوٹے چھوٹے معمولات میں دخل مانی۔ لیکن اماں نے جانے کے بعد اپنے خط میں جو انکشاف کیا اس نے ایک بار پھر مجھے چونکا دیا۔ اماں نے لکھا تھا کہ حیدر ان کے گاؤں کی لڑکی ہے اور اب سے کئی سال قبل گاؤں سے ہجرت کر گئی تھی۔

”بہت غیب“ میں نے خط پڑھ کر سوچا۔ تو یہ صورت سے معصوم اور بھولی نظر آنے والی عورت ایسی بھولی نہیں جیسا وہ خود کو ظاہر کرتی ہے اور یہ اس کی بیوی یہ بھی ایک ڈھونگ ہے۔ اب میرا تجسس انتہا کو پہنچ گیا۔ میں خواہ مخواہ کا ہنگامہ نہ کرنا نہیں چاہتی تھیں لیکن یہ ضرور چاہتی تھی کہ کوئی معقول ثبوت ملے تو ایک بار اس عورت کو اپنا ذلیل کروں کہ مجھے سکون مل جائے جانے یہ یہ لڑکی میری محبت میں سا بھرا کرنے کہاں سے آئی تھی۔

میں نے شاذب عجم کی ملازمت نوری کو بلا بھیجا۔ وہی نوری جو حیدر کو میرے ہاں ملازمت کے لئے لائی تھی۔ میں نے اس سے باتوں باتوں میں پوچھا کہ حیدر کو کب سے جانتی ہو اور شہر میں آنے سے پہلے حیدر کہاں تھی۔ لیکن وہ مجھے کچھ بھی نہ بتا سکی۔ کیونکہ اس کی اور حیدر کی ملاقات بس میں ہوئی تھی۔ حیدر اپنی بیٹی سے ملنے عجم خانے جا رہی تھی۔ حیدر کے پاس کرایہ دینے کے پیسے نہ تھے۔ اس پر کتنے ٹکڑے بری طرح گھر کر رہا تھا اور اگلے اسٹاپ پر اتار دینے کی دھمکی دے رہا تھا۔ حیدر کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ نوری کو اس کی بے بسی پر بڑا اثر آیا۔ اس نے حیدر کا ٹکٹ خرید لیا۔ پھر باتوں باتوں میں حیدر نے اپنی روادار سے سنا لی اور نوری نے اپنا چاہتا کر اس سے وعدہ کر لیا کہ اس کے لئے ملازمت ضرور تلاش کرے گی۔

اس کے چند دنوں بعد حیدر میرے ہاں ملازم ہو گئی تھی۔

یہ تھی چوری کہانی جسے سن کر بھی مجھے حیدر کے ہاشی کا کوئی اور سراغ نہ ملا۔ ویسی میں نے نوری کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ حیدر کے خاندان کا پتہ چلے تو کسی کے ذریعے اسے عقد دانی کے

تری یادوں کے گلاب

حیدر کی سائی دی اور میں دوڑ کر باورچی خانے میں گئی۔ دیکھا تو حیدر وہاں اپنا ایسا ہاتھ پکڑے بیٹھی تھی۔  
"کیا ہوا بھئی؟"

میرے پوچھنے پر اس نے تالا کو چاؤل اباتے ہوئے قیمتی ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی تھی اور اس کا بایاں ہاتھ کھولنے پانی سے جل گیا۔  
میں نے سوچا تیل اور چرنے کے پانی کا مرہم بنا کر لگاؤں لیکن اسی لمحے شاذب گھمراے ہوئے دوڑے چلے آئے۔

"کیا ہوا حیدر؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاتھ جل گیا ہے اس کا۔"

"اوائے کیسے؟ کس طرح؟" وہ پریشان ہو کر بولے اور اس کے قریب جا کھڑے ہوئے  
جب میری ساری ہمدردی رخصت ہو گئی۔  
"اگر وہ اتنے معمولی سے زخم پر اتنا راز کر کے کی کیا ضرورت ہے۔ تیل کا چھایا لگا لو آپ  
ی ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے جمل کر کہا۔

"اور ہاں۔۔۔ پھر میری سادھی پراسٹری کر دو مجھے اور صاحب کو حادثہ کے اسکول جانا  
ہے اسے لیتے۔" یہ بات میں نے اس لب و لہجے میں کہی کہ وہ فوراً اٹھی۔ لیکن شاذب میری طرف  
دیکھ کر بولے۔

"ارے نہیں نہیں۔ اس پر برہنہ لگا ضروری ہے۔ یہ معمولی تکلیف تو نہیں۔"  
پھر حیدر کی طرف پلٹ کر انہوں نے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی دوا کی لارہا ہوں۔"  
میں خون کے گھونٹ پیچ رہی تھی اور شاذب میری گفت اور میرے دکھ بھرے جذبات سے بے خبر  
اس کے ہاتھ کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گئے پھر انہوں نے حیدر سے کہا۔  
"جاؤ تم آرام کرو۔ سادھی پراسٹری ہم براہ دوا کی لارہا رہی ہے کروائیں گے۔"

"آپ۔۔۔ آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں۔" حیدر نے ان کی طرف کچھ ایسی نگاہوں سے  
دیکھا کہ میرا صبر و قرار رخصت ہو گیا۔ میں تڑپ اٹھی۔ اور ایک بھر پور تیز حیدر کے منہ پر مار کر بچتی۔  
"تم۔۔۔ تم ذلیل عورت اب اتنی بدھنگی ہو کر میری آنکھوں کے سامنے میرا قاتل بھاری  
ہو۔ تمہاری یہ بجل کہ تم۔۔۔ تم میری تو ہیں کرو۔۔۔ انجیل فرشتہ کہنے سے تمہاری مراد ہے تاکہ میں  
شیطان ہوں۔ کیا غوی ہوں اور اس لئے ہوں کہ تمہاری راہ کا روڑا بن گئی ہوں۔ کیونکہ تم اسے

تری یادوں کے گلاب

ہاں۔۔۔ طور پر اپنی ملکیت بنانا چاہتی تھیں اور وہ جائز طور پر میرا حق بن چکا ہے۔ اور اسی لئے۔۔۔  
اس لئے میری تخیل پر آمادہ ہو۔ لیکن اب میں ایک بل کے لئے بھی تمہارا وجود یہاں  
اشت نہیں کر سکتی نگل جاؤ یہاں سے فوراً۔۔۔ اٹھی۔ اسی وقت۔"

خسے سے میری آواز کیکپا رہی تھی۔ شاذب بری طرح بوکھلائے ہوئے تھے۔ دو بار بار  
ٹپاٹے بازوؤں میں سنبھالنے۔

"تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔۔۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ خدا کے لئے اپنی حالت سنبھالو۔"

لیکن میں اپنے حواس میں کب تھی۔ وہ لاوا جو ایک مدت سے میرے دل و دماغ میں پک  
ہاتھا۔ اب اٹل پڑنے کو تھا۔ وہ آگ جو ایک عرصے سے میرے دل میں جمل رہی تھی۔ اس کی  
بات میں اس وقت میرا کاد بھی تھا اور میری شناخت بھی۔

حیدر وہاں سے جا چکی تھی۔ شاذب مجھے کمرے میں لے آئے اور پھر بستر پر لٹا دیا تھا۔  
میں نے اعصاب بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ دماغ پتکرا رہا تھا اور میرا دل۔۔۔ ہائے وہ کسی طرح  
میں آج بھی نہیں آ رہا تھا۔

"میں ڈاکٹر کو بلا رہا ہوں۔" شاذب نے میرا سر جھپٹاتے ہوئے کہا اور میں جمل گئی۔

"تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔ شاذب۔ خدا کے لئے نہیں۔ بل بھر کو بھی نہیں۔ ورنہ میں  
پاک ہو جاؤں گی۔" میں بری طرح رونے لگی۔

"میں نہیں جانتا۔ کہیں نہیں جاتا تمہیں چھوڑ کر۔" انہوں نے میرے گال جھپٹائے۔ پھر  
نوزی دیر کے بعد انہوں نے اپنی الماری سے ایک گولی نکال کر مجھے کھائی اور ٹکڑوں پر کر سیرا اٹھا  
ہاتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد میں گہری نیند سو گئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں کمرے میں تھا تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے آٹھ بج  
تھے۔ مگر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ مسیروں کے برابر والی تھاپی سے میں نے پانی کا گلاس اٹھایا۔ اس  
پے ایک پرچہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے پرچہ کھول کر پڑھا شاذب نے لکھا تھا۔

"میں حادثہ کو لینے جا رہا ہوں۔ اس کے اسکول میں قریب قسم ہو چکی ہوگی۔ کہیں وہ اکیلا  
ہیٹان نہ ہو حیدر اپنے کمرے میں ہے۔ اب اس پر خفا نہ ہونا۔ میرا ابھی تک انتظار کرو۔"

مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میری خوشیاں کبھی کبھی ہو کر ٹھہر گئی ہوں۔ میں سوچنے لگی



تری یادوں کے گلاب

شاذب کو اب بھی اس عورت سے جھڑپی ہے اور یہ عورت کتنی ذمیت ہے۔ جواب تک اس گھر میں موجود ہے۔ اسے تو کب کا وہ خان ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن وہ کیوں جائے گی وہ تو اس گھر پر مان کرنے کے خواب دیکھ رہی ہے۔

”اوہ۔۔۔ میرا سر دوڑنے دیکھئے گا۔ میں بے چین ہو کر رہی۔ تجھے مجھے قدموں سے باہر نکلی۔ اسٹوروم کی حق مل رہی تھی۔ یہی حیدہ کا کمرہ بھی تھا۔ میں شاذب کی واہسی تک اس اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن پھر کیوں میرے قدم غیر ارادی طور پر اسٹور کی طرف اٹھ گئے۔ دروازے کے دونوں ہت کھلے ہوئے تھے۔ میں نے آنکھیں سے اندر جھانکا۔

حیدہ اندر نہ تھی۔

صرف نویدہ ایک بکس پر غصی سی بی بی بی تھی۔ میں نے قریب جا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی کئی کیریں گالوں تک آ کر خشک ہو گئی تھیں۔ وہ خند میں اب بھی ہوئے ہوئے سسکیاں لے رہی تھی۔

”بد نصیب لڑکی“ میرے منہ سے نکلا۔

”تو اپنی ماں کا کیا جھگڑ رہی ہے۔“ میں باہر جانے کے لئے پلٹ بی بی۔ پھر اس خیل سے رک گئی کہ شاید کبھی بچی بھوکے ہو گئی ہو۔ میں نے اسے دیر سے سے ہلایا۔

”نویدہ۔ نویدہ! اٹھو۔ تمہاری اہلی کہاں ہے۔ تم نے کھا؟ کھالیا؟“ وہ ایک دم چونک کر اٹھی پھر آنکھیں ملنے ہوئے بولی۔

”ای۔ ای۔۔۔ وہ چلی گئیں۔“ وہ پھر گھٹنوں میں منہ دے کر سسکیاں لینے لگی۔

”کہیں نہیں تمہاری اہلی؟“ میں نے اٹھی پکڑ کر اسے بکس سے نیچے اتارتے ہوئے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ اس نے میری طرف مصوہیت سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک جہاں کی ویرانی سمٹ آئی تھی۔

”یہ کاغذ دے لگی ہیں۔ آپ کے لئے۔“ اس نے اپنے فرائد کی جیب سے ایک مزار کا کاغذ نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے جلدی جلدی کاغذ کھولا اور وہیں کھڑے کھڑے پڑے گئی۔ حیدہ نے کھا تھا۔

”بی بی بیگم!“

آپ کا غصہ بھی بجا ہو۔ آپ کا شک بھی۔ میرا تو تھا اسی دن ٹھکانا تھا۔ جب میں نے

تری یادوں کے گلاب

اہلی کو دیکھا اور پھر ان کی محسوس کیا میں بھی مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میری محسوس کے دن ابھی ختم نہیں ہوئے۔ لیکن جب اہلی میں خاموش چلی گئیں تو میں نے سوچا کہ سکون کا سانس لے سکوں گی۔

نویدہ کو دیکھ کر آپ کے دل میں جانے کتنے شبہات ابھرے ہوں گے۔ حادثہ میاں کو دیکھ کر میرا جی بھی بھرا آتا تھا۔ لیکن میں نے سوچا تھا کہ اپنا اپنا مقدر ہے۔ کوئی بہرے موتیوں میں کیلئے اور سونے کا نوالہ کھائے۔ اور کوئی ایک روٹی کیلئے خیم خانوں کے دروازے کھٹکائے۔ بڑی بیگم صاحب آپ بڑے گھر کی بیٹی تھیں۔ اس لئے بڑے گھر کی بہو بننا آپ کا مقدر تھا اور میں غریب گھر کی بیٹی۔ اس لئے تاریک راہوں میں ماری گئی اور یہ میری غربت ہی تھی جس کے سہارے میری شرافت اور عزت کی بونی بی بی آسانی سے لگا دی گئی۔

میں کون ہوں اور نویدہ نے کس شریف خوں سے جنم لیا آپ اس کی محسوس کو بہت دنوں سے سلجھا چکا رہی تھیں۔ آئیے میں آپ کی آنکھوں سے دیکھوں۔

میں صاحب کی کاکاؤں کی رہنے والی ہوں۔ ہاں میں انہیں جانتی ہوں۔ لیکن آپ یقین کریں کہ میں نے انہیں صرف دو چار مرتبہ دور سے دیکھا ہے۔ زمیندار کے اگوتے اور لالہ لالے جیتے ہوئے کے باوجود انہیں کاکاؤں کی روایات اور رسم و رواج ہی کوئی دلچسپی نہ تھی۔

یہی وجہ تھی کہ وہ خیم حاصل کرنے کیلئے بیٹھ کاکاؤں سے باہر رہے۔ وہ چیمپوں میں آتے بھی تو کسی نے انہیں کھیتوں، کھلیوں، یا میلوں، میلوں میں نہیں دیکھا۔ میں اپنے کاکاؤں کی ایک اہلی اور محسوس لڑکی تھی جو اپنے بڑے باپ اور اندھی ماں کا سہارا تھی۔ میرا باپ ایک کسان تھا جو صاحب کے زمیندار باپ کی زمینوں میں اپنا خون پسینہ جذب کر کے کھانا اگا یا کرتا۔

ایک دن شام کو میں ماہلی سلیموں کے ساتھ کھیت سے واپس آ رہی تھی۔ گھر کی دلیز پر قدم رکھا تو اچانک پتہ چلا کہ میرا چاندی کا بندھن کھیتوں میں گر پڑا ہے۔ میں اگلے قدموں واپس مڑی اور جن راہوں سے آئی تھی انہی راہوں پر بندھا موڑتی ہوئی بہت دور جا چکی۔

جب اچانک کسی کے پیروں پر نظر پڑی اور میں وہیں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ میری جھکی ٹھٹھکی پیروں سے اٹھیں تو میں نے اپنے سامنے زمیندار کو کھڑے پایا۔ صاحب کے اہل اور ہمارے ماہی باپ۔ وہ مسکرا رہے تھے اور میرے کانوں کا بندھن ان کے ہاتھ میں بھول رہا تھا۔

”تو اہلی کو ڈھونڈ رہی تھی ماں حیدہ۔۔۔ لے لے اسے یہ حیرانی ہے۔“ میں بھیجی تو زمیندار بڑے زور سے ہنسنے۔

"بے خوف لڑکی مجھ سے کیوں شرماتی ہے۔ ادھر آ، لے یہ اپنا ہنسا" ان کے لہجے میں حکم بھی تھا اور اہمیت بھی۔ میری آنکھیں ان کی آنکھوں سے چار ہونٹیں اور میرے اندر سے اٹھنے والی جھنجھٹ گھٹ کر وہ گئیں۔ ان نگاہوں میں جو طلب تھی۔ اس نے مجھے بھانجے پر مجبور کر دیا۔ لیکن میں بھاگ بھی نہ سکی۔ چچ بھی نہ سکی۔ اور ہم یہ کہ فریاد بھی نہ کر سکی اور جب میں اپنے ناکرہ گناہ کا پھل پانے کی منزل میں آگئی تو میرا غریب اور مجبور باپ یہ صدمہ سہار نہ سکا اور اس نے کنوئیں میں گر کر جان دے دی۔

اب میں تھی اور ماتم کرنے کو میری تھانیاں۔ لیکن میں جلد ہی اس خول کو توڑ دینے پر مجبور ہو گئی۔ میں نے رات کی تاریکی میں اپنے گھر کے قریب پاؤلی میں پناہ لینی چاہی لیکن میری بزدلی آڑے آگئی۔ پھر میں نے گاؤں چھوڑ دیا۔ اور کیا سناؤں..... بیگم کہ میں نے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائیں۔ قاتلے کئے ہمدردی گری کے دکھ چھیلے اور آخر کار قسمت مجھے آپ کے در تک لے آئی میں نے سوچا میں چور دروازے سے کسا۔ لیکن اپنے گھر تک پہنچ گئی ہوں۔ محنت کروں گی، خدمت کروں گی اور بدلے میں دور و نیاس مل جائیں گی۔ اور میں ان دور و نیاس کے سہارے زندگی کا ٹالوں گی۔ لیکن میری قسمت نے یہاں بھی میرا ویسا نہیں چھوڑا اور آج میں نے محسوس کیا کہ گھٹن ایک شے کی بنا، پر کہیں بنتا کھیل گھرا جڑ نہ جائے۔ اس لئے میرا چلا جانا ہی بہتر ہے۔ آپ مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا کہ یہ سب بے سود ہوگا۔ میں نوید و کو لے کر نہیں جا رہی ہوں۔ اس لئے کہ یہ اگر میرے ساتھ رہی تو میری قسمت کا شہ اس پر زندگی بھر نگا رہے گا۔ اس لئے اسے آپ کے حوالے کر رہی ہوں۔ اگر انسانیت کے نامے آپ انصاف کر سکیں تو اپنے خاں کو سمجھ کر اسے اپنے پہلو میں جگہ دے دیجئے گا۔ ورنہ اس شہر کے قیم خاںوں کے دروازے تو ابھی کھلے ہوں گے۔"

خط میرے ہاتھوں میں تھا اور نوید و میرے پہلو میں۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ اگر حیدرہ غریب نہ ہوتی، کمزور نہ ہوتی تو آج نوید و، شاذب کی ناجائز کہن ہوتی اور میرے زمیندار دوسری درافت کی حقدار بھی۔ لیکن.....

☆.....☆.....☆

## بھگی بھگی پلکیں

نگار نے کمزری بند کر دی۔ مہدی حسن کی پرسوز آواز دل چیرے دے رہی تھی۔ اس سے یاد نہیں بنا چار ہاتھ۔ آواز تو تھی ہی دور بھری، گیت کے بول بھی دل کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جا رہے تھے، درخشاں آنسوؤں سے بھگ رہے تھے۔ ہر شعر حسب حال تھا۔

کمزری بند کر کے اس نے رخ بدلا اور ایک نگاہ شیرازہ عرفانہ اور نوشیلہ پر ڈالی سب کی سب دہری تھیں۔ وہ غنڈی سانس لے کر اپنے بستر پر آگئی۔ وہ ایک ایسے گھرانے کی لڑکی تھی جہاں لڑکیوں کو کم تر مخلوق کا درجہ دیا جاتا ہے اور لڑکوں کو زندگی کے ہر شعبے میں اہمیت و اولیت سے نوازا جاتا ہے۔ سن شعور تک پہنچتے پہنچتے نگار کے دل و دماغ میں یہ بات اچھی طرح بیٹھ چکی تھی کہ وہ ایک ایسی زندگی ایک ایسا وجود ہے جس کا سوا نہ صرف جانوروں کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ جانور..... اپنی سوچ..... اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ جہاں باندھا گیا، بندھ گئے، جو کھلا بانٹا لیا گیا، بھی کبھی یہ بھی بڑا جاتے مگر بے زبان فریاد بھی نہ کر سکتے۔

ہاں آنسو وہ لٹا سکتے ہیں خوب خوب جتنے بھی جھگن ہوں سو نگار بھی نہ کہہ کہہ سکتی تھی نہ اپنی ریش چلا سکتی تھی وہ ابھی بے زبان جانور تھی لیکن آنسوؤں پر اسے بھی قدرت حاصل تھی۔ چنانچہ وہ انکس رات کے اندر صبر سے میں لٹائی رہتی، دوا پٹا دار امن بھگوتی رہتی۔

وہ خدا سے شکوہ کرتی کہ یادب! جب تیری دنیا میں ہم لڑکیاں اتنی ہی کسرت فقیر اور بے مایہ میاں تو ہمیں اتنی سوچ، نگہ کیوں دے رہا ہے۔ ہمارا دماغ بھی بے صلاحیت کر دیا ہوتا ہماری اباں کو بھی جھین لیا کہ ہم یہ سوچ ہی نہ سکیں کہ ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

مجھروہ سسک اٹھتی اور رات اس کے آنسوؤں کی نمی پا کر بھگ جاتی۔ نگار گھر میں سب سے بڑی تھی۔ اس کے بعد اس کا بھائی عاشر اور پھر تین بہنیں شیرازہ عرفانہ



اور ٹھیلے۔ ایک لورڈل کلاس کے لیے جہاں کمانے والا ایک اور کھانے والے ڈھیر سارے ہوں وہاں چار بیٹیوں کا بوجھ کتھوڑ کے کھو جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ نگار کے اماں اپا بیٹیوں سے اسکا رہے تھے۔ پھر زمانے بھر میں لڑکیوں کی شادی کے مسئلے انہیں ٹھکر کیے دیتے تھے کہ یا اللہ یہ بھڑکی سلیس کب ٹھکس کی اپنی جگہ سے؟ لڑکیوں کے بھی مسائل تھے کہ ان کے خدو یک ان کی وقعت محض بوجھ کی تھی۔

گھروں کے سامنے گھرے ہوتے گئے نگار کی ماں رشتوں کے لیے مکر مند تھیں۔ نگار کا رنگ دیتا ہوا تھا۔ نقوش بھی واجبی سے تھے البتہ گریستی میں اس کا مانی نہیں تھا۔ پکانے سے لے کر پینے پر رونے تک اس کا حلیقہ سارے خاندان میں ضرب المثل تھا لیکن آج کے لوگ سیرت بعد میں دیکھتے ہیں اور صورت پہلے۔ نگار کے بعد شیراز تھی جو خاصی پرنسش تھی۔ اس کی ماں اسے دیکھ کر بولی ہی جاتی تھی کہ پروردگار غریبوں کی بیٹیوں کو اتنی جلدی بڑا کیوں کر دیتے ہو؟ وہ اپنا دل مسوس کر رہ جاتی تھیں۔

بڑی تک و دو کے بعد ایک رشتہ آیا۔ لڑکا ایک کنبی میں ملازم تھا۔ بی اے پاس اور خاصا اچھا گھرانہ۔ نگار کے والدین نے اس رشتے کی حامی بھر لی اور جب لڑکے والے لڑکی دیکھتے آئے تو انہیں شرم سے کنبی نگار کے بجائے شوخ، اپنی باجی سے مذاقی کرتی شیراز پسند آئی۔ گھر میں طوفان کھڑا ہو گیا۔ ابا کسی طور پر راضی نہ ہوئے کہ بڑی سے پہلے چھوٹی کا رشتہ ہو جائے لیکن اماں نے خضدی سانس بھر کر جب یہ کہا کہ آج کدے مانے میں بڑی چھوٹی کے چکر میں رہے تو دونوں کو لیے بیٹھدے ہو گئے تو ابا میاں نے پپ سا دھلی۔

رشتہ منظور ہو گیا۔ شادی کی تیاریاں شروع ہونے لگیں۔ وہ جہیز جو نگار اپنے لیے جاری تھی اب شیراز کے نام ہو چکا تھا۔ نگار نے اپنی شکل آئینے میں دیکھی تو سوچنے لگی کہ کیا کی ہے مجھ میں۔ کالی ہوں، نقلی تری ہوں، لولی ہوں، دیکھا میب ہے مجھ میں۔ اگر کوئی نہیں تو پھر مسترد کیے جانے کی وجہ؟ وہ اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپے سسک پڑی۔

گھر میں بے ذوں بعد آئی چٹل چٹل کو رکھ کر اس کا من سنخیل کیا اور وہ اپنے خیالات کو خضد ان کر کے بند بات اور احساسات کو سکون کی خند سلا کے شادی کی تیاریوں میں لگ گئی۔

اگلے ہفتے شیراز کی شادی تھی۔ اما میاں نے صبیہ تو فیض بھیج دیا۔ نگار کے ہاتھوں کے کڑھے ہوئے سینہ ٹوٹوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے وہ اس کے حلیقے اور جرمندی کی تعریف کرتے

لیان یہ خریف بس یہیں فتم ہو جاتی آگے بات نہ ہو پاتی۔

شادی کے چنگاموں میں ہی ذوالفقار کے گھر والوں کے ساتھ آنے والی ایک خاتون نے عرقانہ کو دیکھا اور پسندیدگی کا اظہار کر دیا۔ ذوالفقار جو شیراز کا شوہر تھا۔ یہ ان کی دور کی رشتے دار تھیں۔

ابا میاں نے فی الحال بات نال دی کیونکہ ان کی شیراز کی شادی سے پہلے ہی جھک کر دوہری ہو چکی تھی اور عرقانہ کی شادی کا بوجھ ان سے برداشت نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اماں جو جھدے میں گریں تو انہوں نے درود کر جائے نماز تر کر دی۔

”یارب حیرا شکر یہ چنگا روز بان کیسے ادا کرے یارب تو انکا جوت دے دے کہ یہ بوجھ اترا جائے میں ماں کے فریاض سے سبکدوش ہو جاؤں۔“

دور کھڑی عرقانہ سہم کر رہ گئی۔

”تو اماں ہمیں اتنا بوجھ کبھی ہیں؟“ وہ بھیجی آنکھوں کے ساتھ پلٹ آئی اماں نے ابا میاں سے بات کی اور انہوں نے یہ طے کر لیا کہ سناہ کی سے منگنی کر کے بات کو نہ جانے دیں اور پھر ماں بھر کے بعد اس کے بھی ہاتھ پہلے کر دیں۔ ابا میاں نے ایک نظر باورچی خانے میں مشغول نگار کے وجود پر ڈالی اور دل شکستہ انداز سے گردن ہلا دی۔

وہ خاتون پھر آئیں اور جب تک انہوں نے اقرار نہ کر دیا انہیں نہیں۔ شیراز کی شادی ہو گئی۔ نگار کو بہن کی جدائی نے تڑپا دیا۔ وہ اس کے گلے لگ کر نہی طرح رو پڑی اور ایسے میں نہ جانے کیوں اماں نے ایک کرخت انداز سے اسے شیراز سے الگ کر دیا۔

اس کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ شاید اماں آپ سوچ رہی ہیں کہ میری ننھی زنگی کا سایہ بڑا کی زندگی پر نہ پڑ جائے۔ دل خون ہو چکا تھا، آنکھوں سے لبو ٹپک رہا تھا۔ وہ سسکیاں لیتی اندر آئی۔ کسی سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی اور پھر کہتی تھی کیا؟ آتش کی پڑ حانی فتم ہو چکی تھی اور اب وہ تو گری لہ لہاٹ میں تھا۔ ابا میاں نے بڑی کوششوں اور سفارشوں کے بعد اسے اپنی ہی کنبی میں جہاں وہ کام کر پتے تھے کا ڈسٹ کے شے میں لگوا دیا۔ آشرے بی بی کام کیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ کسی ویک کو ان کرے لیکن جب تک اسے اپنی مرضی کی نوکری نہیں ملتی اس نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ لیا اور ابا میاں کے ساتھ ہی کام میں مصروف ہو گیا۔

گھر کی آمد فی میں پھر اضافہ ہوا تو سکون بھی آیا۔ ذوالفقار کے گھر والے آئے تھے شیراز

تری یادوں کے گاہ

سسرال میں خوش تھی۔ غریب والدین کی اس سے بڑھ کر اور خواہش کیا ہو سکتی ہے کہ ان کی بیٹی سسرال جا کر خوش و خرم زندگی بسر کریں۔ آخر کو بھی خیال تھا کہ ابھی اس کی تین بیٹیاں اور ہیں۔ ان میں سے نگار اور عرفانہ شادی کے قابل ہیں۔

وقت گزر رہا تھا۔ پھر عرفانہ کی سسرال والوں نے شادی کا تقاضہ شروع کر دیا اور کہا: ہمارا لڑکا سعود یہ جا رہا ہے۔ اگر آپ فوراً شادی نہیں کر سکتے تو ہم کسی دوسری جگہ بات کر دیں۔ نگارہ اس ارادہ میں۔

"نہیں نہیں نگار کے باپ بدلتے ہاتھ سے نکلنے نہ دیتا کچھ بھی کر عرفانہ کی مرضی کا بندوبست کر دو۔" ابامیاں خود بھی کہتے تھے کہ ابھی انہیں تین بیٹیوں کو بیاہنا ہے۔ ان کی کوئی جائیداد یا تنگدستی تو ہے نہیں جس کے بل بوتے پر وہ تالے رہیں۔ سو وہ خاموش ہو گئیں اور شادی کے ہنگامے ایک بار پھر گھر میں رنگ بھانے لگے۔

آخر نے کتنی میں پوری محنت سے کام کیا اور بینک میں سروس کی تلاش بھی جاری رکھی۔ انہی دنوں جب عرفانہ کی شادی کی تاریخ پڑی، بینک میں نئی نوکری بھی مل گئی جو برلہ سے چلی نوکری سے بہتر تھی۔ لہذا ابامیاں کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار ابامیاں سوچنا کہ کاش نگار کے بجائے ان کا پہلا بیٹا ہی ہوتا تب یہ بوجھ کتنا بڑا ہو جاتا۔ اس خیال سے ان خاصے مطمئن ہوتے مگر نگار کا بھاری وجود جلد ہی انہیں اپنی حقیقت کا احساس دلانا دیتا اور وہ تڑپ کر رہ جاتے۔

شادی میں ایک مہینہ رہ گیا تھا۔ اماں نے جو کنگن نگار کے لیے رکھ چھوڑے تھے، عرفانہ کو سونے دیے گئے۔ نگار کے نصیب کا تو کچھ چاہیں تھا اور عرفانہ کی مانگ بھر گئی تھی۔ اس کے ہاتھ خالی کیوں رہتے۔ اپنی استطاعت سے کچھ بڑھ کر انہوں نے عرفانہ کا جھجھکا دیا تھا۔ ابامیاں ایک عرصے سے اس کتنی میں ملازم تھے اس لیے وہاں سے خاصی رقم ایڈوانس لگی اور بات بن گئی۔

عرفانہ شادی کر کے چاکر سہواری تو گھر میں خاما سکت چھا گیا۔ نوشیلا ابھی چھوٹی تھی اور اس کی کوئی ایسی گلز تھی لڑکی تو نگار کی جسے دیکھتے ہی اماں کے سینے میں کچھ جھلنے لگتا اور آنکھوں میں سر جھکی ہی بھر جاتیں۔

"یہ بوجھ تو کب ہٹائے گا خدا..... کب ہٹائے گا؟"

تری یادوں کے گلاب

وہ سوالیہ انداز سے آسمان کی جانب دیکھتیں۔ انہی دنوں آخر اپنی نئی نوکری کے سلسلے میں بے پناہ مصروف ہو گیا۔ وہ دلچسپی سے کام کر رہا تھا۔ نئی نوکری کا معاملہ تھا اس لیے اس نے کوئی کوتاہی نہ رہنے دی۔ پابندی وقت کا خیال رکھنا اور توجہ سے کام کرنا۔ بینک کے اسٹاف میں ایک لڑکی بھی تھی جو آخر کے ساتھ والی نشست پر کیشئر کے عہدے پر فائز تھی۔ شروع میں تو آخر اپنی توجہ کام کے علاوہ کہیں اور مرکوز نہ کر سکا تھا لیکن جیسے جیسے وقت گزرا ویسے ویسے اس کی توجہ اطراف میں بھی بکھل ہوئی اور نیا حلقہ احباب بنا۔

اب کام کرنے میں اسے زیادہ لطف آتا۔ گھر کے مسائل ٹھیک کر یہاں کے خوبصورت ماحول میں جیکے جھیکے انداز سے باتیں کرتے ہوئے اسے ایک گونہ طہایت کا احساس ہوتا اور یوں اچانک اس کی طبیعت میں ایک سرکش ہنر ہو جھڑک بیدار ہوا اسے سوچا کہ گھر کی ذمہ داریوں کی خاطر آخر میں کیوں اپنی زندگی کو تباہ کر دیں۔

اس نے اپنے وجود کا جائزہ لیا معمولی سے کپڑے، کوئی اہتمام نہیں، کوئی تیاری نہیں، وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ پھر جب نگار کا سنا ہوا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوما وہ ششیں کی طرح کام میں جھٹ گیا۔

وہ اپنے ارد گرد سے بے پروا ششیں کی طرح سب کام کئے جا رہا تھا کہ اچانک خاموش فضا میں ایک معرغم آواز گونگی۔

"آپ کھانا نہیں کھائیں گے؟" اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

ساتھ والی کرسی پر بیٹھی یہ وہی لڑکی تھی جو اکثر بڑے جیسے انداز سے آخر کو دیکھتی اور آخر معصوم بچے کی طرح گردن جھکا کر اپنے کام میں مشغول ہو جاتا۔ آخر نے دیکھا اس کی آنکھوں میں بڑی فضا تک چمک ہے۔ لب مسکرا رہے ہیں اور وہ مجسم سوال بتی اس کی جانب غور سے دیکھ رہی ہے۔ وہ صرف یہی کہہ رہا۔

"جی نہیں میں ختم کر کے کھاؤں گا۔"

"اور سہوے دینے جانے تو جہاں ہے دیکھتے ہیں نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ آجے مل کر کھا رہے ہیں۔" قضیہ نے محبت بھرے انداز میں کہا۔

آخر نے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر معصوم خواہشوں کے سائے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ انکار کر دے مگر وہ بول نہ سکی۔



توئی یادوں کے گلاب  
 "آج اپنے ماں بلیز۔ مجھے ذور کی بھوک لگ رہی ہے۔" یہ سن کر آشروہ پنے لگا کہ کوئی تو ہے جو میری اتنی پروا کرتا ہے مجھے شین نہیں گوشت پوست کا انسان سمجھتا ہے۔ سرکش ہنر پھر ابھرا اور دو سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کھانے کے بعد گفتگو ہوئی۔ ایک دوسرے کے بارے میں مکمل تعارف ہوا۔ نام پوچھا تو اس نے ایک داد سے کہا۔  
 "میرا نام حفیدہ۔"

تکلفات کی دیواریں گرتی گئیں۔ اب آشور حفیدہ آپ جناب کی حدود سے نکل کر تم اور ٹو پر آگئے تھے۔ آشور حفیدہ سے بات کرتے وقت احساس ہوا کہ جیسے ساری دنیا میں بھی ایک اس کی شخص اور چچی دوست ہے جو اس کے جذبات و احساسات کو سمجھتی ہے۔

وقت پر لگا کر آڑ رہا تھا۔ عرفانہ امید سے تھی اور جاوید کے گھر والوں نے یہ کہہ کر اسے پیسے بھیج دیا تھا کہ بھوک پیلی اولاد اس کے گھر ہوتی ہے اور اماں نے مسکرا کر اس کو خوش آمدید کہا۔ لیکن دل میں مساک کی تھمیر رہی تھی اندر ہی اندر خوفزدہ کیے جاری تھی۔ انہوں نے شام کو آشور سے بات کی۔

"بیٹا عرفانہ گھر آئی ہے۔ اس کے خربے کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ میں ابھی اپنی کھیتی سے اور ایڈوانس نہیں لے سکا تم کو بخش کر دو۔"

ابا میاں کی نرم آواز کزور پر گئی اور انہوں نے بات ہی ادھوری چھوڑ دی۔ آشور کی پریشانی پر سلوٹھ اندر گھری ہو گئیں۔ دل نے سخت غصے سے کہنا چاہا۔ "ابا مجھے آپ شین کیوں سمجھتے ہیں۔ میری ضرورتوں کا بھی تو کچھ خیال کیجئے۔ میری زندگی کو بھی تو پیسے کے علاوہ کسی نظر سے دیکھئے۔"

گھر اس کی زبان پر یہ الفاظ آتے آتے رو گئے۔ ابا میاں کا پریشان چہرہ اسے کچھ کہنے سے باز رکھ رہا تھا۔ مگر انہوں میں اتنا بہت صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ اس نے بے دلی سے کہا۔

"اچھا ابا میاں میں کو بخش کر دوں گا۔" نگار بھائی کو دیکھ کر کڑھتی۔ "اللہ اگر تو مجھے لڑکائی بنا دیتا تو کس طرح تھا۔ پھر اس نے ایک فیصلہ کیا اور اس کے بعد جیسے وہ بے حد مطمئن ہو گئی ہو۔

اگلے روز آشور دفتر گیا تو اس کے چہرے پر لگر کے سامنے تھے۔ عرفانہ کا زور چہرہ لگا ہوں میں آتا تو وہ سوچتا یہ نہیں کیا ایسے ہی اذیت دینے والی ہوتی ہیں؟ پھر وہ کام میں مصروف ہو گیا۔ ایڈوانس مانگنے کے خیال سے وہ مجھ کا جادو ہاتھ۔ ابھی اسے کام کرتے ہوئے عرصہ ہی نکٹا ہوا تھا کہ

توئی یادوں کے گلاب  
 "ایڈوانس مانگ بیٹھے۔ آج کام میں اس کا دل تنگ رہا تھا۔ جب سر پکڑا لے گا تو اس نے اس کا زخاں بند کر دی اور سر پکڑ لیا۔ حفیدہ اسے دیکھتی رہی۔  
 اس نے وہی وہی آواز میں کہا۔

"کیا ہوا آشور کیا بات ہے۔ سر میں درد ہے؟" آشور نے سر اٹھایا اور لاچارگی سے حفیدہ کی جانب دیکھا اور سر ہلا دیا۔

"تمہیٹھ دول میرے پرس میں ہے۔" وہ خاصی نگر مند نظر آ رہی تھی اور آشور نے سوچا کچھ اپنے ہو کر اپنے نہیں بن پاتے اور کچھ پرانے ہو کر اتنا خیال کرتے ہیں کہ انہوں سے بڑھ کر مزید "ہو جاتے ہیں۔" اس نے حفیدہ کی جانب دیکھا اور مسکرایا۔

لچا بریک میں حفیدہ نے اس سے پوچھا۔  
 "آج بہت چپ چپ ہو کوئی خاص بات ہے؟" آشور نے نال دیا۔

"نہیں کوئی خاص بات نہیں مں ویسے ہی۔" وہ نظریں چرا گیا۔  
 "اچھا اب مجھ سے بھی چھاؤ گے۔ مجھے بھی نہیں بتاؤ گے؟" وہ دوٹپنے والے انداز میں

بولی تو آشور نے ایک گھری نگاہ اس پر ڈالی۔ کتنی اپنی اپنی لگ رہی تھی وہ کہ جسے اس کی پریشانی کا احساس تھا۔ جو اسے خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ پھر آشور نے بلا جھجک ساری صورتحال حفیدہ پر واضح کر دی۔

حفیدہ نے چند لمحوں تک اس کے پریشان چہرے کی جانب دیکھا اور بولی۔

"میں اتنی ہی بات پر خود بھی پریشان ہوئے اور مجھے بھی پریشان کر دیا۔ یہ بھی بھلا کوئی مسئلہ ہے کہ جس کا حل نہیں۔ یہ تم تم فیر سے ایڈوانس لینے کی بجائے مجھ سے قرض لے سکتے ہو۔" کتنی بڑی بات اور کتنی آسانی سے وہ کہہ گئی تھی۔

آشور کی رگوں کا خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم نے مجھے اس قدر گرا ہوا اکب سے کھو لیا کہ میں تم سے قرض لوں گا۔" وہ نیت ناراض نظر آ رہا تھا۔ حفیدہ نے مسکراہٹ کے جال پیچھے اور بڑی دلکش ادا کے ساتھ اس کے لبوں ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

"آشور تم مجھ سے پتا کیجئے ہو یا نہیں؟"

اس کی مسکراہٹ میں کیا عرق تھا۔ کیسی کشش تھی؟ آشور کا فیر جھاگ کی طرح بیٹھنے لگا تھا۔

”اینانہ بھتا تو تم سے ساری باتیں کہیے کر لیتا؟“ وہ سادگی سے بولا۔

”تو پھر اپنے لوگوں کے کام آنے پر غصہ نہیں کرنا چاہیے ہاں“ وہ مسکرا کر بولی تو آشر کے دل کی ناز و ہوس بن گئی۔ اس نے اس کے گورے نازک ہاتھوں کو دیکھا۔ خوبصورت ہاتھ تری کے ساتھ اس کے مضبوط ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے۔ پھر اس کے چہرے، اس کی آنکھوں اور اس کے لبوں کی جانب دہاں اس کے لیے پیاری سی یاد چاہتا وہ چونک کر نرم لہجے میں بولا۔

”مگر دیکھو غصہ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں تم سے.....“ وہ پھر جھجکا تو غصہ اپنا چھت سے بولی۔

”میں تمہیں قرض دے دی ہوں اور قرض دے کر میں کبھی بھولتی نہیں یاد رکھتی ہوں۔ تم سے وصول کر لوں گی بے فکر ہو۔“ اور پھر غصہ کے ساتھ آشر کو تہہ لگاتے وقت احساس ہوا کہ اس کی اصل زندگی اب غصہ کے ہاتھوں میں ہے۔ جس نے اسے خستہ کھایا ہے اپنے لیے جینا سکھایا ہے۔

وہ مگر آیا تو خاصا سرور تھا لیکن آکر اسے معلوم ہوا کہ عرفانہ کی حالت خراب ہو گئی ہے۔ اسے ہسپتال لے جایا گیا ہے۔ وہ پریشان ہو گیا اور سیدھا ہسپتال پہنچا۔ عرفانہ کا آپریشن ہوا اور اس کے ہاسٹریک پیدا ہوئی۔ اس کا دل دھک سے رو گیا۔ ان کے ارمان بھگے گئے۔ بیٹیوں کے بوجھ سے وہ واقف تھیں۔ عرفانہ کے سسرال والوں کے تیر بد لے بدلے معلوم ہو رہے تھے۔ اپنے سسرال آنے کے بعد عرفانہ کو احساس ہو چکا تھا کہ اس کی حیثیت وہ نہیں رہی جو پہلے تھی۔ بیٹی نے اس کی گردن جھکا دی تھی۔

کتنے عجیب تانوں تھے دنیا کے۔ بیٹی کو ختم دینے والی بھی ایک بیٹی پیدا ہونے والی بھی ایک بیٹی اور نذر توں کے تیر چلانے والی بھی ایک عورت..... کسی کی بیٹی۔

گویا کہ یہ اتصال عورت کا عورت کے ہاتھوں ہو رہا تھا اور وہ خاموش تھی۔ اسے خاموش ہی رہنا ہوگا۔ اسے زمانے بھر سے کیا مطلب؟ اسے تو جاوید کا خیال تھا۔ جاوید اس سے خوش رہے اسے اور کیا چاہیے۔

لیکن رات کو جب جاوید نے غصے سے بیٹی کی طرف اٹھی کرتے ہوئے کہا۔

”اے دوسرے کمرے میں سلا یا کرو۔ نیند حرام کر دی کم بخت نے۔“ جاوید یہ کہہ کر کمرہ بدل کر شایہ سو گیا لیکن پھر عرفانہ پر وہ رات بھاری گزری۔ اس غشی سی مصوم جان کو سنبھالنے لگا تو غشی نہ تھی نہ کسب تو اسے مہر بھر سکتا تھا۔

چند ہی دن بعد گوہر جس نے کہا تھا کہ وہ مسودہ یہ عرفانہ کو لے کر جائے گا تھا یہاں نے بنا کر چلا گیا کہ جلد ہی وہ بندوبست کر کے اسے بلا لے گا اور اب جلد سالوں پر عیلا ہو رہی تھی۔ مگر والدین نے اس کو وہ درپردہ ہاتھ جو ایک ادنیٰ ترین نوکرائی کو ملتا کرتا ہے۔ لیکن عرفانہ نے چپ سادہ دل۔ وہ جیسے چمکی ہو گئی تھی۔ احساسات اور جذبات نے عاری اسے معلوم تھا وہ سرنگی کرے تو کس شل بوتے پر آخر رہتا تو اسے نہیں ہے۔ اپنی بیٹی کی خاطر اسے سب جھیلنا تھا۔

لوہر غصہ نے خود ہی آشر سے شادی کا تذکرہ بھیج دیا۔ آشر نے سوچا تو ہزار بار تھا مگر مرد ہو کر بھی اس کی اہمیت نہ پڑی تھی کیونکہ ذاتی مطابقت کے باوجود معاشرتی اور سماجی طور پر ان میں کوئی ہم آہنگی نہیں تھی۔ غصہ ایک امیر گھرانے کی ہندی اور غور پسند لڑکی تھی جو صرف اپنے عشق کی خاطر اور پابندیوں کے خلاف عمل پیرا ہونے کے لیے بینک میں سروس کر رہی تھی جبکہ آشر باسیاں کی ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ طور پر گھر کا ذمہ دار تھا۔ اس کی نوکری صرف اس کی بیٹیوں کے گھر میں موجود تھی۔

اماں، اماں ٹھیل اور پھاڑ سے ذہنی نگاہ کی بھی زندگی کا سرمایہ تھی۔

وہ صرف سوچ کر رہ گیا غصہ خود ہی بولی۔

”کیا سوچنے لگے مجھے ہو تم کیا میں اچھی نہیں لگتی؟“ اس کی آواز میں وہی رد و خابینہ انداز آیا اور آشر اس کی بارش کی برباشت کر سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ تمام کر بولا۔

”مجھے میں اور تم میں بہت فرق ہے میں تمہیں وہ خوشیاں نہ دے سکوں گا جن کی تمہیں ضرورت ہے اور جو تمہارا حق ہیں۔ ایک دوست کی حیثیت سے۔ تمہیں سمجھا رہا ہوں اور متع کر رہا ہوں۔“

”بس بس کوئی نہیں تم میرے دوست، دوست ہوتے تو یوں دل توڑ دیتے میرا؟“ غصہ وہ پڑی اور آشر کے دل پر وہ آنسو بگی بن کر کرتے رہے۔

”تم مجھے کی کو شش کر غصہ۔“

”مجھے کوئی ضرورت نہیں سمجھنے کی۔ میں نے تم پر اعتماد کیا، تم کو اپنا جانا لیکن اب مجھے احساس ہوا کہ میں غلطی پر تھی۔ یاد رکھنا میں خود کو ختم کر لوں گی۔“ وہ بڑے عجیب لہجے میں بولی تھی۔ آشر کو احساس تھا کہ وہ بہت ہندی لڑکی ہے جو کہتی ہے کہ دکھانے کا خرم بھی رکھتی ہے۔ آشر اس کو اس حال میں ہرگز نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یوں مساک کے مارے محبت سے بھرے دل نے بے بس ہو کر محبت کا اقرار کر لیا اور زندگی بھر ساتھ جمانے کا عہد کر لیا اور غصہ کے گرد



پھر کسی قدر جھجک کر آشر نے ماں سے بات کی۔ اماں جواب نوشیل کی فکر میں آدمی روئی تھیں چونک گئیں۔ وہ تو خود کسی موقع پر آشر سے نوشیل کے مسئلے میں بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ ایک رشتہ تھا ان کی نظر میں۔ لیکن لڑکا نوشیل سے کافی بڑا تھا۔ لیکن اب بات کچھ اور ہو گئی تو انہوں نے خاموشی سے آشر کا کہا مان لیا۔ انہیں احساس تھا کہ بیٹا جڈ ہاتی ہے پھر سارے گھر کا دار و مدار ابھی اسی پر تھا۔ اس کی خوشنودی بہر حال مقدم تھی۔

ابامیاں بھی خوش ہوئے لیکن ان کو ساتھ کام کرنے والے ارشاد کی بیٹی یاد آگئی جس میں انہوں نے اپنی بیٹیوں کا سارو پدیکھا تھا اور چاہا تھا کہ وہ ارشاد کا بوجھ ہلکا کر دیں۔ آخر وہ بیٹیوں والے تھے اور اس بوجھ کو بخوبی سمجھتے تھے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، آشر تو فیصلہ کر ہی چکا تھا۔ بات صرف رضا مندی کی تھی اور ابامیاں کو یہ بھی احساس تھا کہ ان کے انکار سے اور تو کیا لڑکی چڑے گا مگر اتنا ضرور ہو گا کہ آشر تا راض ہو کر گھر سے بھی جا سکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے دانشمندانہ فیصلہ کیا اور آشر کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

رات جانے کیوں ابامیاں کی آنکھوں سے دو سونے سونے آنسو چھٹک پڑے۔ کیا کر سکے تھے وہ اپنی اولاد کے لیے، کچھ نہیں، نہ آرام نہ سکون، نہ اطمینان نہ اچھا بھلا خیال نہ اچھا حال اور نہ ہی اچھا مستقبل اور لڑکا تو دیکھ کر ان کی آنکھوں سے ٹھہری ہی لگ گئی۔ انہوں نے اس کی زندگی بچا کر دی تھی، اس کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا تھا یہ جانے بغیر کہ ان کی نظر اندازی سے کیا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔

دو اٹھے اور وضو کر کے جائے نماز پر گر گئے اور رو کر خدا سے کہتے رہے کہ مالک یا تو نیکیاں دیتا ہے تو ان کے فرائض سے سبکدوش ہونے کی توقع بھی عطا کر دیا کر۔

لڑکا دروازے میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ ابامیاں کہتے پریشان تھے اس کے وجود کے لیے۔ اس کی روح نے ماتم کیا تو اسے اپنا وجود کراہیت آمیز محسوس ہوا۔ وہ جانے کس خیال سے اپنے کمرے تک آئی کہ اماں نے آواز دی۔

”لڑکا..... اونٹنار..... کہاں ہے؟“

”جج..... جی اماں اب یہی جی۔“ وہ بوکھلا گئی تھی۔ جانے کیا دل میں آیا تھا اس کے ایک دم اگر اماں اسے آواز نہ دیتیں تو وہ فیصلہ کرنے کے بعد عمل درآمد کا سوچ رہی تھی۔ اپنی زندگی کو ختم

کرنے کا ارادہ کر لیا تھا اس نے۔

کنزور لڑکی کہ جس کے اختیار میں حالات نہ رہے تھے۔ اب لاچار ہو چکی تھی۔ اس کی ذات بہت سوں کے لیے تکلیف کا باعث بن رہی تھی۔ وہ بہت مستحق تھی کہ اماں نے اپنا مدد عاید کیا۔

”لڑکا بھائی کی شادی سر پر ہے اور تو بالکل بے پروا کھو جی پھر رہی ہے۔ بری بیچارہ کرنی ہے۔ ذرا میرا ہاتھ تو تھامے۔“ اور لڑکا بیٹھ کر اس طرح سر جھکا کر رہ گئی۔

پھر جو وہ دھیمیں سلاخیوں اور سونچوں میں ابھی تو اپنی سجدہ جگہ ہی بھول بیٹھی۔ اس کے ہاتھ میں وہ حسن تھا جو تخلیق پا کر اپنے منہ سے بول اٹھتا۔ اپنی بیٹیوں کے بھیڑ تیار کر کے اور اب اپنے بھائی کی زندگی تیار کر کے اس کے دل نے ایک بار پھر ہلک کر بڑی زور سے کراوائی اور وہ دل سوس کر رہ گئی۔

شادی کے دن قریب آگئے تھے۔ آشر اپنی استطاعت کے مطابق بہت کر رہا تھا۔ ابامیاں کو پیشین ملی تھی۔ جس میں سے جانے کس مقصد کے تحت انہوں نے کچھ رقم بچا لی اور باقی آشر کے پرار کر دی۔ آشر کچھ سمجھ نہ سکا بس سمجھ کر رہ گیا۔

میں نے اپنی زندگی اس گھر کے پیچھے بھا کر دی اور ابامیاں نے خوشی کے آنکھوں سے سوچ پر بھی کھنکھائی۔ اپنا پیسہ اپنا ہوتا ہے۔ وہ دل سوس کر رہ گیا۔ اس کے سر کش جذباتوں کو فیصلہ نے بھی تقویت دی تھی۔ اکثر دفتر میں جب بھی وہ ایسے مساکل اٹھا فیصلہ جانے کہاں کہاں سے قہقہے دھونڈ لاتی کہ فلاں فلاں کے نے اپنے گھر کے لیے یہ کیا، اس کے والدین نے اس کے صلے میں اسے گھر سے نکال دیا اس کمائی جھپٹائی۔

آشر کے ذہن کا کوئی نوعمر لڑکا نہیں تھا پھر بھی عورت اور وہ بھی خوبصورت، اکی سرزد وہ باتوں میں جھک کر رہ گیا۔

شادی کا دن آن پہنچا شیزا کی سسرال بہت اچھی تھی۔ جس کا ثبوت شیزا کی بھری گود خوشیوں سے دستا چہرہ اور اس کا اطمینان و سکون تھا۔ وہ شادی سے ہفتہ پہلے آگئی تھی۔ جبکہ عرفان کو صرف دو دن پہلے آنے کی اجازت ملی تھی اور وہ بھی اس شرط پر کہ وہ ویسے کے دوسرے روز ہی واپس آ جائے گی۔

انھوں نے بڑے نرم آنکھوں کو کاپتے ہاتھوں سے پونچھا اور اس کی دلجوئی میں لگ گئیں۔ جاوید نے پیسے بھی بھیجے تھے سامان اور کپڑے بھی۔ یہ مالگ بات تھی کہ اس کی ساس نے اسے کسی چیز کا

عرفانہ کی کہانی مکمل کتاب کی طرح مایاں تھی مگر اس بچاری نے جو ایک نقطہ سے نکلا ہو۔ تربیت بھی تو اماں ہی نے کی تھی وہ کس طرح چمک جاتی۔ اماں نے اس کے سر جھائے ہوئے چہرے سے نئے نئے لفظوں کے باوجود اس کی داستان پڑھ لی اور غنڈی آؤ بھر کر وہ چپ ہو گئیں جو تیری رخصتا ملک۔

شادی کے دن بڑا ہنگامہ رہا۔ عرفانہ کے چہرے پر برسوں بعد دلکش مسکراہٹ آئی تھی۔ بھائی کی شادی بہنوں کا سب سے بڑا ارمان جو ہوتی ہے۔ وہ بھائی سے خوشی کے مارے لپٹ لپٹ جاتی اور آشر کے نرم دل میں بہنوں سے محبت کا طوقان جوش میں آ جاتا۔ شادی کی رات آشر کو گاہ کہ جیسے عقیدہ نے اس کے اطراف اچالے ہی اچالے کھیر دیئے ہیں۔ رتھیں اچالے خوشبودار اچالے اور وہ اس رنگینی اور خوشبو میں کھو گیا۔

عقیدہ کے گھر والے اونچی سوسائٹی کے لوگ تھے۔ انہوں نے آشر کے گھر کے کوئے کوئے کو بڑی عقارت سے دیکھا اور سخت لفظوں میں طعنے جھنڈے دینے سے بھی باز نہ آئے۔ یہ رشتہ انہوں نے صرف اور صرف عقیدہ کی خند پر طے کیا تھا۔ وہ بھی اس وعدے پر کہ وہ جلد ہی اسے لے کر ان کے ہاں واپس آ جائے گی یعنی گھر واداد واداد معاملہ۔

یہ ساری صورتحال آشر سے چھپی ہوئی تھی۔ اسے اس حقیقت کا کچھ علم نہ تھا۔ شادی کے دن گزرے اور حالات معمول پر آنے لگے۔ آشر نے بینک جانا شروع کر دیا تو عقیدہ نے خند کی۔

”آشر میں اپنی سروس جاری رکھنا چاہتی ہوں۔ سارا دن تمہارے ساتھ تو رہوں گی یہاں اکیلے۔“ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے آشر نے سادگی سے جواب دیا۔

”اکیسے؟ کبھی ہاتھ کر رہی ہو۔ عقیدہ نگاہ سے نوشیلہ ہے ابامیاں اور اماں ہیں پھر اکیلا پن کبھی؟“ اس نے کبھی نہیں انہیں گھر سنبھالنا ہے۔ باہر کے کام میری ذمہ داری ہیں۔ اوکے۔“

اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ مگر عقیدہ روتھ کر اندر جا چکی تھی۔ وہ غصے دیا یا انگلی بچوں کی طرح خندیں کرتی ہے۔ مان جائے گی خود ہی مجھ کو ابامیاں اور اماں کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔

شام کو وہ بھی ہوئی تو عقیدہ کا فصرہ بدستور پایا۔ اس نے اسے سمجھایا تو وہ ایک اداسے ہوئی۔

”آشر میں چاہتی ہوں ہم دونوں مل کر کچھ کریں۔ اس گھر کی حالت تو سدھرے۔ یہاں

یہ سی کمانے والے کیا کم ہیں جو میں بھی ان میں شریک ہو جاؤں۔ ابھی تو تمہارے کانڈھوں پر کار اور نوشیلہ کا بوجھ بھی ہے۔“

اس کے لہجے کی نفرت مایاں تھی لیکن وہ حقیقت سے دور بھی نہیں تھی۔ آشر بھر بھر کو سوچ میں پڑ گیا۔ پھر مردانہ خود اعتمادی کے ساتھ بولا۔

”اللہ مالک ہے سب ہو جائے گا۔ تم ابھی سے فکر میں لگ گئی ہو۔ چلو کھانا لے آؤ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔“

وقتی طور پر بات آئی گئی ہوگی۔ آشر کو پر حوش مل گئی تھی۔ اس کے مہدے میں ترقی کے ساتھ ساتھ گھڑا میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔ وہ خوشی سے بھرے نہیں رہا تھا۔

”عقیدہ تم نے واقعی اس گھر میں اچالے کھیر دیئے۔ یہ دیکھو آج اچالوں کی ابتدا میری ترقی سے ہو گئی ہے۔“ سرشاری اس کے لفظوں سے لگ رہی تھی۔ مگر آشر کو اس وقت سخت مایوسی ہوئی جب عقیدہ کی طرف سے کوئی اچھا پانس نہیں ملا۔

”بڑے خوش ہو رہے ہو تم اس چند سو کی ترقی پر۔ نگار اور نوشیلہ کی منوس شکلیں تمہیں نظر نہیں آتیں؟ کہاں تک کر دے ان کے لیے یہ لوگ تمہیں گھاس تک نہیں ڈالتے۔“ عقیدہ کے لہجے میں ذہری زہر تھا۔ آشر یک لخت چپ ہو گیا۔ وہ اس خوشی کے موقع پر ان باتوں کا تصور تک نہ کر سکتا تھا۔

”تم کیا کیا چاہتی ہو؟“ وہ جیسے دور اندھیرے میں بول رہا تھا۔

”میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں۔ تم نے جیوی بنا کر اس گھر کو میرے پر دیا تھا مگر تمہاری اماں اور بہنیں مجھے اس حق سے محروم کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے کسی کو تم سے محبت نہیں ہے۔ سب تم سے پیسے کی لالچ میں یہ دکھا دے کی محبت جتاتے ہیں۔ ابھی میری شادی کو کتنے دن ہوئے ہیں کہ اماں نے نئے کپڑے جو وہ میرے لئے لائیں تھیں۔ نوشیلہ اور نگار کے لیے رکھے شروع کر دیئے۔ یہ دونوں میری جان کا عذاب ہیں۔ یہ مجھے جیسے نہیں دینا گی۔“

آشر کا سکون جاو ہو چکا تھا۔ دن بھر کا تھکا ہارا گھر میں سکون نہ پاتا تو اس کے اعصاب شل ہو جاتے۔ کوئی غیر حوقع بات نہیں تھی۔ صبح نگار بڑی توجہ کے ساتھ ناشتہ بناتی تھی۔ نوشیلہ اور نگار نے دونوں کی شادی کے کٹنی اگڑ کر جانے کے باوجود بھابھی کو ایک کام نہ کرنے دیا تھا۔ وہ صبح خود ہی بھابی کو ہمیشہ کی طرح ناشتہ بنا کر دیتی تھیں۔ چائے کے گھونٹ لیٹے وقت اس نے بے



حفیظہ نے آشر کے بدلے تھوڑے کیچے تو چالاک سے بات بتائی اور روتے ہوئے بولی۔

”آج لبا میاں نے نگار کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ وہ یہ قسم نہ سکے اور۔۔۔۔۔ آشر اس کے قرب میں ان کزرد لمحوں میں اپنے آپ سے ہار گیا۔ نگار کے خلاف نفرت کا لاوا اس کے خون میں گردش کرنے لگا۔ اب وحشت میں نگار کا وجود لبا میاں کے بعد اسے پہاڑ سے زیادہ وزنی محسوس ہوا۔ پھر ایسا ہوتا رہا کہ وہ بات بات پر نگار کو نئی طرح جھڑک دیتا۔ سخت گفتگوں میں لڑاوت دیتا اور وہ صرف آنسو بھائی خاموش پلٹ جاتی۔ مگر بن گیا تھا سب لوگ نئے مگر میں شفقت ہو گئے۔ اماں کی حالت غیر ہو چکی تھی ابابھٹا کے بعد اور اب بھو کے کرتوت دیکھ کر وہ اور لاغر ہو چکی تھیں۔ بھو انہیں آشر کے جانے کے بعد بات بات پر نپے بھاؤ کی ستانی کر دے کہ وہ کچھ بول بھی نہ پاتیں۔ جن کی بڑی سے بڑی بات پر لاوا دے کبھی نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا تھا۔ ان کی بیواں کے منہ پر وہ باتیں کر جاتی کہ ان کے دل کی دھڑکن مسدود ہوئے تھیں۔

جب اس نے یہ یک کہہ دیا کہ تم لوگ کتوں کی طرح روٹی کے ٹکڑوں کی لالچ میں آشر کی جان سے لگ گئے ہو تو ان سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہ اتار دیکھیں کہ کھڑے ہو کر شفقت بھی ڈر گئی لیکن دوسرے ہی لمحے دوسرے جھک کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شام کو نوشیلہ سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے اپنے بھائی سے بھائی کی شکایت کر دی اور جب آشر نے یہ سنا کہ شفقت نے ان گفتگوں میں اماں سے بات کی تو وہ کھول کر رہ گیا اور قبل اس کے کہ وہ اندر جا کر شفقت سے بات کرنا رو روٹی ہوئی باہر آئی۔

”خود نگار دی بھولی چلی۔“ وہ نوشیلہ سے مخاطب تھی ”تمہاری بیٹی نہیں ڈانٹیں ہیں۔“

”حفیظہ۔“ آشر بری طرح گرجا۔

”مجھ پر غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی بہنوں کو قتل کرو جو کسی کے سنبھالنے میں نہیں آ رہیں۔ ایک پرانے محلے کے اہواش سے اشارے کرتی رہی ہے اور دوسری کسی اور کو چھانسنی رہی ہے۔ گل میں نے خود دیکھا اس نے کھڑکی سے کسی سے چھپ چھپ کر بات کی۔ اور پھر اس کے ہاتھ میں ہزار ہزار کے نوٹ تھے۔ میں نے پوچھا تو اس نے کہا اس کی سبکی نے رکھوائے ہیں اس کے پاس۔ اے جیسی یہ خود بھی اس کی سہیلیاں۔“

حفیظہ کی زبان نے جو زہر اٹھا اس نے ایک ایک کو صبر لب کر دیا۔ ایک غیرت مند بھائی یہ بھلا کب برداشت کر پاتا۔ حفیظہ نے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ختم کر دیں۔

خیالی میں نگار کی جانب دیکھا جو پر اٹھا بنا رہی تھی۔ اور شاید اس کا ہاتھ جل گیا تھا۔ اچانک نگار نے پوچھا۔

”بھیا اگل دوں۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور آشر حواسوں میں لوٹ آیا۔ نگار بھائی سے بڑی نہیں تھی مگر محبت اور چاہت میں وہ آشر کو خود سے بڑا سمجھتی۔ اس کی سمجھتوں کے عوض وہ اسے کیا دے رہا تھا؟

وہ اچھ کر رہ گیا۔ مگر آیا تو ایک اور مصیبت تیار تھی۔ حفیظہ کی بیٹی اور کزرد آئی ہوئی تھیں اور اس کو سخت گفتگوں میں ملامت کر رہی تھیں کہ تو اس جھوٹے بیٹی میں پڑی ہے جیسا مگر نہیں ہے کیا؟ آشر سے یہ باتیں برداشت نہ ہوئیں اور وہ بول پڑا۔

”شوہر کا گھر بیوی کے لیے محل ہے خود وہ جھوٹا ہوا۔۔۔۔۔ اور آپ کون ہیں ہمارے معاملات میں دخل دینے والے؟“ آشر کوچ کوچ غصہ اٹھایا۔ سنے میں نگار نے آکر کہا۔

”بھیا پہلے کھانا کھا لو۔“ اس کا اتنا کہنا غصہ ہو گیا۔ شفقت زخمی تاگن کی طرح ہنسا رہی۔

”اس کھیت نے بھائی کو ایسا سرچڑھا رکھا ہے کہ وہ کسی دوسرے کی سنے تک نہیں۔ اس نے انہیں میرے شوہر کی بھانے اپنا بھائی بنا کر قید کر دیا ہے۔“ وہ روئے لگی بھر بولی۔

”آشر آج فیصلہ ہو ہی جائے میں اس مگر میں نہیں رہ سکتی۔ تمہیں الگ گھر لینا پڑے گا۔“

بات بڑھ رہی تھی چنانچہ ابابھٹا نے مصالحت کر داری آشر کی خطا ہو گیا۔ اسے علم تھا کہ شفقت کس ماحول میں پٹی ہے۔ مگر وہ کیا کرنا وہ مجبور تھا۔ پھر اس نے بینک سے لون لیا اور زمین خرید کر تعمیر شروع کر داری۔

حفیظہ کو نگار سے خدا واسطے کا پیر تھا۔ وہ اس کی شکل دیکھنے ہی ایسے نہ بتاتی کہ نگار کا کچھ پھٹتی ہو کر رہ جاتا پھر شفقت کو کچھ اور نہ سمجھا تو اس نے اقوام لگا دیا کہ نگار کی کسی لڑکے کو اشارے کرتی ہے۔ ابابھٹا کا دل دلی گیا۔ آج یہ بات شفقت نے کئی گل یہ سارا محلہ دہرائے گا۔ جبکہ بات کچھ نہیں تھی۔ وہ نگار کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ بڑی صابر، شریف النفس اور خود ارادہ لڑکی تھی۔ وہ بھوکو بھی کہہ نہ سکے۔ دل پڑ کر ایسے بیٹھے گئے کہ پھر اٹھ ہی نہ سکے۔

انہیں دل کا شہدہ دورہ پڑا اور ہزار کوششوں کے باوجود وہ سنبھل نہ سکے اور سب کو دتا لیکن چھوڑ کر آرام کی فیندہ سو گئے۔ نگار کی رورور کہ حالت خراب ہو رہی تھی۔ بہنوں نے اسے سنبھالا۔

”اے چہرے آئے تو وہ کھٹکلا کر ہنس پڑی۔ اتنا ہنسی اتنا ہنسی کہ چہری دنیا سے لفظ ایک قبیلہ معلوم ہوئی۔“

آج وہ پاگل خانے میں اپنی کوفٹری میں دیکھی بیٹھی رہتی ہے۔ کھلی آنکھوں سے دور خلاؤں میں دیکھ کر جانے کیا سوچتی اور پھر اس قدر ہنستی ہے اس قدر ہنستی ہے کہ آنکھیں بجلی جاتی ہیں۔ اس کی ہنسی بپ لگا ہے، نکلا ہوا چہرہ موت سے قریب اور زندگی سے دور ہوتا جاتا ہے۔ عورت کے ہاتھوں عورت کا اتصال۔ یہ لگا کر جانے کی تو پاگل خانے میں نگار جیسی کوئی اور صابر عورت جس کا صبر ختم ہو چکا ہو بھرتی ہو جاتی ہے اور میں سوچتی رہتی ہوں کہ آخر عورت کو کتنا صبر ملنا چاہیے۔ آخر عورت کو کتنا صابر ہونا چاہیے آخر عورت کو کتنا شاکر ہونا چاہیے۔

مگر اس کا مجھے جواب نہیں ملتا اور سوال مزید اٹھتا جاتا ہے۔ عورت کو کتنا آسان نہیں یہ کھلی کتاب ضرور ہے مگر اس کی زبان سادہ نہیں یہ ایک الجھا ہوا مصلحہ ہے کہیں سے کچھ کہیں سے نکلتا۔ عورت، عورت کو کبھی سمجھے گی بھی یا نہیں۔۔۔ یہ کون جانے ؟؟؟؟

☆.....☆.....☆

”یہ میں کیا سن رہا ہوں نوشیلہ؟“ نوشیلہ کی تو جیسے قوت گویائی سلب ہو کر رو گئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کی بھانجی کیا کچھ کہہ رہی ہے۔ وہ بے طرح رو پڑی۔

”یہ جھوٹ ہے، یہ بھیا اثرام ہے۔ اثرام ہے یہ بھیا۔“ وہ ہاتھوں میں چہرہ چپا کر اس طرح رو رہی تھی کہ اماں کا کلیجہ پھٹ گیا۔

”اگر یہ جھوٹ ہے تو دیکھو اس کی الماری میں اس نے میرے سامنے دھوٹ رکھے تھے۔“ آخر خوشخوار نظروں سے اسے گھورتا ہوا الماری کی جانب بڑھا اور اس نے ایک جھٹکے سے الماری کھول کر سارے کپڑے گرا دیے اور پھر اس کے ہاتھ میں ہزار ہزار کے کی نوٹ تھے۔ جن نوٹ نہیں انکارے تھے شیطانی تھے، خون تھے، سرخ سرخ خون۔

نوشیلہ کو کتنے ہو گیا۔ اس نے خواب میں بھی ہزار کے اسے نوٹ نہیں دیکھے تھے۔ یہ بھانجی کی چال ہو سکتی ہے۔ اس کو معلوم تھا فطرت بہت دنوں سے یہی نہیں گئی اور نہ ہی اس کے پاس اسے پیسے تھے۔ وہ پیسے سے اندر گیا اور بولا۔

”اب میں اس مگر میں نہیں رہوں گا۔ تم لوگوں کی خاطر میں نے اپنی زندگی کو زندگی نہ سمجھا اور تم نے..... اب میں ایک بل بھی نہیں رہوں گا اس مگر میں۔ چلو فطرت۔“ اور فطرت نے ایک فاحشانہ نگاہ اطراف میں دوڑائی۔ مسکرا کر نوشیلہ نگار اور بے دم ہوئی اماں کو دیکھا اور پھر آخر کے ساتھ چل پڑی۔ اماں کے لبوں سے ہنسنے لگی۔

”آ..... آخر..... نہ..... نہ..... نہ چاہیے۔ نہ چاہیے۔“ مگر آخر اس وقت اسے آپ میں کہاں تھا۔ ماں کی دم توڑتی نگاہ نے اس کے قدم نہ روکے اور وہ بچے رو واڑے کو دیکھتی رہ گئیں۔ اور انتظار بھی نہ کر سکیں۔ انہوں نے خاموشی سے آنکھیں موند لیں اور نگار دیکھتی چلی آنکھوں سے کبھی اماں کو دیکھتی اور کبھی نوشیلہ کو..... کبھی نوشیلہ کو اور کبھی اماں کو..... نوشیلہ کے شفاف دامن پر آنسوؤں کے داغ تھے۔ اور اماں کے جھریاں بھرے چہرے پر تاسف کے سائے۔ وہ اپنی بیٹیوں کو ذلت کے غار میں گرتا دیکھتی رہیں۔ اس نے نوشیلہ کے معصوم چہرے کی جانب دیکھا جہاں اب ابدی سکون تھا۔

اور پھر..... اور پھر..... نگار کو ساری کائنات کھو جاتی محسوس ہوئی۔ بھائی کی صورت نظر آئی۔ وہ کھو گئی۔ کھو جاتی تھی..... اور پھر جیسے نگار کے صبر نے دامن چھڑا لیا۔ وہ صبر کر رہی تھی مگر کہاں تک کرتی۔ نگار کا صبر اب تمام ہو چکا تھا۔ اس کی نگاہوں میں اہامیاں، اماں اور نوشیلہ کے روئے



اپنی سرکاری ملازمت کے امتحان میں کامیابی حاصل کر چکا تھا اور چند عہدوں میں اس کی تقرری ہونے والی تھی۔ متعدد باعزت گھرانوں کی خوبصورت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں ایک مدت سے دل قاسے اس کی منتظر تھیں۔ ان ٹھوس حقیقتوں سے بے نیاز راغب کے سر پر عشق کا بھوت پوری طرح سوار تھا۔ اس نے کسی کی پروا کیے بغیر سائرہ سے شادی کر لی۔ خوش قسمتی سے اس کا تقرر ایک دور دراز علاقے میں ہو گیا۔ خاندان والوں نے اسے مکمل نظر انداز کر دیا۔ چنانچہ جب تک وہ زندہ رہا کسی نے اس سے ملنا کو مارا نہیں کیا۔ جتنی بڑا لکھنے کے لڑکے میں شرکت کرنے کے لیے بھی کوئی نہیں آیا۔

## سحر ہونے تک

غزل کچھ دن کے بعد سزا مکمل کر کے نسل سے رہا ہونے والی تھی اور یہ بائی ہی اس کے لیے اصل عذاب تھی۔ قید بے گناہی گزارنے کے بعد باہر کی دنیا میں اس کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ وہ دس سال کی تھی جب باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا جو ایک سرکاری ملازم تھا۔ اس نے ترقی کے لیے نوے ہزار روپے نقد، ایک گھر اور ایک وصیت چھوڑی تھی۔ وصیت کے مطابق چنگے کا ایک حصہ کرانے پر دے کر اس سے گھر کے اخراجات پورے کئے جائیں اور نوے ہزار روپے اگر کسی نے غزل کی تعلیم اور اس کی شادی کے سوا کچھ اور کچھ خرچ کی تو اس کی روح اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ اس کا تعلق مشرقی پنجاب سے تھا۔ سائرہ ایک حوصلہ مند اور با اصول عورت تھی۔ اپنی جوانی اس نے بے انتہا مصائب میں گزاری تھی۔ قیام پاکستان سے قبل بلوچستان نے اس کے پورے خاندان کو کاٹ کر اسے اغواء کر لیا۔ لٹ لٹا کر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچی تو آخری دھون پر تھی۔ اتفاقاً ایک جہنماتی لوجھان راغب کی اس پر نظر پڑ گئی خوف خدا سے اس کا دل بیجا اور وہ اسے سیدھا اسپتال لے گیا۔ راغب نے نہایت محنت اور توجہ سے اس کا علاج کر لیا۔ سائرہ سے اس نے اس کی دل ملا دینے والی کہانی سنی اور اس سے متاثر ہو کر اس میں دلچسپی لینے لگا تھا۔

سائرہ نے اپنے رستے ہوئے زخموں پر اس کے مریح کی تاثیر محسوس کی تو ایک بار بھر زخم دہنے کی تڑپ اس کے دل میں جاگ اٹھی۔ شاید اس کا اثر تھا کہ اس کے خوب صورت دھندروں پر بہاوی سحر انگیز رنگوں سمیت روئی افراد ہوئے تھیں۔ جب راغب نے اسے شادی کی پیشکش کی تو اسے اپنی خوش قسمتی پر یقین ہی نہ آیا۔

راغب کے معزز زخاندان کو حقیقت کا طم ہو اتو وہ بھر گئے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ فسادات کے دوران غیر مسلموں کے ہاتھوں اغواء ہونے والی ان کی بہو بن جائے۔ اس پر حتم یہ کہ راغب

غزل ان دونوں کی محبت کی واحد مثالی تھی۔ وہ خوبصورت ہونے کے ساتھ اپنی ماں کی طرح سنجیدہ اور باپ کی طرح بردبار اور خوش اخلاقی تھی۔ سائرہ نے بڑی محنت سے اس کی تربیت کی کیونکہ اس کا ایمان تھا کہ بچوں کو صحیح تربیت نہ دی جائے تو ان کے اندر جانوروں جیسی خصلتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

غزل نے انجیلی بی اے کے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کی تھی کہ اس کی ماں بیمار ہو کر چار پائی سے لگ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ایک دیر پہ چار دیوے امردی اندر گمن کی طرح چاٹ دی ہے لیکن اس نے اس کی بجائے غزل کو نہ دے دی۔ اسے خوف تھا کہ غزل پریشان ہو جائے گی اور نتیجے میں اس کی پڑھائی متاثر ہو سکتی ہے۔ ایک دن وہ اپنی ماں کا ساتھ کرانے کے بعد ڈاکٹر کو دروازے پر رخصت کر دی تھی کہ ان کا کرایہ دار داخل اس کے پاس آ گیا۔ اس نے اپنی نظریں نیچی کرتے ہوئے پوچھا۔

”میں گزشتہ تین دنوں سے ڈاکٹر کو آپ کے گھر آتے دیکھ رہی ہوں آنٹی کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ وہ غزل کی ماں کو آنٹی کہتا تھا۔

غزل نہایت کم گو تھی اور اسے انجینی لوگوں سے گفتگو کرنا پسند نہیں تھا تاہم اس نے اخلافا جواب دیا۔

”ای شہ پہ چار ہیں۔“ وہ اگر سند لکھے میں بولا۔  
”اگر آپ عزائم انہیں تو میں ان کی حراج پری کر لوں۔“ غزل امرد کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

”یہ ای کی مرضی پر منحصر ہے۔ میں ان سے دریافت کر لیتی ہوں۔“ راغب نے اس میں ہنسی

تری یادوں کے گلاب

سالہ دہلا چٹا اور سارٹ جواں تھا۔ تین برس پہلے جب وہ ان کے چنگے کا ایک حصہ کرائے پر لینے آیا تو سائرہ نے صاف انکار کر دیا۔ اس انکار کی وجہ یہ تھی کہ ریاض تن تھا تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ کرائے دار شادی شدہ اور بچوں والے ہونا چاہیے۔ لیکن جب ریاض نے وردناک انداز میں اسے بتایا کہ کس طرح اس کا پورا خاندان بلکہ شیش ماں مار گیا اور وہ خود بھی تکلیفوں سے پاکستان پہنچا تو اس کا دل پیچنے لگا۔ ریاض کا کہنا تھا کہ اس کے باپ نے حفظہ المذہب کے طور پر اپنے بچہ ۱۴ سال پہلے ہی پاکستان منتقل کر دیئے تھے۔ اس کے دل بوٹے پر اس نے اپنا اپورت ایک سپورٹ کا برنس بٹایا تھا۔

سائرہ نے ہلکا خرچہ لگے کا ایک حصہ اسے کرائے پر دے دیا۔ ریاض نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کسی شکایت کا موقع نہیں دے گا۔ گزشتہ تین سالوں سے سائرہ کو یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ وہ رات کو کبھی دیر تک باہر نہیں رہا اور نہ ہی کبھی اس نے اپنے کسی دوست کو اپنے پاس مدعو کیا۔ غزل نے دائیں آکر اس کو بتایا کہ ریاض اس کی حواج پر سی کے لیے آتا چاہتا ہے۔ اس کو یہ جان کر ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا کہ اس کی بیٹی کے علاوہ کوئی اور شخص بھی اس کی پیاری سے پریشان ہے۔ ان نے فوراً اسے بلوایا۔ ریاض تمہاری دیر بیٹا اپنی عادت کے مطابق نظریں نیچی کیئے نہایت اپنا نیت سے باتیں کرتا رہا۔ پھر کا ایک شکایت آ میر لکچر میں بولا۔

”آئی ٹی مجھے اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ آپ نے مجھے اپنی پیاری کے بارے میں از خود بتانا پسند نہیں کیا۔ یہ درست ہے کہ میرا آپ کے ساتھ خون کا رشتہ نہیں بہر حال انسان اور مسلمان ہونے کے باطن تو میرا آپ سے کبھی نہ ٹوٹنے والا قطع ہے۔ آپ یقین کریں کہ میں آپ بھی اولوالعزم اور بلند حوصلہ خاتون کو دل کی گہرائیوں سے حقیقی ماں کی طرح چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ جب تک آپ بیمار ہیں ڈاکٹر اور دواؤں کے لیے میں خود جھاک دوڑ کر دوں۔“

ریاض کی اینٹوں بھی باتیں سن کر سائرہ کا دل بھرا یا۔ دنیا میں اس کا بیٹی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ایک شام اس کی طبیعت اچھا کی گئی۔ ریاض اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ غزل باورچی خانے میں کھانا تیار کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ سائرہ نے ورد سے غل حال ہو کر ریاض کا ہاتھ پکڑ لیا اور فکڑے فکڑے لکچر میں بولی۔

”بیٹا میں جانتی ہوں کہ اب میں زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکوں گی میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ لیکن میرا دل غزل کے لیے پریشان ہے۔ میں نے اپنی پھول جیسی بیٹی کو بڑی قشادگی اور

تری یادوں کے گلاب

آرزوؤں سے پالا ہے۔ کبھی غم کی پر چھانیاں اس کے پاس نہیں چھٹکتی تھیں سو جتنی ہوں میرے بعد اس غریب پر کیا بیتے گی۔ کاش میں نے اس کی شادی کر دی ہوتی۔“

ریاض نے فوراً انکو کمر لکچر میں جواب دیا۔

”آئی ٹی آپ درست کہتی ہیں۔ دنیا بہت غراب ہے۔ تھلاڑی کو جیسے نہیں دیتی۔ مجھے بھی یہی لگتا تھا۔ چار ہی ہے خدا خواست میرے منہ میں خاک، اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں بھی اس کی دیکھ بھال کرنے سے معذور ہوں گا ورنہ لوگ غراہات کا جھنڈا بن جائیں گے۔“

بے بس سائرہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قدرے وقف کے بعد ریاض نے چنگے تے ہوئے کہا۔

”آئی ٹی میرے دل میں ایک بات ہے۔ لیکن ذرا ہوں کہیں آپ نہ اذیتائیں۔ دیکھیں غزل کی طرح میں بھی دنیا میں تنہا ہوں۔ اگر آپ مجھے اس قابل سمجھیں تو غزل کو میری زندگی میں شامل کر دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اسے بے پناہ پیار دوں گا اور میری زندگی میں اس پر غم کی پر چھانیاں بھی نہیں چڑے گی۔“ کہتے کہتے اس کا منہ سوکھ گیا اور وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ اس کی توقع کے برعکس اس کی بات سن کر سائرہ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ خوشی سے بے قابو ہو کر بڑبڑائی۔

”بیٹا اتم ایک ایک اور شریف انسان ہو مجھے تم پر عمل اعتماد ہے اپنی بیٹی کی رائے پر چلوں ویسے مجھے اُمید ہے کہ وہ انکار نہیں کرے گی۔“

ریاض کے جانے کے بعد اس نے غزل کو بلا کر مڑوہ بتایا تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے ابھی تک شادی یا کسی مرد کے متعلق سوچا ہی نہیں تھا اس کی زندگی کتابوں کے گرد گھومتی تھی۔ وہ ریاض کے بارے میں صرف یہ جانتی تھی کہ وہ ان کا کراہیہ دار ہے اور اس نے کرائے کی بروقت ادائیگی کے علاوہ کبھی انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ لیکن اس کا ماضی کیا ہے۔ اس کے ذاتی خیالات کس نوعیت کے ہیں۔ وہ زندگی کو کس زاویے سے دیکھنے کا عادی ہے۔ اس بارے میں وہ غرض مند ہو گئی۔ ظاہر ہے ایک تعلیم یافتہ لڑکی کے ذہن میں اپنے ہونے والے شوہر کے متعلق اس قسم کے سوالات قدرتی طور پر اٹھتے ہیں۔ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ورد سے ترقی ماں کے تاثرات دیکھ کر اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اس کے منہ سے صرف ہاں سننا چاہتی ہے۔ چنانچہ اس نے جذباتی لکچر میں جواب دیا۔



"اُمی میرے مستقبل کی بابت فیصلہ کرنے کا اختیار صرف آپ کو ہے آپ جو کچھ کریں گی وہ میرے حق میں بہتری ہوگا۔" دوسرے دن چند پڑوسیوں ڈاکٹر اور اس کی نرس کی موجودگی میں نہایت سادگی سے غزل کا نکاح پر حوالہ دیا گیا۔ اس مختصر تقریب میں شرکت کرنے والا ہر شخص دل ہی دل میں سائرہ کی حالت زار پر افسوس کرتا رہا۔ چند عورتیں آبدیدہ بھی ہوئیں کیونکہ انہیں صدمہ تھا کہ اس کی شادی عداوت کے سبب غزل کی شادی دھوم دھام سے نہ ہو سکی اور جس شادی میں ہنگامہ رانی نہ ہو بھلا وہ بھی کوئی شادی ہے؟

تیسرے دن سائرہ سوئے میں چل بسی۔ اس کے سر وہ چھوٹے سے ایک آسودگی ملاری تھی۔ غزل پر قیامت ٹوٹ گئی۔ ریاض کی اپنی حالت خراب تھی۔ تاہم اس نے غزل کو مدت و حوصلہ بنے کے لیے بادل خواست اپنے آپ کو سنبھالا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غزل کے غم میں کمی آ گئی۔ ریاض ایک عام سادہ تھا لیکن اس کے غلوں سے حائر ہو کر غزل اسے دل و جان سے چاہنے لگی۔ وہ اکثر تنہائی میں سوچتی کہ اس کی مرحوم ماں نے بروقت اس کی شادی کر کے اچھائی کیا اب وہ دنیا میں بے سہارا نہیں۔ اس طرح چھ ماہ گزر گئے۔

ایک دن کھانا کھانے کے دوران غزل نے غصے سے کہا کہ ریاض کچھ اچھا اچھا اور کھانا کھانا سا ہے۔ اس نے پریشان ہو کر اس سے اس کا سبب پوچھا تو اس نے ہال دیا لیکن جب غزل کا اصرار بڑھتا گیا تو وہ دہائی شکل بنا کر بولا۔

"میں نے بیرون ملک سے سات لاکھ روپے کا سامان امپورٹ کیا۔ ایک مقامی پارٹی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ رقم ادا کر کے سامان چھڑائے گی۔ اس طرح پچاس ہزار روپے مجھے بچ جائیں گے لیکن میں موقع پر پارٹی کا بھگ ہو گئی۔ اب میں پریشان ہوں کہ اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤں۔"

"آپ بینک سے قرض لے لیں۔" غزل نے مشورہ دیا۔

اس نے اس افکاروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بینک سے مجھے ایک لاکھ تک قرض مل سکتا ہے۔ میں نے وہی لے کر ایل سی بھلوائی تھی۔

بہر حال تم پریشان مت ہو، یہ میرا مسئلہ ہے۔" غزل شکایت آہستہ آہستہ میں بولی۔

"یعنی آپ کا مسئلہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ نے بڑا اچھا کیا جو مجھے میری حیثیت کا

اساس دلا دیا۔" ریاض نے غزل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"غزل خدا کے لیے مجھے غلط سمجھو۔ تم جانتی ہو کہ دنیا میں تمہارے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔

مجھے تم سے اتنی محبت ہے کہ میں آفس میں تمہارے ہی تصور میں کھویا رہتا ہوں۔ یہ ایک معمولی کاروباری پریشانی ہے اور وہ ہو جائے گی۔"

اگلے روز غزل نے رات کے کھانے پر پوچھا۔ "آپ کے مسئلہ کا کوئی حل نکلا۔"

اس نے خرا سامنے بنا کر جواب دیا۔ "قسمت خراب ہے میں نے مختلف دوستوں سے قرض

لینے کے لیے رجوع کیا ہر ایک نے اپنی اپنی بھجوری کاروبار دیا۔ کاش کسی طرح یہ رقم میرے پاس

آ جاتی تو پچاس ہزار کے بجائے ڈیڑھ لاکھ کا منافع ہوتا۔"

غزل نے آہستگی سے سوال کیا۔ "اگر کوئی بندہ دست نہ ہو سکا تو کیا ہوگا؟"

ریاض نے سر وہ لہجے میں کہا۔ "مجھے چند سالوں کے لیے ٹیبل جانا پڑے گا۔"

اس کا یہ ہولناک جلسہ کر اس پر بجلی کر گئی اور وہ ہڑا کر اٹھ ٹٹھی۔ خوف کے مارے

اسے پیسے آنے لگے۔ ریاض کے چل جانے کے بعد اس کا کیا ہوگا۔ اس نے کپکپاتی آنکھوں میں کہنا

شروع کیا۔

"خدا کے لیے ریاض کچھ کرو۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں جیتے ہی سرجاؤں گی۔ میرا آپ

کے سوا بے کون؟"

ریاض کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ اپنے ہونٹوں پر زبان بھیر کر گلو گیر لیجے

میں بڑ بڑایا۔

"میں خود پریشان ہوں۔ پچس کر رہ گیا ہوں۔ کوئی بڑی چیز بھی پاس نہیں جسے چا کر رقم

حاصل کر سکوں۔" وہ خاموش ہو کر اپنے ہونٹ کاٹنے لگا بجز زہر لب بڑ بڑایا۔ "ایک صورت ہے،

لیکن مجھے ذاتی طور پر پسند نہیں۔"

غزل کے اصرار پر اس نے تجویز پیش کی کہ "ہم فی الحال یہ بلکہ فروخت کر دیں۔ یقیناً اس

نئے سات آٹھ لاکھ روپے مل جائیں گے۔ سامان چھڑانے اور فروخت کرنے کے بعد ہم ہی رقم

سے کسی اور جگہ کوئی بلکہ خرید لیں گے۔ یہ کہتے کہتے اس نے غزل کو کن انکھوں سے دیکھا۔ غزل کو

دھچکا لگا۔ اس ہنگامے کو اس کے مرحوم باپ بے بڑے شوق سے تقریر کر رہا تھا اور اس کے ایک ایک

کوشے سے اس کے ہاضی کی حسین اور خوشگوار یادیں وابستہ تھیں۔ پھر بھی اس نے اپنے دل پر ہاتھ

قری یادوں کے گلاب

رکھے ہوئے ریاض کو اجازت دے دی۔ بگھر فروخت ہونے کے بعد وہ ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئے جس کا کرایہ زیادہ نہیں تھا۔ نئے احوال میں غزل کو پہلے پہل آسنا ہٹ ہوئی، مگر اس کا دل ڈوب ڈوب جاتا تاہم وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دیتی کہ چند ہفتوں کی بات ہے۔ مال کی فروخت کے فوراً بعد ایک شاندار بگھر خرید لیا جائے گا۔ ممکن ہے وہ پہلے کی نسبت زیادہ پرکشش ہو۔ ایک دن ریاض خوش خوش گھرا آیا اور اس کے سامنے چند کاغذات پھیلا تاہواچکا۔

”جہاں میں ایک نیا کار باری اور وہ تمہارے نام سے رجسٹر کرانے لگا ہوں۔ تم نے میری صحبت میں جس طرح بلا چن و چاں اپنے باپ کا بگھر فروخت کر دیا، اس نے مجھے تمہارا زرخیز نظام بنا دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس دوسری کہنی کی قانونی طور پر تم خود مالک تصور کی جاوے۔ میں لیبر کی حیثیت سے کاروبار کی دیکھ بھال کروں گا۔“ غزل کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس نے اسے موقع دیئے بغیر اس کا ہاتھ تھام لیا اور جذباتی انداز میں بڑبڑایا۔

”خبردار میری مخالفت نہ کرنا۔ میری ایک چھوٹی سی خواہش تھی جس کی تکمیل ہو رہی ہے۔ اس میں ایک فائدہ بھی ہوگا کہ ہمیں اگر ٹیکس بچانے میں مدد ملے گی۔“ غزل نے اس کے آخری منٹے کو ذہن میں رکھتے ہوئے خاموشی سے کاغذات پر دھیلا کر دیئے۔ کہنی تکمیل پا چکی۔ ریاض بہت خوش تھا۔ وہ بات بات پر قہقہے لگاتا۔ غزل کے لیے اس نے نت نئے تحائف کی بھرمار کر دی تھی۔ غزل کا خیال تھا کہ یہی پہلی کہنی کی طرح اسپورٹ ایکسپورٹ کا کام کر رہی ہوگی۔ لیکن ایک دن جب اس نے ریاض کے بیک میں دو جنوں اسپورٹ دیکھے تو حیرت سے ان کے بازو میں ہنستا دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”مجھے سعودی عرب کی ایک کہنی نے ریکرونگ کا ٹھیکہ دیا ہے۔ تم دیکھنا تمہاری کہنی ایک ڈیڑھ سال میں مال مال ہو جائے گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے برف گیس میں رکھے ہوئے نوٹوں کے ذخیرہ دکھائے۔

غزل تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود زندگی کے عملی پہلوؤں کے بارے میں بہت کم علم رکھتی تھی۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ اس کی ماں نے اس کو شروع ہی سے تجارتی پسند بنا دیا تھا۔ کالج میں اس کی ایک دو سہیلیاں تھیں مگر وہ بھی اسی طرح کی۔ ہر وقت مطالعے میں مصروف رہتیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ریکرونگ کے بزنس کو ایک عام سا بزنس جان کر اس کے متعلق اپنے شوہر سے کوئی پوچھ بچھ نہیں کی۔

قری یادوں کے گلاب

ایک ماہ بعد ریاض نے راتوں کو گھر سے غائب رہنا شروع کر دیا۔ پہلی بار اس کی اس حرکت پر فکر نشوونما کے سبب غزل کے اعصاب جھنجھٹا اٹھے۔ وہ ساری رات جاگتی رہی اور ایک بل بھی درہے سے ہٹا کر وہ نہیں کیا۔ اسے لگتا تھا کہ ابھی اس کے شوہر کی گاڑی آتی دکھائی دے گی لیکن وہ نہیں آیا۔

صبح اس نے اس کے دفتر فون کیا۔ وہ وہاں موجود تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی اس نے معذرتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا۔ دوپہر کے وقت وہ مگر پہنچا اور اسے سمجھانے لگا۔ ”کاروباری مصروفیات بالکل بڑھ گئی ہیں۔ سعودی عرب جانے والوں کے انتظار کے سلسلے میں مجھے دوسرے شہروں میں جانا پڑتا ہے۔ اگر میں بروقت اطلاع نہ دے سکوں تو طویل نہ کرنا۔ بس ایک دو ماہ کی بات ہے۔ افرادی قوت کی سپلائی کا ٹھیکہ پایہ تکمیل تک پہنچ جائے پھر تمہیں یورپ کی سیر کرانے لے جاؤں گا۔ ہم دوپہر میں اور بخیر اہم کم از کم چار ماہ گزاریں گے۔“ اس نے ہشاش بشاش انداز میں قہقہہ لگایا۔ غزل مستقبل کے حسین پہنوں میں کھو گئی اور اسے ایک بل کے لیے بھی شبہ نہ ہوا کہ ریاض نہیں اس کی بد نصیبی عین مقصد میں کھڑی اس پر قہقہہ لگا رہی ہے۔

ایک بار ریاض مسلسل عین ہفتوں کے لیے غائب ہو گیا۔ پہلا ہفتہ تو اسلام آباد اور کراچی سے روز اس کے فون آتے رہے لیکن پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایک دن اس کو ایک مختصر سا خط اسے ملا جو بیروت سے لکھا گیا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ وہ اس سے آگٹا گیا ہے اور اب اس کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس خط کے ساتھ ہی طلاق نامہ منسلک تھا۔ وہ چھٹی چھٹی آنکھوں سے اس کاغذ کے پڑے کو نکلے جا رہی تھی اور پھر یکدم بیہوش ہو کر گر پڑی۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ یہ دیکھ کر چکر لگی کہ پولیس کے دو زخموں سپاہی اور چند پڑوسی اسے گھیرے کھڑے ہیں۔ اس کو پانی پلا یا گیا۔ حواس بحال ہوئے تو اس پر بدھنت ناک انکشاف ہوا کہ اس کی بیہوشی کے دوران پولیس نے اس کے گھر کا دروازہ توڑ کر ہر کوئی کی تلاشی لی اور اس علاقہ کی دو سو چالی اسپورٹ، چھٹی مہر کی اور تیس پڑوسیوں نے نقد برآمد کر لیے۔ متعدد افراد کی شکایت پر پولیس نے پہلے ریاض کی ریکرونگ ایجنسی پر چھاپہ مارا اور وہیں سے اس کے گھر کا پتہ حاصل کیا۔

ریاض لا پتہ تھا لیکن غزل کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے اپنے بیان حلفی میں سچ بولتے ہوئے



تری یادوں کے گلاب

اعتراف کر لیا کہ پاسپورٹ میری اودھ میں بڑا درد پہنچا رہا تھا۔ آخری بار جاتے وقت اس کے سپرد کیے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے پولیس کو اصل حال سے بھی آگاہ کر دیا۔ وہ بے سمجھاہ تھی۔ اسے اپنے شوہر کی جعل سازی کا کافی بھرا اندازہ نہیں تھا۔ اس نے اس کا آخری خط اور طلاق نامہ دکھا لیکن اس کی صداقت پر کوئی کان دھرنے کو تیار نہیں تھا۔

پولیس نے ریاض کو مضر و قرضہ دے کر غزل کے خلاف دھوکہ دی اور جعل سازی کا پالانچ عدالت میں پیش کر دیا۔ چند ماہ تک اس مقدمہ کی کارروائی جاری رہی۔ اس کے بعد ایک عدالت اسے مجرم قرار دے کر دو سال قید یا مشقت کی سزا سنائی۔

تقدیر کے اس بے باک مذاق پر وہ بہت روئی۔ لیکن بے گناہوں کے تو بے پنیے سے چاند اور سورج کی گردش پر کیا فرق پڑتا ہے۔ بھول کھٹے ہیں، نشان دکھاتے ہیں اور پھر دھول میں غمیر جاتے ہیں۔ موسموں کی آنکھ بھری اس پر کوئی اثر نہیں ذاتی۔ زندہ رہنے کی لاشعوری خواہش انسانوں کو میر پر رخصت کر لیتی ہے۔ یہی کچھ غزل کے ساتھ ہوا کب تک روتی اس کی آنکھیں قبرستان کی طرح سنسان ہو گئیں اور اس نے بے بسی سے سوچا کہ میرے ساتھ جو وہ اس میں ضرور اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی۔

شاید اسی سوچ کا نتیجہ تھا کہ وہ چھ ماہ سے بھی کم مدت میں جیل کے ماحول سے ماؤں جو مٹی۔ معاشرے کے تھکیل دیئے ہوئے اس جرم سے اسے دوا اپنے آپ کو محفوظ پائی تھی۔ یہاں کوئی عورت دوسری کو قصہ نہیں دیتی تھی کیونکہ قانون کی نظر میں وہ سب کی سب مجرم تھیں۔ معاشرے نے ان کو بے رحمی سے دھتکار دیا تھا اور انھیں اپنے ٹھکانے جانے کا بے حد غم تھا۔ پھر بھی یہ گوشان کے لیے گوش عافیت تھا۔

جیل میں اپنی آخری رات گزارتے ہوئے غزل ایک جلی کے لیے نہیں سوئی۔ وہ دروازے کی سٹافوں کے ساتھ سرنگائے ڈارے ڈارے انداز میں مسلسل سوچ رہی تھی کہ پانچ کے بعد وہ کہاں جائے گی اور کیا کرے گی۔ ماں کی موت کے بعد اس کا واحد بھائی اس کا شوہر تھا لیکن طلاق کے بعد اس کی یہ بوسا بھی فوت ہو گئی۔ اس کا بھگ اس کا واحد اٹا تھا۔ ریاض نے دھوکے بازی سے اس کو بکرا کر ساری رقم ہتھیائی تھی۔ اب وہ بالکل تلاش تھی۔ اس نے خوفزدہ ہو کر سوچا، جیل سے رہائی پا کر مجھے کون سر بچانے کے لیے جکدے سکتا ہے اور پھر کھانے پینے کا بندوبست فوری طور پر کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟

تری یادوں کے گلاب

اس کی یہ مشکل حیرت انگیز پر جیل کے پرنسٹن فنڈ نے حل کر دی۔ رہائی کے وقت ضابطے کے کاغذات پر اس کے حقدار ہونے اس نے اسے اس کو اخلاقی قدروں پر ایک طویل اور جذباتی پیچھے دیا جس کا لب لہجہ تھا کہ اسے باقی بے گناہانہ زندگی میں کسی قسم کا جرم نہیں کرنا چاہیے۔ غزل کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پرنسٹن فنڈ یہ سلیج سوچ کر بہت خوش ہوا کہ اس کے پند اثر و خط کے سبب وہ عمارت کا اعتبار کرنے پر مجبور ہوئی ہے۔ نام۔ اس نے اس سے اس کے گھر کا پتہ پوچھا۔ وہ ہکا کر ہوئی۔

”سراسیمہ کوئی تھا کہ نہیں۔ میں نے آپ کو بتا دیا تھا اس کے میرے شوہر نے مجھے طلاق دے دی تھی اور پولیس نے مجھے گرفتار کرتے وقت میرے گھر گھر کی تمام اشیاء ضبط کر لی تھیں۔ ظاہر ہے مالک مکان نے اپنا مکان بکاہرائے پر دے دیا ہوا ہوگا۔

پرنسٹن فنڈ سوچ میں پلٹا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ان کے دروازے پر اپنے ہمراہ آنے کا اشارہ کیا۔ جیل کے گیٹ سے باہر نکل کر اس نے بھولی آنکھوں سے چاند اور دروں طرف دیکھا اسے ایک عجیب سے کھیلنے والے کا احساس ستار ہالانہ کے بیرونی اماں ٹھٹھ میں اضافہ کے کوادرڈ بنے ہوئے تھے۔ پرنسٹن فنڈ اسے اپنے کھیل لایا۔ راست میں وہ اسے بتا چکا تھا کہ اس کی بیوی جلی ٹیک دل اور رومل ہے لیکن قوت ہے کہ اس کے حراز شہزادہ میں شک کا عنصر غالب ہے۔ غزل کو چکی نظر میں وہ ادا جز عورت بہت مہم کی۔ اس کے شوہر نے جوں ہی غزل کی داستان سنائی تو اس نے بے اختیار اسے اپنے گھما لیا لیکن پرنسٹن فنڈ اس کے جاتے ہی اس کے چہرے پر خن کی آواز نکلیاں ہو گئیں۔ اس نے اذ شکایت آج اندازہ انداز میں اپنے شوہر کے بے وفائی کے قصے سنانے شروع کر دیے۔ غزل نے پانچ کے بچے سے زمین پر لڑائی کرک گئی۔ وہ چند ماہ پہلے بہت خوش تھی کہ اللہ نے قیام سے غرضت گئی کہ مدد کی ہے۔ وہ لٹاؤ وہ کچھ دن اس کے گھر میں گزارنے کے بعد اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرے گی۔ پرنسٹن فنڈ پانچ دن کی بیوی کے انکشافات کے بعد اس کا یہاں قیام ناممکن تھا۔ اچانک ادا اور کمرے سے چلی نکلی تھی تو بڑی دیر بعد وہ اس آکر اس نے غزل کو دروازہ پر دے دیے اور پھر چلے گئے۔

”خدا کا واسطہ تم اس نے سے پہلے چلی جاؤ۔ میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھولوں گی۔ میرا شوہر دو سال پہلے اسی طرح ایک رہا۔ ہونے والی لڑکی کو گھر میں لایا تھا، لیکن ایک بچے بعد وہ اسے میری سہیل پر چل گیا۔ میں نے اسے اس کو کسی نہ کسی طرح چٹا کیا لیکن

”تم نے لباس تبدیل نہیں کیا؟“

میں اس وقت وہ غزل کو دیکھ کر خشکا۔ وہ ڈولی کا بھائی حسین تھا، حسین یکلفت خوشی

سے چلا یا۔

”آپ..... آپ اکیلی آئی ہیں آئی نہیں آئیں؟“

غزل کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ اس کی مرحومہ ماں کے بارے میں سوال کر رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس نے اپنی ماں کی موت کی خبر ڈولی کو نہیں دی تھی۔ وہ اپنے اوپر قابو پاتے ہوئے افسردہ لہجے میں بولی۔

”ہی کا انتقال ہو چکا ہے ڈولی کہاں ہے؟“

اسی اثنا میں گاڑی والا شخص بھی اندر آ گیا تھا لیکن اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔

حسین پریشان لہجے میں بولا۔

”ڈولی اور گھر والے مری گئے ہوئے ہیں۔“ اس دہشت ناک انکشاف نے اسے ہلا دیا۔

کراچی میں وہ کسی اور کہیں جاتی تھی۔ اگر گھر میں حسین تھا ہے تو وہ وہاں کیوکر قیام کر سکتی تھی۔ اس

کا ذہن پریشان ہو گیا۔ دوسرا شخص حسین کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

”تم عجیب انسان ہو۔ ہمیں انہیں کیا کھڑے کھڑے چل کر دے۔ جانے کہاں سے

سڑ کر کے آئی ہیں۔ پھلے فانس انہیں ڈرائیجک روم میں بٹھاؤ۔“ حسین نے شرمندہ ہو کر ذرا ذرا

کھولا اور سڑ کے اشارے سے اندر آنے کو کہا۔ غزل چنگاپائی لیکن طویل سڑکی جھکن کے زیر اثر

اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ حسین نے فریج سے کوئلہ ڈرنک نکالنے کے لیے کیا تو

انہی نے ہچکچاہٹ۔

”آپ کہاں سے تشریف لائی ہیں؟“

”لاہور سے۔“ اس کا جواب مختصر تھا۔

انہی نے اپنے ہونٹ نکلیے اور بولا۔ ”ڈولی لوگ دو ماہ بعد مری بسے وہاں

آئیں گے۔“

”دو ماہ بعد۔“ اس نے گھبراہٹ میں ہاں کا جلد ہرایا۔ جیسی کبیر ہا تھا۔

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ نے جب تک رہتا ہوں یہاں رہیں۔ حسین موجود

ہے۔“ اسے میں حسین کوئلہ ڈرنک لے کر آ گیا۔ وہ جوشیلے لہجے میں چلا یا۔

پھر جاتی ہو میرے شوہر نے مجھے کیا سزا دی۔ ”وہ خاموش ہو کر دستہ ہائے نظروں سے اسے دیکھنے لگی پھر خود ہی بولی۔

”مجھے ایک سال اپنے سینکے میں گزارنا پڑا۔“

غزل نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے کوارٹر کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اس

کے قدم تیزی سے سڑک کی طرف اٹھ رہے تھے۔ ایک طویل عرصہ کے بعد اس نے طبلے دھکا دیں۔

تیز رفتار گاڑیاں اور انسانوں کے جھوم دیکھے تھے۔ اسے حیرت اور پریشانی کا طائرہ احساس ستانے

لگا۔ اس وقت موسم صاف اور دھوپ تیز تھی۔ اس نے ایک رکشہ روکنا اور تارنگی آگئی۔ اس کا ذہن

ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ پرنٹنگٹ نے بھی دوسروں سے اپنے تھے۔ پرنٹنگٹ نے اسے بتایا

تھا کہ ڈیڑھ سال کی سزا بچھنے کے دوران اس سے حکام نے جو مشقت لی ہے یہ دوسروں نے اس کا

محاصرہ ہے۔ غزل نے ایک اٹپٹی کپڑے اور پینے کے لیے چند کپڑے خرید لیے اور اس کے بعد اس

نے ایک بار پھر رکشہ غمرا یا اور اس میں بیٹھ گئی اور اسے انٹیشن کی طرف چلنے کے لیے کہا۔ وہ لاہور کو

خیر باد کہہ کر راہی جاری تھی۔

سڑک کے دور۔ ان اس کی حالت بت بھی تھی۔ اس نے کسی سے بات نہیں کی۔ مسکراہٹ تو

جیسے اس کے چہرے سے ناہید ہو چکی تھی۔ آزاد دنیا میں اس کا جو ادب جیسا تھا۔ کراچی آنے کا

فیصلہ اس نے اس لیے کیا کہ اس کا خیال تھا کہ صرف اسی طرح وہ لاہور اور لاہور سے وابستہ تھی اور

زیر ہلی یادوں کی ہولناک گرفت سے وہ نجات پاسکتی ہے۔ وہ اپنی مرحومہ ماں کے ساتھ دوبارہ

کراچی آ چکی تھی۔ اس کے سکول کی سبکی ڈولی بھی جاہ کر سیک آئی تھی۔ اس نئی دلوں نے ایک

بار اس کے ہاں قیام بھی کیا تھا۔ غزل کے ذہن میں تھا کہ وہ فی الحال ڈولی کے گھر قیام کرے گی۔

بعد ازاں ملازمت مل گئی تو علیحدہ علیحدہ کمانڈو دست بھی ہو جائے گا۔ کیٹ انٹیشن پر گاڑی رکھی تو

وہ جلدی سے نیچے اترتی۔ باہر آ کر وہ ایک ٹیگسی میں بیٹھ گئی اور ڈرائیور کو پوچھ جانے لگی۔ جب وہ

ایک چھوٹے بچے کے کھلے ہوئے گیٹ میں داخل ہوئی تو متحجب سے ایک گاڑی کے پارک کی آواز

اُبھری۔ اس نے سر کر دیکھا ایک لمبوتر سے چہرے والا نوجوان سمجھا۔ نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

دونوں کی نظریں چارہو نہیں۔ غزل نے فوراً اپنا منہ موڑ لیا۔ اس نے وہ قدم ہی اٹھائے تھے کہ اندر

سے ایک سانو لے رنگ کا نوجوان تیزی سے باہر کی طرف لپکا۔ گاڑی میں سوار شخص غالباً اس کا

بہنوٹ تھا، کیونکہ وہ اس کو دیکھنے ہی چلا یا۔



تری یادوں کے گلاب

”ہائل..... ہائل“ غزل کو یوں لگا جیسے وہ نیچل کی مصیبت سے نجات پانے کے بعد ایک نئے عذاب میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اس نے ان دلوں کے اصرار پر بیوں اپنی اور گہرا سانس لے کر کہنے لگی۔

”یہ مناسب نہیں ہے میں آپ لوگوں کی نمون ہوں گی اگر آپ کسی شریعت اور سستے ہوٹل میں میری رہائش کا بندوبست کر دیں۔“ ان دلوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا قدرت توقف کے بعد تین بولا۔

”کسی تھلاڑی کے لیے ہوٹل کا مائلو اچھا نہیں آگے آپ کی مرضی۔“ غزل کے دل پر ایک اور چرکا لگا۔ اگر وہ تنہا ہوتی تو اپنی بے بسی پر پھوٹ پھوٹ کر روتی۔ دلتا انجینی نے اپنا پاپ سٹگتے ہوئے دریافت کیا۔

”کیا آپ کراچی سیر و تفریح کے لیے آئی ہیں؟“

اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

”جی نہیں۔ میرا ارادہ یہاں مستقل قیام کا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کچھ عرصے کے لیے میری رہائش کا بندوبست ہو جائے۔ اس دوران میں ملازمت تلاش کر لوں گی۔ پھر سارے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔“ شین نے بے صبری سے کہا۔

”غزل آ کر تمہیں ہمارے گھر میں ٹھہرنے میں اعتراض کیا ہے؟“

وہ سوچ رہی تھی کہ منہ باندا انداز میں اپنا مفہوم اس کو کس طرح پہنچائے کہ انجینی بولا۔

”ایک غیر شادی شدہ لڑکی کا اس طرح اکیلے تنہا رہنا صحیح نہیں ہے۔“ غزل نے جواب دیا۔

”میرا مشورہ ہے کہ آپ وائی ڈبلیو اے ہوٹل میں رہائش کر لیں۔ جب ڈولی واپس آ جائے تو پھر آپ لوگ یہ معاملہ خود طے کر سکتی ہیں۔“ اس کی یہ تجویز غزل کو ڈوبنے کے لیے جیسے نچکے کا سہارا تھی اس نے پہلی بار اس کو غور سے دیکھا اور پوچھا۔

”وائی ڈبلیو اے ہوٹل ہے کہاں؟“

اس کے بجائے شین جلدی سے بولا۔

”بندوبست پر رہنے پر پاکستان کے بالفاظ۔ لیکن غزل میں پھر اصرار کروں گا کہ آپ اس گھر کو اپنا گھر تصور کریں۔ جو نجی ڈولی کوظم ہو گا کہ آپ نے وائی ڈبلیو اے کو ترجیح دی ہے تو یقیناً وہ

تری یادوں کے گلاب

آپ سے ناراض ہوگی۔ آپ عابدی باتوں پر توجہ نہ دیں اس کا دامغ ہر وقت لفظ میں الجھا رہتا ہے۔ ظاہر ہے ایسا اچھے لوگ.....“ عابدی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”اچھا اچھا تم اپنی کو اس بندہ کرو۔ یہ بھاری پریشان ہے اور تمہیں دل لگی سوچی ہے۔“ غزل کے دل میں یکوقت عابد کے لیے احترام کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”آپ مجھے وائی ڈبلیو اے تک پہنچانے کی زحمت برداشت کریں گے؟ میں کراچی کے راستوں سے تانا ٹھاہوں۔“

تموڑی دیر بعد عابد اس کو گاڑی میں بٹھا کر وائی ڈبلیو اے لے آیا۔ شین نے بھی ساتھ چلنے کی ضد کی، لیکن عابد نے اسے سختی سے منع کر دیا۔ اس کے تاثرات سے لگتا تھا کہ اس نے عابدی اس بات کا خاصہ براہ ۲۱۱ ہے۔ غزل کی خوش قسمتی تھی کہ ہوٹل کی انچارج عابدی کا سارا ٹکلی، اس لیے وہاں کمرہ حاصل کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ غزل نے نہایت عقیدت سے اس کا شکریہ ادا کیا اس پر وہ ہنسنا اور اس کو خدا حافظ کہہ دیا۔

غزل دروازہ بند کر کے لباس تبدیل کئے بغیر اپنے بستر پر دراز ہو گئی۔ سفر کی محنت اس کی جڑوں میں سرایت کر چکی تھی۔ ایک طویل مدت کے بعد اسے فنی طمانیت کا احساس ہوا تھا۔ اس نے وحشت زدہ ہو کر سوچا۔ ”عابد ایک اچھا انسان ہے اگر وہ نہ ہوتا تو نہ جانے اس وقت وہ کد حال میں ہوتی۔“

اس کے پاس بیسوں کی کمی تھی۔ اس لیے اس نے ہوٹل کی مگران سے کہا تھا کہ وہ ایک بیچ کے قیام و طعام کے ایڈوانس پیسے ادا کرنے کو تیار ہے۔ عابد بھگداز انسان تھا۔ اس نے اس کی معاشی مجبوری کا اندازہ لگا کر اپنی جیب سے ایک ماہ کے اخراجات کی پیشگی ادائیگی کر دی تھی۔ غزل نے اسے بہت روکا لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ رخصت ہوتے ہوئے اس نے اپنے گھن سے پوچھا۔

”آپ کیا کرتے ہیں؟“ وہ آہستگی سے گویا نہ بولا۔

”میں بخود غرضی میں الجھتا ہوں۔“ غزل کے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ ایک ماہ کے لیے وہ پریشانی سے نجات پا چکی تھی۔ اب اسے ایک ہی فکر تھی کہ کسی طرح کوئی معقول قسم کی ملازمت مل جائے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اخبارات میں شائع ہونے والے اشتہارات کے جواب دیں

تری یادوں کے گلاب

درخواستوں پر درخواستیں بھیجے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اسے کراچی آئے ہوئے چار دن ہو چکے تھے۔ عابد دوبارہ اس سے ملنے نہیں آیا البتہ حسین نے فون پر اس کی خیریت دریافت کی تھی۔ وہ اسے ملازمتوں کے سلسلے میں مشوروں سے نوازنے کے بعد کئی ریسٹوران میں اس کے ساتھ چائے میں شریک ہونے کا خواہش مند تھا لیکن اس نے نہایت تری سے انکار کر دیا۔

ریاض نے جس عالمانہ انداز میں اس کے دل پر ان گنت گھاؤں لگائے تھے اس کے بعد وہ طے کر چکی تھی کہ آئندہ کسی مرد کے ساتھ بے تکلفانہ انداز میں پیش نہیں آئے گی۔ اسے مردوں کی ذات سے شدید نفرت ہو چکی تھی۔ اس کا جو وقت بچل میں گزرا اور سزا یافتہ عورتوں سے ان کے جو واقعات سننے وہ ایک لحاظ سے اس کی عملی زندگی میں تربیت کے لیے بے حد مفید ثابت ہوئے۔ اب وہ زمانے کی آغوش بچنے سے آہستے کے قابل ہو چکی تھی۔ یہ اس تربیت کا ہی اثر تھا کہ وہ جب کبھی ریاض کے بارے میں سوچتی تو اس کی آنکھوں سے آنسو نہ ٹپکتے تھے۔ اسے خیریت سے لے کر آج تک آخر اس نے اتنی سادگی اور مجاہدین کا مظاہرہ کیوں کیا جس کا آئندہ افکار ریاض نے اس کے راستوں میں کانٹے بچھا دیے۔

ہوسٹل کے برکمرے میں دو روز لڑکیاں رہتی تھیں۔ اس کی پادشاہی عیسائی تری کی بچی تھی۔ وہ بہت جلد اس سے بے تکلف ہو گئی۔ وہ ایک کنبی میں ڈائریکٹری ٹیکر فیری تھی۔ اس نے غزل سے وعدہ کیا کہ وہ اس کو وہیں ملازمت دلا دے گی۔ وہ بچتے بیت گئے۔ غزل نے اب تک دو درجن سے زیادہ درخواستیں ارسال کی تھیں لیکن کسی ایک کا بھی جواب نہیں آیا۔ یہی سلسلہ بالمشکل کر رہی تھی۔ ایک دن حسین اس سے ملنے آگیا۔ اطلاع ملی تو اسے جڑی کھٹ ہوئی۔ اس کی تھجڑے کا رنگاں جان بچی تھیں کہ اس کا فون کرنا، پائے پر دعوت دینا اور اب بن بلائے مسالٹا کر چلے آنا، مطلب سے خالی نہیں۔

ریاض نے اسے اپنا خلوص دکھا کر اسے ایسا ڈسٹا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس سے ملنے کے لیے ملاقاتی کر رہے ہیں آگئی۔ اگلے ہی لمحے اسے یہ جان کر خوشخواری حیرت ہوئی کہ وہ تب نہیں عابد بھی اس کے ساتھ بیٹھا پائپ کے کش نکال رہا تھا۔ دیکھتے ہی بعد اس نے کہا۔

”کس غزل آپ کی ملازمت کا کیا ہوا؟“ اس نے ہجوی سے لٹی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”درخواستیں بھیجی ہیں لیکن انٹرویو کال نہیں آئی۔“

تری یادوں کے گلاب

”کل آپ اس کنبی میں رپورٹ کریں۔ یہ آپ کا پوائنٹ منٹ لیٹر ہے۔ فی الحال آپ وہاں کی اسامی پر رکھا گیا ہے، آٹھ سو روپے ماہوار تنخواہ ملے گی۔ ان بیسوں سے آپ کے دل کے اخراجات پاؤ سانی پورے ہو جائیں گے۔ جب آپ کو مستقل ملازمت مل جائے تو پانچویں دے دیں۔“

غزل کے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ گزشتہ چند دنوں سے یہ سوچ سوچ کر سخت پریشان تھی کہ اگلے ماہ وہ ہوسٹل کے اخراجات کہاں سے ادا کرے گی۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں ماہانہ تنخواہ پکڑا اور اپنی بے پناہ مسرت کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے لرزتی آواز نکلتی تھی۔

”میں آپ کی ہمیشہ ممنون رہوں گی۔“ اس نے لاپرواہی سے اپنے کندھے اچکائے۔

”اس میں ممنونیت کی کون سی بات ہے۔ اس کنبی کا مالک میرا دوست ہے۔ وہ میری بات مان گیا اس لیے درخواست اور انٹرویو کی ضرورت نہیں پڑی۔ اچھا کس غزل اب اجازت دیں۔“

نالی کو کچھ یاد آگیا۔ دوہولی۔

”ضمیرے عابد صاحب! میں آپ لوگوں کے لیے چائے منگواؤں۔“ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر چکا تھا۔ کہنے لگا۔

”تکلف کی کوئی ضرورت نہیں، جب آپ کو پہلی تنخواہ ملے گی تب آپ کی چاہے ہم پر ہوا۔“ وہ غرور سے کہہ رہی تھی۔ ایک طویل عرصے کے بعد آج پہلی بار اس کے آوازے ہوئے۔ پر شادابی نے دستک دی۔ ریگستان میں ایسا آگئی کوئی بھول ظاہر ہوتا آنکھوں کو بڑا سمجھا دیتا ہے۔ اس کی ہنسی بھی اسی نوعیت کی تھی۔ جس نے عابد اور حسین کو چونکا دیا۔ حسین نے جاتے جاتے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

”وہ دوہولی مری سے واپس آ چاہے تو میں آپ کی شکایت کروں گا۔“

”کیوں؟“ وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

”میں نے آپ کو چائے کی دعوت دی مگر آپ نے قبول نہیں کی۔“ اس کا لہجہ شکایتی تھا۔

ماہ اس کو پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا بڑا ہوا۔



پہلے دن اپنے آفس میں قدم رکھتے ہوئے غزل بڑی نرمی تھی۔ اس کا ہاس اور میزمر کا ایک مونا شخص تھا۔ اس کے ہاک پر سونے سونے ٹیشوں کی ٹینگی ہوئی تھی۔ اس نے اس سے رسی طور پر تعویذی سی گفتگو کی جس کے دوران اس نے اسے جتنا کہ وہ یہاں صرف عابدی سفارش پر ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے، لیکن اس ملازمت کے قائم رہنے کی صورت صرف یہ ہوگی کہ وہ خوب محنت سے کام کرے۔

آفس کا ماحول تقریباً ایسا ہی تھا جیسے عام دفاتر کا ہوتا ہے۔ اسے ایک جوان لڑکی سمجھ کر اس کے ساتھی مرد ملازمین نے مختلف جیلوں پر ٹلوس سے اس کے قریب ہوتا شروع کر دیا البتہ لڑکیوں نے صرف ہاک بھوں چڑھانے پر اکتفا کیا، لیکن ہے اس کی خوبصورتی نے انہیں رقابت اور خوف میں مبتلا کر دیا ہو۔

غزل طبعاً کم گفتنی اور بھرپور صاحب کی بچی میں پس جانے کے بعد اتفاقاً ہوں بھی اس کے حلق میں پھنس جاتے تھے۔ اس کی کم گوئی نے اس کے دفتر میں کام کرنے والے مردوں کو تکلیف دہ حد تک مایوس کیا، لیکن اسی مایوسی نے ان کی آنکھوں کو اور بھڑکایا۔ بعض افراد آپس میں کا پھوس کرتے ہوئے کہتے۔ ”سہائی بنتی ہے وہ چار ماہ گزارنے کے بعد مردوج کی طرح چر رہا ہے کا اشتہار بنے گی، یاد ہے نا وہ ابندام میں کس طرح بات بات پر دوپٹہ سنبھالتی تھی۔ اب اس کا دوپٹہ آٹار قندیکہ کا حصہ بن گیا ہے۔“ دوسرا بولوں ”مجھے یہ جان کر لطف آتا ہے کہ سہائی بے سہارا ہے یا پھر مگر سے بھاگی ہوئی ہے۔ میں نے اس کا پچھا کیا تو پچھلا کر والی ذلیلو سے ہوئی میں رہتی ہے۔“

غزل روزانہ دفتر جاتی اور واپس آ کر اپنے کمرے میں لیٹ جاتی۔ کئی بار بھی نے اسے کھوئے پھرنے کے لیے آکسایا لیکن اس نے ہمیشہ سختی سے اس کی پیشکش مسترد کر دی۔ وہ مطمئن تھی کہ اب وہ مالی پریشانیوں سے نجات پا چکی ہے۔ اس کے باوجود اس کے دل کی آوازیں بندستور تھیں۔ اسے اپنی زندگی کا کوئی مقصد دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی پینت بھرنے اور سر چھپانے کے لیے اس نے ملازمت کی ہے، جانور بھی اپنی جبلت کے ماتحتوں مجبور ہو کر یہ دونوں ضروریات پوری کر لیتے ہیں۔ پھر اس میں اور جانوروں میں کیا فرق ہے؟ یہی سوال اس نے عابد سے اس دن کیا جس دن اسے پہلی تھوڑی اور وہ تھا اس سے ملنے آیا تھا۔ پہلی بار وہ اس

کے ساتھ کینے گرائی تھی۔ اپنے ماضی کے تجربات کے پیش نظر وہ مردوں سے محتاط ہی نہیں بلکہ ان سے نفرت بھی کرنے لگی تھی۔ پر عابد کی بات کچھ اور ہی تھی اس نے ابتدا میں اس سے بچنے کی کوشش کی پھر اس کی دو نیکیاں اس کی احتیاط اور نفرت کے درمیان خلیج بن گئیں۔ اس نے ہوٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر کے ایک ماہ کے اخراجات اپنی جیب سے ادا کیے اور اس کو ملازمت دلوائی۔ غزل کے دل میں بہر حال یہ بدگمانی موجود تھی کہ عابد کے حسن سلوک کے پیچھے کوئی نہ کوئی غرض ضرور وابستہ ہوگی۔

اس نے سوچا کہ اس شخص نے انجینی ہوتے ہوئے نامتو بہ حالات میں میری مدد کی جب تک اس کا اصل روپ سامنے نہیں آتا مجھے اس کا احترام کرنا چاہیے۔ اس فیصلے کے پیش نظر وہ چائے پینے کے دوران اس کے ساتھ مسکرا مسکرا کر گرمجوش سے گفتگو کرتی رہی۔ اسے خوف تھا کہ وہ اس کے ماضی کے بارے میں جاننے کا خواہشمند ہوگا۔ لیکن اسے بڑی حیرت ہوئی کہ عابد نے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ ”وہ کون ہے؟ اس کے والدین کیا کرتے ہیں لاہور میں اس نے کبھی زندگی گزار دی اور وہ کون سے حالات تھے جن سے مجبور ہو کر اس نے کراچی آنے کا فیصلہ کیا۔“

دو سارا دقت کتا ہوں، جھنگو، تھنڈ بیوں اور انسانی ذہن کے ارتقاء کے بارے میں ہائیں کرتا رہا۔ اس کا مطالعہ بے حد وسیع تھا اور غزل کو اس کی ذہانت نے بے حد متاثر کیا۔ اس رات کو سوتے وقت وہ کافی دیر تک اس کے حلقوں سوچتی رہی۔ یکا یک اسے یاد آیا کہ عابد نے جس طرح اس سے اس کے خاندان کے پس منظر کے حلقوں کوئی سوال نہیں کیا تھا، اسی طرح اس نے اپنی شخصیت کے تمام گوشے بھی مکمل طور پر چھپائے رکھے۔ اس کے دل نے بے ساختہ فیصلہ کیا کہ ذہنی کے مری سے واپس آنے پر وہ اس کے ساتھ عابد کے بارے میں تفصیلی گفتگو کرے گی۔ وہ رُجب شخص تھا نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے دل میں خود بخود دھانے جا رہا تھا۔

تیسرے دن وہ پھر آیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ وہ اسے اپنے ہمرائے کرکٹسٹن کے ایک ویران گوشے میں جا بیٹھا۔ سمندر کی لہریں، ان کا شور و غلابناک سا تھا۔ غزل کا دل چاہا کہ وہ اسی جگہ چھروں کے زمر پر لیٹ کر ہمیشہ کے لیے سو جائے۔ موت میں ابدیت ہے اور اس ابدیت میں لازوال سکون پنہاں ہے۔ اسے اپنے آپ پر مطمئن ثابت ہونے لگی۔ اس شخص کے ساتھ اس کا کون سا رشتہ ہے جو متاخر کر اس کے ساتھ یہاں چلی آئی۔ چاہاں اس کا مقدر بن چکی ہیں اس انجینی شخص کے ساتھ اس کا یہ مصنوعی اشتراک محض فراہمی ایک کوشش ہے۔ وہ بلاوجہ ایسی حرکتیں کر

کے کیوں اپنے آپ کو محو کرنے کے لیے ہے۔

ان سوچوں نے اس کے ذہن ہرے کر دیے اور اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ غم دھیس کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو اترنے لگے۔ عابد نکلتا ہوا۔

”مجھے بہادر لڑکیوں کی بیگنی ہوئی آنکھیں دیکھ کر بڑی اذیت ہوتی ہے۔ میں یہ نہیں چاہوں گا کہ تمہیں کون سا غم ہے۔ ہمارے غم ایک جیسے ہوتے ہیں اور دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو کسی نہ کسی سبب سے غمگین نہ ہو۔“ اس نے کوئی جواب نہیں دیا آجمل کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور بے دردی سے مصنوعی انداز میں مسکراتے ہوئے لہروں کو دیکھنے لگی۔

عابد نے قہقہہ لگایا اور بولا ”ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے انجمنی ہیں اور یہ کوئی اچھوتی بات بھی نہیں۔ کرنا ارض پر تین ارب سے زائد لوگ بستے ہیں اور ان کی اکثریت خود اپنے آپ کے لیے انجمنی ہے۔ لوگ طبعی عمر پوری کرنے کے دوران اپنی یادوں کی خواہشوں کے تابع کام کرتے ہیں جو ان کے نزدیک سرگرم زندگی کا حصہ ہوتا ہے لیکن ان کا البے صرف یہ ہے کہ وہ ایک ہل کے لئے بھی اپنی ذات سے ہٹ کر نہیں ہونے پاتے تو غزل بی بی! کچھ پائیدار یا کچھ ناپائیدار اہم ترین واقعات نہیں۔ لیکن دین کے عمل کو بڑھ کر کہتے ہیں۔ سناٹے پر قہقہہ لگا اور نقصان پر مر جھکا جانا ان لوگوں کی فطرت ہوتی ہے جو ہمیشہ اپنی ذات سے انجمنی رہتے ہیں۔“ اس کی سچ باتیں غزل کے دل میں چٹائیں کی طرح چھو گئیں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ عابد بھی خاموشی سے پائپ کے کش لگاتے ہوئے سمندر کی موجوں کو گھورے جا رہا تھا۔ دندا اس نے گردن موڑ کر غزل کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ”تم ایک اچھی لڑکی ہو مجھے اپنے سمیت کسی کے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں، کیونکہ ماضی بھی ہوئی راکھ ہے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو مجھ سے شادی کر لو۔ اس طرح ممکن ہے کہ تمہیں جینے کا نیا ذھن آ جائے۔“ غزل پر جیسے بجلی گرنی عابد کے منہ سے ایک رنگ شادی کی پیشکش سن کر وہ حواس باختہ ہو گئی۔ واقعی یہ عجیب و غریب شخص ہے۔ اس نے تمہارا سوچا کتنے آرام سے اس نے کہہ دیا کہ مجھ سے شادی کر لو۔ اگر اسے علم ہوتا کہ میں مطلقاً یافتہ ہونے کے علاوہ سزا یافتہ مجرم بھی ہوں تو پھر شاید میں اپنا تلفظ نہ بھارتا۔

عابد اس کی سوچوں سے بے نیاز کہہ رہا تھا۔ ”سفر کے دوران جب ہماری ٹرین کسی اسٹیشن پر رکتی ہے تو ہماری ساری دلچسپیاں اس کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہیں۔ ہمیں سابقہ اسٹیشن یا آنے والے اسٹیشن کا خیال نہیں آتا۔ فطرت کے نقطہ نظر سے یہ صحیح عمل ہماری زندگی کی پراسرار روشنی کو

زیادہ چندار بناتا ہے۔ میں اپنی تجویز پر اصرار نہیں کروں گا اور یہ بھی بتا دوں کہ میں بڑنس اور مشت دونوں سے لاعلمی ہوں۔“ غزل نے ہمت کر کے ہنسنے لگا۔

”عابد صاحب! آپ بہت عظیم انسان ہیں آپ کی رفاقت پر یقیناً ہر لڑکی کو فخر ہوگا لیکن.....“ اس نے اس کو بات مکمل نہیں کرنے دی اور مسکرا کر بولا۔

”لیکن میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی یہی کہنا چاہتی ہوں۔“ غزل نے اثبات میں سر ہلایا۔ عابد نے اپنا سلسلہ کام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”تمہاری یہ سوچ غلط ہے کہ میں ازراہ ہمدردی تمہارے لیے سہارا بننا چاہتا ہوں۔ یقیناً کروا بھی کوئی بات نہیں۔ اس شہر میں بے شمار لڑکیاں تمہاری طرح لاوارث اور بے سہارا ہیں اور کئی برسوں سے اس مشنٹی شہر میں رہتی ہیں اگر میں شادی کے ذریعہ کسی کی مدد کرنے کا ارادہ کرتا تو یقیناً پہلا حق ان میں سے کسی ایک کا ہوتا۔“ غزل کو اس کی وضاحت پر بڑی حیرت ہوئی اس نے ہنسنے لگا۔

”میرا مطلب ہے کہ۔۔۔“ وہ بار بار جو کوشش کے اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی۔

عابد نے لاپرواہی سے کہا۔ ”میرا اندازہ ہے کہ تم عام لڑکیوں سے مختلف ہو۔ میرا اشارہ تمہاری شکل و صورت یا عادات کی طرف نہیں۔ یہ بے معنی چیزیں ہیں۔ دراصل میں نے تمہارے اندر جیسی ہوئی لڑکی دیکھی ہے جس پر اگر میں محبت کروں تو وہ یقیناً زمین کے اعلیٰ مدارج حاصل کر سکتی ہے۔ بس اس دلچسپی کے سبب میں نے تمہیں شادی کی پیشکش کی ہے۔ تم اس پر سوچنا اور اگر تمہیں میری تجویز قبول نہ ہو تو مجھے فون پر اطلاع کر دینا۔ میں از خود اپنی تجویز تمہارے سامنے بھی نہیں دہراؤں گا۔“

وہ ہوشل واپس آئی تو اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عابد کس قسم کا شخص ہے۔ اور کیا واقعی اس کو اس کی گفتگو پر اعتماد کرنا چاہیے؟ ماضی نے اسے جس طرح بے رحمانہ انداز میں ذہن دھم کیا تھا، اس کے پیش نظر اس کا عابد سمیت ہر شخص سے بدگمان اور شکوک ہونا ایک قدرتی امر تھا۔

ریاض کی گفتگو میں بھی بڑی بڑی بڑی اپنا سیت ہوا کرتی تھی۔ اسے آخری دم تک شبہ نہ ہو سکا کہ وہ اداکاری کر رہا ہے۔ جب اس کے سر پر آسمان ٹوٹا تو اسے اس کی اصلیت کا علم ہوا لیکن اس وقت ریاض کی نگاہی ہوئی آگ اس کو محسوس کر چکی تھی۔ کون جانے عابد ہر ریاض ہی کا ایک عکس



تڑی یادوں کے گھاب

ہو شاید اس نے محسوس کیا ہو کہ شادی کے بغیر وہ اس کے قریب نہیں آ سکتا اس لیے مہارت سے چکر چلا لیا ہو۔

اسے اپنی بے بسی پر رونا آ گیا۔ یہ کیسا معاشرہ ہے جہنم لڑکی کو جیسے نہیں دیتا۔ بظاہر یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ اگر کوئی غیر مسلم ان کی ہم عقیدہ لڑکی سے یہ سلوک کرے تو ان کی غیرت اور خوداری جیسے نکتے گتے ہیں۔ لیکن اپنے ہاتھوں کسی سے بس مسلمان لڑکی کی عزت پامال کرتے ہوئے انہیں ایک لمحے کے لیے بھی خوف نہیں آتا کہ اس کائنات کا واحد مالک خدا ہے بزرگ و برتر ہے جو ان کی ہر کیسگی کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہے اور ان ہدایتوں کو شدید عذاب کا سزا بھی پکھائے گا۔

تین دن گزر گئے، عابد نہیں آیا۔ ہر شام اس کا دل دھڑکتا شاید ابھی اس کو ملازمت آ کر بتائے کہ اس کا ملاقاتی بیٹھا ہے۔ ایسی حالت میں وہ اکثر اپنے آپ کو برا بھلا کہتی۔ آخر میں نے اس کی آمد کی توقع کیوں لگائی ہے۔ شاید اس نے میری مدد کی مجھے حوصلہ دیا اور شادی کی پیشکش کی بھی لیکن وہ ہے تو انجینی ایسے لوگوں پر بھروسہ کرنے کا انجام میں پہلے ہی جھٹ چکی ہوں۔

وہ اپنے آپ کو ہر طرح سے قائل کرتی، پھر بھی اس کے دل میں چرچور جتا۔ ایک رات وہ عابد کے بارے میں سوچتے سوچتے ڈوگی۔ اس پر یہ بولناک انکشاف ہوا کہ اسے سے محبت ہو گئی ہے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ ایسی شدید محبت کا جذبہ تو اس نے کبھی ریاض کے لیے بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کو اس سے انیسیت تھی جو قربت کے سبب بالعموم بچوں کو اپنے شو بہروں کے بارے میں محبت کی بدگمانی میں مبتلا کرتی ہے۔

اس کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی اور اس نے اپنے چہرے و وجود کو ایک چادر میں چھپا لیا جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کی پازنٹ اس کا عہد نہ پالے۔ اس نے اپنے جذبات کی گتھی پھیلائی مسند کے سپرد کر دی۔ دوسرے ہی لمحے اسے یوں لگا کہ جیسے عابد اس پر تھکا اس کے بالوں کو بڑے سے چادر سے سہارا رہا ہے۔

صبح جب آنکھ کھلی تو اس کا جسم روٹی کے گالے کی طرح پٹکا پٹکا تھا۔ سورج کی روشنی اور فضا کی خشکی اسے ایک عجیب لذت دے رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی ناٹنا کیا۔ پانی کے ساتھ بھی اس نے خوب چپک چپک کر باتیں کیں۔ اس نے ایک دو بار بڑی حیرت سے اس کے بدلے

تڑی یادوں کے گھاب

ہوئے رویے پر غور کیا اور پھر صبر نہ کر سکی۔ اس نے پوچھا۔  
"بڑی خوش نظر آ رہی ہو کیا بات ہے؟"

جواب دینے کی بجائے وہ جھپٹے لگانے لگی۔ جب وہ اندھ کر چلی گئی تو پی اپنے آپ سے بولی۔

"پہلے تو یہ ایسی نہیں تھی کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے، جو اتنی خوش ہے۔" دفتر میں بھی لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ مخالف معمول بہت زیادہ ہشاش بشاش ہے کسی نے ہلکا پھلکا مذاق کیا تو اس نے پہلے کی طرح اس کا ذرا سامنے کی بجائے اس پر جملہ جست کر دیا۔ غزل نے سوچا۔ آج جانے کیا بات ہے سبھی لوگ مجھے احساس کر رہے ہیں کہ میں بہت خوش ہوں۔ میں انہیں کیسے بتاؤں کہ محبت کی شہین ایکا ایک میسرے دل کے گھاب پر آن گری ہے۔ اس سارے عرصے میں اس کا دل پتھر پر کرفن پر عابد سے گفتگو کرے لیکن جواب مانع تھا۔ سہ پہر کو جب وہ دفتر سے اٹھی تو یہ کچھ حیرت زدہ رہ گئی کہ شہین گاڑی کے لیے اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اس نے قریب جا کر پوچھا۔

"شہین بھائی خیریت ہے، آپ یہاں کس طرح؟" وہ برا سامٹ بٹا کر بولا۔  
"تمہاری سیکلی ڈولی تھوڑی دیر پہلے مری سے آئی ہے جو کئی اسے تمہارے منتقل بتایا وہ شور مچانے لگی کہ ابھی جا کر اسے امراؤ لاؤ مجھے ایک بہت ضروری کام تھا، لیکن ڈولی کی بچی ضد کی گئی ہے۔"

غزل کا چہرہ خوشی سے دھنکے لگا۔ اسے ڈول سے ملنے کی شدید آرزو تھی۔ وہ جلدی سے اس کے برابر چلتی اور کہنے لگی۔

"شہین بھائی آپ نے کیوں زحمت کی مجھے فون کر دیجے میں خود آ جاتی۔" شہین بکھویر نکالے کھا جانے والی نظروں سے گھورتا رہا پھر قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔

"میں اتنا جوڑ کر معافی مانگتا ہوں اور اقرار کرتا ہوں کہ میں آپ دونوں خواتین کا بے دام غلام ہوں جہتی میں آئے میرا حشر کریں۔" غزل بے ساختہ ہنس دی۔

وہ مگر میں داخل ہوئے تو چاروں طرف سناٹا تھا۔ شہین نے بتایا کہ مری سے صرف ڈولی

ابھی آئی ہے، باقی لوگ وہیں ہیں۔ وہ اس کو ساتھ لے کر دوسری منزل پر پہنچا اور بیڈروم میں آتے ہی اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا اور سگریٹ سلگانے لگا۔ غزل نے چاروں طرف حیرت نظر انداز کر دیکھا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ اس نے مڑ کر شہین کی طرف دیکھا اور حیرت سے پوچھا۔

”کہاں ہے ذولی۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور سرگرمی سے لگا رہا۔ غزل نے اپنا سوال دہرایا۔ جب وہ قدم اس کی طرف بڑھا اور جیب سے نکالی چاقو نکال کر ہرانے لگا تو وہ دم خور ہو گئی اس کے قدم جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے طلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔ شبنم سناک لہجے میں فرمایا۔

”عابد میں کوئی سرخاب کے پر نہیں لگے کہ تم اس کے ساتھ رہ کر دلیاں مٹاؤ تم نے مجھے نظر انداز کر کے میری بے عزتی کی ہے۔ میں نے تمہیں جاننے کی دعوت دی تم نے اسے مسترد کر دیا۔ میں نے تمہیں فون کیے، تم نے بات کرنا گوارہ نہ کیا۔ میں ایک دفعے سے آگ میں جل رہا ہوں اور تمہیں اس کی کوئی پروا نہیں۔ عابد نے مجھے بتایا کہ وہ تم سے شادی کرنے کا خواہشمند ہے میں آج تمہیں اس کا قائل نہیں رہنے دوں گا کہ وہ تمہیں اپنی بیوی بنانے کا تصور کرے۔“

غزل کا نہ اس حال تھا۔ وہ قہر کا پربھی تھی۔ یہ درست ہے کہ اسے شبنم میں دوسری عہم عورتوں کے ساتھ زندگی گزارنے کا قائل نہ تھا لیکن اس نے کبھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھا تھا۔

شبنم کافی مضبوط اور توانا تھا۔ اس نے ہلکاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ اس کا ساتھ دینے سے قاصر رہے۔ شبنم اس کے قریب آ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ میں چاقو پکڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں دہشت ناک انداز میں چمک رہی تھیں۔ اس نے اس کا بازو پکڑا اور زور سے اپنی طرف کھینچا۔

غزل کے مردہ جسم میں جیسے جان آ گئی ہو۔ اس نے پوری قوت سے چیخ بلند کی۔ شبنم نے اپنا چاقو گرا دیا اور ایک ہاتھ سے اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ غزل کی قوت مزاحمت بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے دانتوں سے اس کا ہاتھ کاٹا۔ اس کے طلق سے ایک ٹھکی ٹھکی چیخ نکلی اور وہ الجھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے ہاتھ سے خون ریں رہا تھا۔ غزل پر دہشت سوار ہو گئی۔ اس نے جلدی سے جبکہ کر زمین پر گر کر ہوا چاقو اٹھا اور اس کی طرف بھرتے ہوئے چلائی۔

”سور، کہنے، ذلیل مار ڈالوں گی تجھے۔ میں تیری بوٹی بوٹی انگ کر کے اپنے پاؤں سے روندوں گی۔ تم سب میرے دشمن ہو۔ میں جانتی ہوں تم سب میرے دشمن ہو۔ دیکھو آج میں نے اپنے ہاتھ میں چاقو لے لیا ہے آؤ اب مجھ پر ظہم کرو۔ میری بے بسی کا تماشہ بناؤ۔ تمہارے قدم کیوں

آگے نہیں بڑھ رہے۔ تمہاری بے چینی کہاں گئی میں تمہارے سامنے ہی ہوں۔“

اس نے ایک دہشت ناک قہقہہ لگایا۔ وہ اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی۔ اس نے جس انداز میں چاقو کو فضا میں گردش دی، اسے دیکھ کر ایسا لگتا جیسے وہ شہر کی مہذب تعلیم یافتہ لڑکی نہیں، کسی ساریک جنگل کی وحشی بنی ہے۔ اس کے خوفناک تیز دوڑنے کی کرشمیں خوفزدہ ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے ساتھ قہقہہ مٹھتا ہونے کے بعد اس کے ہاتھ سے چاقو گرا دے گا لیکن اس نے اس کی ہنسی پرانی کیفیت دیکھی تو اپنی مردانہ برتری بھول کر دروازے کی طرف ہلکا۔

غزل بھی اس کے پیچھے دوڑا نہ وار بھاگی۔ شبنم کمرے سے نکل کر کئی بیڑھیاں بیک وقت پھلانگتا ہوا پورچ کی طرف بھاگا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس کا ملازم اس کے سامنے آیا تو وہ چلا یا۔

”بابا۔۔۔ بابا۔۔۔ کہیں چھپ جاؤ وہ پاگل ہو گئی ہے، وہ تجھے مار ڈالے گی۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی گاڑی اشارت کی اور اسے دوڑاتا ہوا غائب ہو گیا۔ بابا کی سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی تھی وہ ہاتھ پر ہاتھ مارا ہوا پیچھے مڑا تو اس کی جیسے جان نکل گئی اور وہ قہر قہر کاہنے لگا۔ سامنے ایک لڑکی ہاتھ میں چاقو پکڑے تیز تیز قدم اٹھاتی اس کی طرف آ رہی تھی اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور اسے سے جھاگ نکل رہا تھا۔

بابا چیخ چلا تا ہوا ہاتھ پر کی طرف بھاگا۔ شبنم اس وقت عابد کی ایک گاڑی پورچ میں داخل ہوئی۔ اسے ملازم بابا کی حالت دیکھ کر قہر ہو گیا اور اس نے پوچھا۔

”شبنم ہے؟“

بابا کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ وہ بار بار اس کے اندر کی طرف دیکھتا۔ عابد گاڑی سے نکلا اور اسے بازو سے پکڑ کر اندر لے جانا چاہتا تو بابا نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کے لیے باقاعدہ دھچکا دھچکا شروع کر دی۔ عابد سنانے میں آ گیا۔ اس کی نظر غزل پر پڑی جو ہاتھ میں چاقو لیے زور زور سے چیخیں ہوتی، ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ملازم بابا اس کی گرفت کمزور ہوتے ہی ایک طرف بھاگ گیا۔ عابد نے غزل کو پہلی پہلی نظروں سے دیکھا اور چلا یا۔

”غزل۔۔۔ غزل۔۔۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ اس کی آواز سن کر غزل کے قدم رک گئے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کو زمین نے جکڑ لیا ہو اور پھر اس سے پہلے کہ عابد اس کو سنبھالنا، وہ



تری یادوں کے گلاب

دھڑام سے زمین پر گر گئی۔ چاتو ابھی تک اس کی منحنی میں تھا۔ وہ بیہوش ہو چکی تھی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک پرائیویٹ کھینک میں تھی۔ ایک نرس اس کے سر کے بالوں کو سنبھال رہی تھی اور اس کے بھی پاس عاید گمرت کھڑا تھا۔ غزل کے منہ سے ایک سسکی نکلی۔ اسے وہ خطرناک لگا جیسے شہین چاتو تھا اس کی طرف لپکا تھا۔ اس نے بے بسی اور بے چارگی سے عاید کی طرف دیکھا جو ٹہنی دونوں کی نھریں چارہ نہیں غزل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

عابد نے اس کے سر ہانے پیٹ کر اسے تسلی دی اور کہنے لگا۔

”تم بتا نہیں ہو۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ کسی حد سے گھر سے شراحت تمہارے ذہن پر چھائے ہوئے ہیں۔ آج رات تم یہیں رہو تا کہ تمہاری مناسب دیکھ بھال ہو سکے۔ صبح میں تمہیں لے جاؤں گا۔“

غزل نے فوراً اس کا ہاتھ تھام لیا اور وہاں سے کچے میں بولی۔

”بلینز عابد۔ مجھے تھامت چھوڑ دو میری ہمت جواب دے گئی ہے۔“ وہ بے دلی سے

مسکرا کر بولا۔

”میری رائے اب بھی یہی ہے کہ تم ایک ماہت لڑکی ہو میں تمہاری عظمت کو سلام

پیش کرتا ہوں۔“

اس نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا اور کہنے لگی۔

”تین مجھے یہ کہہ کر کمرے لے گیا تھا کہ ڈولی مری سے واپس آ گئی ہے اور مجھے ملادی ہے۔“

بعد میں پتہ چلا کہ اس نے دھوکہ کیا۔ اللہ نے میری عزت بچائی۔“ عابد کا چہرہ گھمبیر ہو گیا اور وہ

آہستہ سے بولا۔

”تمہارے ہاتھ میں چاتو دیکھ کر میں نے صورتحال کا اندازہ لگا لیا تھا۔“

”میرے ہاتھ میں چاتو؟“ اس نے حیرت سے دہرایا۔

وہ مسکراتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”تم اپنے حواس میں نہیں جسکے پاس لیے یہ کہنا بے سرزد ہو گیا۔“

وہ آنکھ کر جانے لگا کہ غزل نے اسے آواز دے کر بلایا۔ وہ پاس آیا تو اس نے اسے اپنے

نزدیک بٹھا کر چھپکتے ہوئے کہا۔

”عابد صاحب آپ کو یاد ہے کہ آپ نے سمندر کے کنارے ایک تجویز پیش کی تھی۔“

اس کے چہرے پر دوبارہ مسکراہٹ کھینے لگی۔ اس نے انتہات میں سر ہلایا۔ غزل نے

تری یادوں کے گلاب

نھریں جھکاتے ہوئے کہا۔

”آپ سمجھ لیجئے کہ میں نے آپ کو فون کر دیا۔“

عابد نے قہقہہ لگایا۔ ”تم نے نہایت دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے۔“

پانچویں دن اس کی عابد سے شادی ہو گئی۔ اس کی پہلی شادی کی طرح یہ تقریب بھی نہایت

سادہ تھی۔ عابد کے چاروں دوستوں نے اس میں شرکت کی۔ بارات اور رخصتی کا جھنجھٹ سرے

سے تاجید تھا۔ عابد کے کلیت پر شادی ہوئی۔ وہیں اس دنوں نے نئی سون سناپا۔ غزل اپنی نئی زندگی

پر بھید خوش تھی۔ عابد اس کا شوہر ہی نہیں بلکہ محبوب بھی تھا۔ وہ پیلا سرد تھا جس کے لیے اس کے دل

میں بے پناہ پیار پیدا ہوا۔ شوہر کے کہنے پر اس نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ اب وہ مکمل

طور پر ایک گھریلو عورت بن چکی تھی۔ شادی کے پہلے مینے اس پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ عابد

اس کو فون کر چاہتا ہے اسے پتہ چلا کہ وہ اس کے دل پر دھچک دینے والی چکی لڑکی ہے۔ جب

کبھی وہ تنہا ہوتی تو ایک خیال اسے خوفزدہ کر دیتا۔ اس نے عابد کو اپنے ماضی کے بارے میں کچھ

نہیں بتایا تھا کہ کبھی اسے معلوم ہو گیا کہ وہ طلاق یافتہ ہے اور عدالت نے اسے بھرپور ارادے کر دے

سال کے لیے جیل بھیج دیا تھا تو پھر کیا ہو گا؟ دھشت کے عالم میں اسے پکڑ آئے اور ساتھ ہی اس

کی آنکھیں آنسو برسانے لگیں۔ اس نے ایک دو بار ہمت کر کے اپنے شوہر کو وہ داغ دکھانے

چاہے جنہیں تقدیر کی بد بختی نے لازم دل بنا دیا تھا لیکن عابد نے اسے کبھی کسی اعتراف کا موقع نہ

دیا۔ اپنے موقع پر وہ ہمیشہ تنگ لگے ہوئے رہتا۔

غزل میری جان خدا کے لیے مجھ سے کبھی اپنے ماضی کا تذکرہ مت کرنا مجھے کوفت ہوتی

ہے تم بتاؤ کہ میں نے کبھی تمہیں اپنے خاندان یا اپنے پس منظر کے بارے میں کچھ بتایا؟“ غزل

کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خاموش رہتی۔

اس طرح دو سال بیت گئے۔ شادی کے بارہویں مہینے ان کے گلشن میں ایک سدا بہار

پھول کھلا جس کی بھی نہ قسم ہوئے والی مہک نے ان دونوں کو سرشار کر دیا۔ عابد نے اپنے بیٹے کے

نام امجد عابد رکھا لیکن وہ اسے پیار سے پوچھتا۔

غزل کی ساری محرومیاں دھل گئی تھیں۔ ماضی کے زخم جیسے پاتل میں چلے گئے تھے

اسے ایسا لگا جیسے وہ ہمیشہ سے اسی جنت میں بس رہی ہے عابد کی بھی یہی کیفیت تھی۔ غزل نے

اسے اتنی بھر پر محبت دی کہ وہ اس کے حصار کا قیدی بن گیا۔ ایک شام جب عابد گھر آیا تو بہت

خوش تھا اس نے پہلے بچہ کو بچا کر کیا اور پھر کہنے لگا۔

”میں نے آج تک تمہیں اپنے گھرانے کے بارے میں نہیں بتایا۔“ غزل نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا وہ کہہ رہا تھا۔

”بھری ماں کا بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔ ابا میاں بہت تک چڑھے اور غصیلے ہیں۔ میری مرضی کے بغیر انہوں نے کسی دوسری جگہ میری شادی طے کر دی۔ میں نے ان کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا۔ جس پر انہوں نے مجھ سے تعلقات منقطع کر لیے۔ تین سال بعد آج انہوں نے مجھے فون کیا اور طوافِ توقع شفقت پھرے لہجے میں کہا کہ میں فوراً اپنی بیوی اور بچے کو لے کر ان کے پاس پہنچوں۔ ہمیں دیکھنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔“ غزل خوشی سے اچھل کر بولی۔

”اللہ تو بڑی مہربان بات ہے۔ ابھی چلو میرا خود بڑا دل چاہتا ہے کہ میں تمہارے خاندان والوں سے ملاقات کروں اور ان کی خدمت کروں۔“

تقریباً دو گھنٹے بعد عابد غزل اور بچہ کو لے کر سوسائٹی کے ایک خوبصورت بیچلے پر پہنچا۔ چاروں طرف سناٹا چھایا تھا۔ ایک بوڑھا ملازم تیزی سے ان کی طرف آیا۔ عابد پر نظر پڑتے ہی بنیالی انداز میں چٹایا۔ چھوٹے صاحب آپ میرے اللہ تو نے آخر میری دعا مانگیں قبول کر لیں۔ عابد نے مسکراتے ہوئے غزل سے اس کا تعارف کرایا۔

”یہ شادو بابا ہیں۔ انہوں نے مجھے گود میں کھلایا ہے۔ ابا جان انہیں دیکھتے ہیں۔“ پھر شادو بابا سے کہنے لگا۔ ”شادو بابا یہ میری بیوی غزل ہے اور یہ میرا بیٹا ہے۔“ شادو بابا نے اس کے سر پر ہاتھ بھیرا اور بچہ کو گود میں اٹھالیا۔ غزل کو ایک لمبے کے لیے ہنس مٹھوس ہوا جیسے وہ اس انانیت کو برداشت نہ کر سکے گی خوشیوں کی برسات شروع ہوتی ہے تو پھر کہنے کا نام نہیں لیتی۔ بچہ کو شادو بابا کی گود میں دے کر وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ عابد باپ کے غسل لگاتا ہوا اسے اپنے بچپن کے متعدد واقعات سناتے لگا۔ ناگہاں غزل کی نظر دیوار کے ایک کونے پر پڑی، جہاں ایک بار عجب شخص کی تصویر آویزاں تھی۔ وہ جلدی سے انھی اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ یہ چہرہ اسے سنا سنا شکلاں گ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ اس نے اس کو کہاں دیکھا ہے۔ دھننا اس نے حذر کر اپنے شوہر سے پوچھا

”عابد یہ کون صاحب کی تصویر ہے؟“

اس نے ایک زوردار تعجب لگا یا اور باپ کا ڈھماں اڑاتا ہوا بولا۔ بھئی یہی تو تمہارے سر

ہیں۔ شکل و صورت سے جلا نظر آتے ہیں لیکن اندر سے بڑے نیک اور رحیم ہیں البتہ حوا میں رکھائی اور کڑواہٹ ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ زندگی بھر انہیں مجرموں سے ٹھٹھا پڑا۔

غزل مسلسل تصویر کو گھورتی رہی۔ پھر اس نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ جج ہیں..... تمہارے لانا پور میں بھی چند سال رہے ہیں۔ اب رہائز ہو کر کراچی آ گئے ہیں۔“ غزل کے سر پر زنی ہتھوڑا اگر اللہ وہ اندر سے کانپ کر رہ گئی اس کا سر وہی جج تھا جس نے چند سال پہلے اس کو دو سال قید با مشقت کی سزا سنائی تھی۔ وہ اس کی شکل و صورت اچھی طرح پہچان چکی تھی۔ اسے دو وقت یاد آ گیا جب وہ مجرموں کے کنبہ میں کھڑی تھی اور جج نے اپنا فیصلہ سناتے وقت غصیلی نظروں سے اسے گھورا اور پھر فرماتے ہوئے بولا۔

”پولیس کی شہادتیں تمہارے خلاف ہیں اور صاف گنتا ہے کہ تم نے اپنے شوہر ریاض کے ساتھ مل کر ہرون ملک جانے والے مصلوم افراد کو اپنا شکار بنایا اور ان کے لاکھوں روپے ہتھیائے۔ تم بھی ذلیل مرد تھے معاشرے کا تانور ہیں۔ اس لیے تم پر رحم کھانا معاشرے پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔“ غزل کے جسم میں کھپکھپاتی طاری ہو گئی اس کا سر کھوٹنے لگا۔ قسمت اس کے ساتھ ہمیشہ ایک خالق پر عمل گئی تھی۔ وہ کیا کرے کہاں جائے اور کس سے فریاد کرے کہ اس کا کوئی دوش نہیں۔ اس نے بھی کسی کو دکھ نہیں پہنچایا۔ اس کے باوجود اس کا مقدر انکارے اس کی جمولی میں ڈالنے کو تیار تھا۔

عابد اندھ کس کے پاس آیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر حیرت سے بولا۔

”کیا ہوا غزل خیریت تو ہے تمہارا چہرہ صلیب ہو رہا ہے کیا کوئی تکلیف ہے؟“

وہ کئی ہوئی شاخ کی طرح صوفے پر گر گئی اور ایک ایک کر کے بگی۔ ”میرے بدن میں شدید درد شروع ہو گیا ہے۔“ اس نے ایک طویل سسکی لی۔ عابد اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھوں کو سہلاتا ہوا کہنے لگا۔

”ابا جان باہر مجھے ہوئے ہیں۔ تم دوسرے کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو جاؤ۔ کو تو میں ڈاکٹر کو فون کروں؟“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے صبح کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں اس کی ضرورت نہیں اگر تم برائے فو تو میں گھر واپس چلی جاؤں؟“

عابد چونکا۔ وہ حیرت سے اسے نگے چار رہا تھا۔ شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ غزل نے



تری یادوں کے گھاہ

اسے اور کچھ کو کسی جگہ چھوڑ کر تہا دلہن جانے کی غراہل کا اہتمام کیا تھا۔ وہ کچھ کہنے کی کا تھا کہ پورے میں کسی گاڑی کے رکھنے کی آواز آئی۔ وہ خوشی سے بولا۔

”ابا جان اچھے ہیں۔“

دوسرے ہی لمحے ایک بھاری بھر کم فضا جس کے سر پر کہیں کہیں سفید بال نظر آ رہے تھے، کمرے میں داخل ہوا۔ غزل اس کو دیکھنے ہی کسی خود کار مشین کی طرح کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ دلی ہو گیا۔ لیکن اس کے برعکس ماہد اور بیج صاحب خوشی سے بے حال ہو رہے تھے۔ دونوں باپ نے کئی سال بعد ایک دوسرے کے بالفاظ آئے تھے۔ بیج صاحب نے لپک کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا اور پھر غزل کی طرف آئے۔ اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اس کے بعد اس کے سر پر ہاتھ بچھا اور اسے اپنے قریب ہی صوفے پر بیٹھا لیا اور پھر انہوں نے گونجدار آواز میں کہا۔

”ماہد ہمارا پوتا کہاں ہے؟ اسے ہمارے پاس لاؤ۔ ہم اسے دیکھنے کے لیے تو پ رپ ہیں۔“ یہ آواز سننے ہی غزل کے اعصاب جھٹکنا آئے۔ وہ اس لہجے کو ابھی طرح جان بھگتی تھی۔ اس آواز نے آج سے کئی سال پہلے عدالتی کمرے میں اس کو مجرم قرار دیا تھا۔ اسی وقت شادو بابا نے اپنی گود میں لئے نمودار ہوا۔ بیج صاحب نے بہتر ماری سے چوکا اپنی گود میں تمام لیا اور بواوندہ اس کو چومنے لگے۔

دیران گھر میں دیکھنے ہی دیکھتے رونق آ گئی۔ سب سے زیادہ خوش چو تھا۔ اسے اپنے ابا سے ایسے انوسیت ہوئی کہ وہ ایک ہل کے لیے بھی ان سے امگ ہوئے کو تیار نہیں تھا۔ بیج صاحب ماہد اور غزل کو موقع دینے بغیر مسلسل گفتگو کیے جا رہے تھے۔ یوں گفتگو جیسے وہ ایک عمر سے کسی دیران منہان جڑے میں قید تھے اور اس قید کے دوران انہوں نے کسی انسان کی عقل نہیں دیکھی تھی۔

کھانے کی میز پر وہ غزل اسے کہنے لگے۔

”بچے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں تمہیں دیکھا ہے کب؟ کہاں؟ میں بہت زور ڈالا مگر کچھ یاد نہیں آ رہا۔“ غزل کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا وہ چونکا چا پتی تھی لیکن اس کی آواز اس کے مطلق میں جیسے اکٹ گئی۔ اس کے بھائے ماہد نے اپنے منہ میں انداز میں قہقہہ لگا دیا اور جواب دیا۔

”ابا جان آپ یہ کیا کہتے آ۔ کہاں یہ بوسہ پڑا؟“

تری یادوں کے گھاہ

بیج صاحب مسکرائے اور کہنے لگے۔ ”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ غزل ماشاء اللہ عادات و اطوار سے نہایت منہب اور سلیقہ مند لڑکی دکھائی دیتی ہے۔ اس کی رنگوں میں یقیناً شریف خاندان کا خون دوڑ رہا ہے۔ میری ایک عمر محرموں کو دیکھنے اور پرکھنے میں گزری ہے۔ بیٹا جو کہتے ہیں کہ خون کی تاثیر بے معنی ہے، وہ دوسرا سرفلا کہتے ہیں۔ خون بہت اہمیت رکھتا ہے جب بچہ جوان ہو تو اسی خون کی تاثیر کے تحت ان کے اندر مجھیں ہوئی اچھائیاں یا غلافتیں ابھرتی ہیں۔ میں نے آج تک جتنے محرموں کو سرائیں سنا کیں ان کے بارے میں میرا یہی عقیدہ ہے کہ وہ سلا برے لوگ تھے۔“

ماہد بولا۔ ”ابا جان اچھے آپ سے اختلاف ہے۔“

بیج صاحب نے صوفیوں کی اچکاتے ہوئے پوچھا۔

”اختلاف۔ کیا اختلاف بیٹا۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس کے پیچھے ایک عمر کا تجربہ موجود ہے۔ تم ابھی نو جوان ہو، خون میں گرمی ہے اور نئی نسل تو سر میںا بر رگوں کی روایات کے خلاف بناوت پر تلی ہوئی ہے۔“ انہوں نے تہقہ لگایا۔ غزل باپ بیٹے کی گفتگو سے بے نیاز سر جھکائے کھانا کھا رہی تھی۔ لیکن اس کے مطلق سے لپکے نہیں اتر رہا تھا۔ لیکن وہ ایسا کرنے پر مجبور تھی کیونکہ اسے خوف تھا کہ کہیں بیج صاحب اس کی شدید ترین پریشانی کو دیکھ کر بھابھ نہ لیں کہ یہ وہی مجرم لڑکی ہے جسے انہوں نے چند سال پہلے دو سال کی سزا سنائی تھی۔ ماہد اپنا کاٹا ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔

”ابا جان میرا ذاتی خیال ہے کہ جرائم مخصوص حالات کی پیداوار ہیں اور معاشرے کی اونچ نیچ اور سماجی نا انصافیاں اس کے لیے کھاد کا کام کرتی ہیں۔ کئی لوگ بے گناہ ہوتے ہیں لیکن پولیس انہیں کسی نہ کسی طرح قصور وار ثابت کر دیتی ہے جبکہ اس کے برعکس اکثر جرائم پیشہ افراد اپنا چالاک سے زندگی بھر قانون کی گرفت سے محفوظ رہتے ہیں۔ سنا کئی انہیں اعزازت قصور کرتی ہے۔ ایسے عجیبہ حالات میں رنگوں میں بہنے والے خون کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔“ بیج صاحب کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے انہوں نے دکھائی سے کہا۔ ”تمہاری سوچ گفتگو کی تابع ہے۔ زندگی کی پھر جیسی خصوصیتوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔“ ماہد نے یقیناً موضوع بدل کر سوال کیا۔

”ابا جان ماہد کا کوئی خط آیا ہے؟“ اس سے پہلے کہ بیج صاحب کچھ بولتے۔ وہ جلدی

تری یادوں کے گلاب

سے اپنی بیوی کی طرف مڑا اور بولا۔

”ایک خوشخبری اور سن لو تمہارا ایک دیوہ بھی ہے ساجد۔ پانچ سال پہلے وہ پاکستان چھوڑ کر چلا گیا تھا۔“

غزل نے مشکل سے جی کہا تھا کچھ صاحب غصیلہ لہجہ میں بیڑا ہے۔

”اس ملاقات کا میرے سامنے نام نہ نہ لو۔ اس نے مجھے بہت ڈکھ پہنچایا ہے۔ میں اسے بھول چکا ہوں۔“ رات مجھے جب عابد اور غزل اپنے گھر پہنچے تو غزل کی حالت اور خراب ہو چکی تھی۔ چوتھ صاحب نے اپنے پاس ہی ٹھہرایا تھا۔ ان کا اسرار تھا کہ وہ دونوں اگلے دن ہی سامان سمیت کراں کوٹھی میں منتقل ہو جائیں۔ وہ اب ایک ہل کے لیے بھی نہیں اپنے سے دور نہیں دیکھنا چاہتے۔ عابد نے فوراً بان کہہ دی۔ وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ اسے آپ سے بہت محبت تھی۔ اس کے علاوہ اسے احساس تھا کہ وہ بالکل تنہا نہیں۔ یہ اور پوتے سے ان کی ریٹائرڈ زندگی میں ایک نئی تازگی اور شکستگی آجائے گی۔ غزل کی کیفیت مختلف تھی۔ اسے صاف نظر آچکا تھا کہ اس کی بد قسمتی نے اس کی دو سال کی پرسکون ازدواجی زندگی کا بدلہ لینے کے لیے اس کے راتے میں کائنات کو دیے ہیں جو کبھی نہ ختم ہونے والے ہیں۔ سچ صاحب ابتدائی ملاقات میں اس کو پہچاننے سے قاصر رہے تھے لیکن پڑھیں گئے کی قربت میں کسی لمحہ میں ان کے ذہن میں خواہیہ واپس اٹھائی لے کر یہ اور ہو سکتی ہیں اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر ان کا رد عمل کیا ہوگا۔

وہ اس بھیا تک دن کے تصور ہی سے کانپ گئی۔ انہوں نے اسے سزا دیتے ہوئے پولیس کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ اس کے مفرد شوہر کو ہر قیمت پر تلاش کر کے گرفتار کرے۔ وہی لڑکی اب ان کی بہو اور پوتے کی ماں تھی۔ اس سچ حقیقت کا انکشاف ہونے کے بعد کیا وہ اس کو صاف کر دیں گے۔ غزل کے ذہن میں اس کی ٹھنکی ٹھنکی جھپیں بلند ہوئے لگیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سال تک ان آنکھوں کے سوتے خشک رہے تھے لیکن نکا ایک مقدمہ کی بے رحمی نے انہیں دوبارہ بزم کر دیا تھا۔

عابد نے اسے اس کے دیوہ ساجد کے بارے میں بتایا۔ ”میری اور ابا جان کی اس سے ناراضگی کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے ایک بدنام طوائف سے شادی کر لی تھی، جو تین بار شیل کاٹ چکی تھی۔ یہ بھی کوئی خاص بات نہیں۔ غم یہ ہوا کہ اس کی بیوی نے شادی کے بعد اپنے چلن درست نہیں کیے۔ ایک روز اس کو پولیس نے منشیات کی اسمگلنگ کے الزام میں دھر لیا۔ ساجد کی خواہش

تری یادوں کے گلاب

تھی کہ میں ابا جان کی سفارش کے ذریعے اس کا کیس ختم کرادوں، میں نے اسے جھڑک دیا جس پر اس نے مجھ سے تعلقات ختم کر لئے۔ بعد ازاں اس نے کسی طرح اپنی بیوی کو منکالت پر رہا کر لیا اور دونوں غنیمت طور پر پاکستان سے عائد ہو گئے۔“

غزل کو اپنے دیوہ پر ترس آنے لگا۔ جانے اصل بات کیا تھی بات کا جھگڑ بن گیا۔ اس کا اپنا معاملہ بھی تو اسی نوعیت کا تھا، اس نے کچھ بھی نہیں کیا لیکن اس کے پہلے شوہر ریاض کی سازشوں کا نتیجہ اسے جھٹکانا پڑا۔ ریاض کا خیال آتے ہی انتہائی طور پر اس کی مضامیں اٹھ جھٹکنے لگے، وہ رو اپنے آپ میں بیڑا لٹی۔

”کاش مجھے اس کی اصلیت کا علم ہوتا میری زندگی کبھی نہ جھٹکتی۔“ دوسرے دن دو بج صاحب کی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ غزل نے کئی بار عابد سے کہنا چاہا کہ وہ ایسا نہ کرے لیکن اسے ہمت نہ ہوئی۔ اس نے سوچا آ خر میں کیا جزا دے گا کہ اس پر زور دوں کہ اپنا حقیقت نہیں چھوڑنا چاہیے۔ بچہ اپنے دادا کا ایک دم گریوہ ہو گیا ہے اس نے رات ہی اپنی حرکات سے اس بات کا اظہار کر دیا تھا۔ غزل نے فیصلہ کر لیا کہ وہ سچ صاحب کے سامنے اپنے آپ کو سنبھالے گی اور ثابت قدم رہنے کی پوری پوری کوشش کرے گی۔ اگر انہوں نے اسے کبھی پہچاننے کی سعی کی تو صاف کر جائے گی اور انہیں قائل کرے گی کہ وہ مشابہت کی بنا پر اسے دوسری لڑکی سمجھ رہے ہیں۔ ایسا فیصلہ کرتے ہوئے اسے جھجک اور کوفت ہوئی کیونکہ اس نے اپنی مرحوم ماں کی تربیت کے زیر اثر کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔

لیکن اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ جھوٹ بولے ایسا کرنے سے نہ صرف اس کی زندگی مفلوج رہتی بلکہ عابد کے آنکھیں دل کو بھی ٹھیس نہ پہنچتی۔ اسے ایک دو بار خیال آیا کہ وہ کیوں نہ تجانی میں اسے سارے واقعات صاف صاف بتا دے لیکن اس کا ضمیر اسے کہتا کہ اگر وہ ایسا کرے گی تو نتیجہ اس کا شوہر اس کے بارے میں مشکوک ہو جائے گا۔ بات معمولی تو نہیں تھی کہ وہ نظر انداز کر دے تاہم اس کو حیران و حیران چاہتا تھا۔ اسے یہ یقین تھا کہ غزل کی زندگی میں اس سے پہلے کی مروری نہیں آیا۔ اب اس پر کسی طرح منکشف کر سکتی تھی کہ ایک شخص نے اسے بیوی بنایا، طلاق دی اور پھر قانون کے بے رحم ہاتھوں نے اسے مجرم قرار دیتے ہوئے دو سال کے لیے سلاخوں کے پیچھے قید کر دیا۔ ان بھیا تک یادوں کو تازہ کرتے ہوئے خوف سے اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کے لیے ایک بڑا مسئلہ تھا۔ عابد کتنا ہی وسیع القلوب کیوں نہ ہو، یہ گوارہ نہیں کرے گا کہ ایک تاریک ماضی



تری یادوں کے گلاب

کی حامل عورت اس کے پیارے بیٹے کی تربیت کرے۔ اس کا دل بے چین ہو گیا اور آنکھوں سے اختیار آنسو بہنے لگے۔ ماضی کا ایک ایک پل اس نے ہولناک اذیتوں میں گزارا تھا اور اب حال نے بھی اسے جرح کے لگانے شروع کر دیے تھے۔

جج صاحب کی کونجی میں آنے کے بعد اس نے پہلے دو سخت بڑی بے چینی سے گزارے۔ دانتوں سے دور دور رہنے کی کوشش کرتی اور جج صاحب اکثر اسے ڈانٹتے ہوئے اس بات کا ذکر کرتے وہ سر ہٹھکائے ان کی ڈانٹ سنتی اور پھر اپنے کمرے میں بند ہو کر رونے لگتی۔ بچہ اس دل کا واحد سہارا تھا جسے ہانپوں میں لے کر اس کے بے قرار دل کو گھڑی دو گھڑی کے لیے پھانچا جاتا تھا لیکن بچہ کی مشکل یہ تھی کہ وہ اس کے پاس آتے ہی خدا کرنا کہ چلو اس کو لے کر جج صاحب کے کمرے کی طرف ہے۔

ایک شام عابد جج صاحب اور غزل لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بچہ جج صاحب کو گود میں تھا۔ اچانک انہوں نے کہا۔

”بچی رات ایک عجیب واقعہ ہوا۔“ اس کے کان کھڑے ہو گئے وہ کہہ رہے تھے۔  
”کونجی سوچتے سوچتے میری نظروں میں ایک لڑکی کی تصویر ابھر آئی۔ اسے اس جرم میں مری عدالت میں پیش کیا گیا تھا کہ اس نے اپنے جیسا ز شوہر سے مل کر کئی افراد کے ساتھ ہم بازی سے لاکھوں روپے تنصیب لیے تھے۔“ وہ نازک گھڑی آگئی جس کے خوف کی گواہ ایک عورت سے اس کے سر پر لگ رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ چائے کا مکھن جیسے اس کے مطلق میں ادھ گیا ہو۔ جج صاحب کہہ رہے تھے۔

”عجیب بات ہے کہ اس لڑکی کی شکل تم سے ملتی جلتی تھی۔“ عابد نے ایک قہقہہ مارا۔

اور بولا۔

”اباجان کیا اسی اچھا ہوتا کہ وہ غزل کی ہمشکل ہونے کے بجائے خود غزل ہوتی۔ تو اس کو سزا سناتے اور میں وہاں سو جود ہوتا تو جانتے ہیں کیا کرتا؟“ جج صاحب نے زندہ رہی۔ کہا۔ ”تم یقیناً مجھ سے بحث کرتے کہ اس لڑکی نے کوئی جرم نہیں کیا قصور معاشرے کا ہے۔“ بدستور بیٹھا ہوا بولا۔

”اباجان میں اس سے کہتا کہ مجھ سے شادی کر لو میں تمہاری جگہ سزا بھگت لوں گا۔“

جج صاحب سنجیدہ ہو گئے۔ انہوں نے بچہ کو اپنے ساتھ جتنا تے ہوئے کہا۔ ”نہ“

تری یادوں کے گلاب

نہ نہیں کرتے جرم کا داغ ایسا داغی ہوتا ہے کہ اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ مجرموں کو اس بات کا اچھی سے احساس ہوتا ہے۔ اسی لیے جیل سے رہائی کے بعد اگر انہیں اتفاق سے معاشرہ میں کسی طرح بات مقام مل جائے تو وہ زندگی بھر اپنے داغ کو چھپانے کے لیے ہزاروں جھوٹ بولتے۔“ بیٹے نے پوچھا۔

”اباجان کیا معلوم جس لڑکی کو آپ غزل کی ہمشکل بتا رہے ہیں وہ یہ خود ہی ہو۔“ اس نے اذیت کا کر غزل کو مخاطب کیا اور بولا۔

”میرا خیال ہے کہ اباجان کے شک کی بنا پر پولیس کے ذریعے تمہاری انکوائری اولیٰ چاہیے۔“

غزل کا رنگ فنی ہو گیا۔ چائے کا مکھن اس کے مطلق سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ اسے خدا کا گناہ لگاتے کھائے دو دور ہری ہوئی۔ جج صاحب پریشان ہو کر اٹھے لیکن اس سے پہلے ہی عابد اسے منہال چکا تھا۔ اس نے اس کی کمر سہلائی اور پھر پانی پلا کر اسے چائے کی کدوہ کر کے ساتھ لایا۔ لگا کر بیٹھا جائے۔ کھانسی کے سبب غزل کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ بچہ پریشان ہو کر رونے لگا۔ جج صاحب نے اسے چوکارتے ہوئے چپ کرانے کی کوشش کی مگر وہ روئے چارہ لیا۔ انہوں نے اسے اس کی ماں کو سوچتے ہوئے عابد کو سر دیش کی۔

”تم نے ابھی ابھی میری بہو کے بارے میں جو مذاق کیا وہ مجھے قطعی پسند نہیں آیا۔ میں نے جو محض ایک بات کی تھی لیکن یہ تمہاری زیادتی ہے کہ تم نے غزل کو اس جرم لڑکی کی جگہ کھڑا کر دیا اُنہو بیٹے میں تمہارے منہ سے ایسی بات نہ سنوں گے؟“

عابد نے اطاعت شعاری سے جواب دیا۔

”بہتر اباجان۔ میں اپنے مذاق پر شرمندہ ہوں۔“ اس واقعہ کے بعد غزل کی ذہنی حالت اور بگڑنے لگی۔ وہ شوہر، بیٹے اور سرسری سوچوں کی باوجود اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگی۔ اسے صاف لگتا تھا کہ بے جرم زندگی اس پر ایک اور دھم لگانے کی فکر میں ہے اور یہ کبھی نہ منہل ہونے والا دھم ہوگا۔ وہ اپنے دل کی باتیں کسی سے کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہٹا کرنا چاہتی تھی، لیکن اس سے کہے۔ اس گھر میں سب اس کے اپنے تھے۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کا بوجھ کوئی اپنی نردن پر لانے کے لیے تیار نہیں۔ چھ سات ہفتے بیت گئے۔ اس دوران کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا لیکن غزل کی ذہنی کیفیت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ جج صاحب کوئی خاص بات کرتے

بچنے والے تھوڑی دیر کے بعد اس نے ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز سنی۔ وہ بے چینی میں ادھر بھاگی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ جج صاحب سے اپنا ہوا تھا۔ اس نے اپنے سر کی آبدیہ آنکھیں دیکھیں تو اس کے جذبات بے قابو ہو گئے۔ یک ایک اس نے محکمہ کفر کی طرف دیکھا اور اس کی رنگوں میں تیزی سے گردش کرنے والا خون ایک دم رک گیا۔ یہ چہرہ اس کا جانا بچا تھا۔ یہ وہی شخص تھا۔ جس نے اسے جینے کی جہنم کا ایذا من بنا دیا تھا اور آج اسے برسوں بعد زندگی دوبارہ اس کو دے کر روپ میں اس کے سامنے لے آئی تھی۔ وہ بیہوش ہو کر دھڑام سے فرش پر گر پڑی۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ اپنے بندہ دم میں بستر پر دراز تھی۔ عابد اس پر جھکا ہوا پوچھ رہا تھا۔

”جان اب کبھی طبیعت ہے؟“

اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر دیا اور اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہا لگے۔ عابد کی چوٹانی پر ٹھٹھکیں آئیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آج اسے دنوں بعد اس پر یہ دورہ کیوں پڑا۔ جب اس نے اس کو تسلیاں دیں تو غزال بولی۔

”عابد اب میں زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہوں گی۔ تم وعدہ کر دھیری قبر پر روزانہ پھول چڑھاؤ گے۔“ عابد نے پیار سے اس کے رخسار پر چپٹ لگائی اور ڈانٹتے ہوئے کہنے لگا۔

”ایسی خوفناک باتیں کرتے وقت میری نہیں تو کم از کم بچہ ہی کا خیال کر لیا کرو۔“ جیسے اگر عمر نے کاہت شوق ہے اور میں جیسے اچھا نہیں لگتا تو بچہ کو بڑا ہو لینے دو پھر میں تمہارے شوق کی راہ میں حرام نہیں ہوں گا۔“

غزال کے دل پر ایک چکر سا لگا دھکی وہ اپنے ذاتی دھکوں کی سمجھیر تائیں جھلا ہو کر عابد اور بچہ کو بالکل فراموش کر چکی تھی۔ ان دونوں کی خوشیاں اس کی ذات سے وابستہ تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے لیے ہر حال میں زندہ رہنا ہے۔ وہ ڈارو دھکا روئے گی اس کا نوا ہو ا دل جی جی جی کر فریاد کر رہا تھا۔

”کوئی! میں نے کسی کے ساتھ ایسی کوئی زیادتی نہیں کی جس کی اتنی بڑی سزا کا مجھے مستحق قرار دیا گیا ہے۔“

پانچ دن گزر گئے۔ اس دوران مساجد سے اس کا آسانا سا نہیں ہوا۔ اس نے زیادہ وقت اپنی مسمری پر گزارا کیونکہ وہ جی جی جی شہید بنا رہی تھی۔ جج صاحب پہلے تین دن اس کو کنگی کی بار دیکھنے

ہوئے اس کی طرف دیکھتے تو وہ لرز جاتی۔ اسے لگتا کہ ان کی نظریں اس کے چہرے پر اس نے گڑی ہوئی ہیں تاکہ وہ اس کی اصلیت پہچان لیں۔ عابد باتیں کرتا تو اسے شبہ ہوتا کہ اس نے جیل ڈھنسی ہیں اور وہ اشارہ اس پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش میں ہے کہ وہ اس کے گناہوں کے بارے میں واقف ہو چکا ہے۔ کبھی کبھار اتفاق سے اس کا سوز جگڑتا تو اسے اس کے غصے میں انتہائی اتہا پسندی نظر آتی۔ وہ تنہائی میں بیٹھ کر تجزیہ کرتی تو اسے خوف آتا کہ کہیں عابد اور جج صاحب نے اس کو محض اس لیے نظر انداز کر دیا ہو کہ بچہ ابھی چھوٹا ہے، اس کی پرورش کے لیے ماں کا دونا ضروری ہے۔ وہ اس دور سے نکل جانے تو پھر اسے اس کی مکاری اور یا کاری کی اصلیت بتا کر اسے نکالنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔ ایسی ان محنت سوچوں نے اس کے دماغ کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنالیا تھا۔ وہ ان خیالات سے نجات پانے کے لیے کمرہ بند کر کے ڈارو دھکا روئی رہتی۔

ایک شام عابد نے اپنے باپ سے کہا۔

”میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ لیکن دوڑک گیا جج صاحب نے سر کے اشارے سے اسے اپنی بات مکمل کرنے کے لیے کہا۔ تو وہ آہستگی سے بولا

”مساجد آیا ہے۔“ جج صاحب مداخلت کرتے ہوئے چلائے۔

”تم نے اسے دھکے دے کر باہر کیوں نہیں نکلایا؟“ عابد مسکراتا ہوا کہنے لگا۔

”بھری پوری بات سن لیجئے۔ اب وہ مکمل طور پر تبدیل ہو گیا ہے۔ اب جان دو مجھ سے بہت کم رو رہا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ آپ سے معاف کر دیں۔“ جج صاحب نے ایک گہرا سانس لیا اور بولے۔

”اچھا اچھا تو یہ بات ہے، لیکن پہلے تم تسلی کرو کہ کہیں کوئی نیا ناکہ تو نہیں رچا رہا۔ مجے اس کے قول و فعل پر کوئی اعتبار نہیں۔“ عابد نے آدھے گھٹنے سے بھی کم عمر سے میں اپنے باپ کو کہا

جھا کر رام کر لیا اور اسے اجازت مل گئی کہ وہ اسے ہوٹل سے گھر لے آئے۔ غزال کے لیے یہ خبر دھماکہ خیز تھی۔ وہ پاکھت اپنے غم بھول گئی اس کے گھر میں ایک نیا شخص آنے والا تھا۔ کوئی انجینیئرس بلکہ خود اس کا اپنا پورے دیار بھائیوں سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ اس کا کوئی بھائی نہیں تھا اور اب زندگی کی ابھی ہوئی راہوں میں اس کا بھائی نمودار ہونے کو تھا۔ اس نے سوچا وہ اس سے غریب غریب باتیں کرے گی۔ اس کی دیکھ بھال کرے گی۔ اس کو اذیت دینے کرے گی اور اس کے لیے پیاری پیاری دلہن لائے گی۔ اس نے پہلے ہی ذہن میں جہازیں



کے لیے آتے رہے لیکن پھر وہ خود دلیر یا کا شکار ہو گئے اور بستر سے لگ گئے۔

اسی دوران ایک رات ان پر دل کا دورہ پڑا۔ عابد اُن کو بلا لایا۔ اس نے بتایا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ سچ صاحب کو پانچ دن تک بستر سے نہ اٹھنے دیا جائے۔

عابد نے یونیورسٹی سے بھٹی لے لی۔ وہ خت پریشان تھا۔ بیوی کی اور باپ کی علالت نے اسے پُر مزدور کر دیا تھا۔ بچہ بھی مریض ہو گیا تھا۔ ایک دن یونیورسٹی سے عابد کو فون آیا کہ وہ دو گھنٹوں کے لیے وہاں آ جائے کیونکہ ایک اہم شخصیت معائنے کے لیے آ رہی ہے۔ عابد نے انکار کرنا چاہا لیکن یہ سوچ کر اس نے ارادہ بدلتی کر دیا کہ وہ اپنے شعبہ کلاس براہ ہے اور وائس چانسلر نے گزارش کی ہے اس کو واپس کی تھی کہ وہ اس اہم شخصیت کو خود اپنے ان منصوبے کے بارے میں آگاہ کرے۔ جنہیں وہ مستقبل کے تعلیمی ڈھانچے کے لیے مانگ رہا تھا۔ وہ اپنے بھائی صاحب کو سچ صاحب اور غزل کی جھجکداشت سوچ کر یونیورسٹی چلا گیا۔ اس سے لطفی یہ ہوئی کہ اس نے اپنی بیوی کو اپنے اس پروگرام کی اطلاع نہیں دی، اس کا خیال تھا کہ وہ سو رہی ہے۔ غزل آگئیں بند کئے لٹٹی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ عابد گھر پر ہے۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے دروازہ کھولا تو اس نے آگئیں کھول کر دیکھا۔ وہ آج کا ساجد اور ماضی کا ریاض تھا، اس کے چہرے پر شہیدانہ فطرت کے آثار تھے۔

”ہوں..... تو اب تم یہاں ہو؟ مجھے ظلم نہیں تھا کہ تم نے میرے ہی گھر میں پناہ دے کر میرے ہی بھائی کو اپنا شوہر بنا لیا ہے۔ واقعی تم ایک خرافہ اور چال باز عورت ہو۔ مجھے تمہاری صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا تو میں تمہیں جیل بھجوانے کے بجائے اپنے ساتھ رکھتا اور اہم دفتروں و دسروں کو شکار بناتے۔“ اس نے سختی سے غزل کا ہاتھ پکڑ لیا تو غزل نے دانت کچکا کر اس کے ہاتھ پر کاٹ لیا۔

ساجد نے رد کی شدت سے اپنا ہاتھ پیچھے کیا تو وہ پوری قوت سے جھکی۔

”بچاؤ۔ بچاؤ۔“ ساجد نے ایک زوردار گھبراہٹ کے منہ پر سید کیا اور غرایا۔

”کتیا اگر تمہارے حلق سے آواز نکلی تو میں پڑے میاں کو جا کر تمہاری اصلیت بتا دوں گا کہ تم دو سال پہلے میری بیوی تھیں اور میں نے تمہیں طلاق دے دی اور پھر عدالت نے تمہیں دو سال کی سزا دے کر جیل بھیج دیا۔“ غزل پر جذباتی کیفیت طاری ہو گئی وہ پوری قوت سے چلائی۔

”جاؤ۔ جاؤ۔“ تینا دوسب کو کہہ کر تم نے میری ماں کو دھوکہ دے کر اپنی خرافات کا سکہ جمایا۔ مجھ سے شادی کی، میرا بچہ فروخت کر کے آٹھ لاکھ روپے ہتھیا لیا اور پھر تم نے مجھ پر اپنا

بھوت موٹ کا پیار جنا کر میرے نام سے ایک ریکرڈنگ ایجنسی کھولی، سینکڑوں افراد کو دھوکہ دے کر ان سے لاکھوں روپے وصول کیے اور میری نامی میں جعلی پاسپورٹ اور جعلی میرٹھ میرٹھ گھر میں رکھ کر غائب ہو گئے۔“

”مانتا ہوں لیکن جانتی ہو میں سچ کا مینا ہوں۔ برجیہ کا ایک ثبوت ہوتا ہے تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟“ ساجد نے ڈھٹائی سے کہا۔

”بیٹے زمین کی عدالتوں سے ماوراء ایک اور عدالت ہے جہاں عدل کا اصل کام ہوتا ہے۔ اچیں سے مسائل مہیا ہوئے اور انصاف ہو گیا۔ میں نے اپنے کانوں سے تمہارا اعتراف سنا ہے۔ اب تمہارے خلاف کسی اور ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔“ دروازے سے سچ صاحب کی آواز نکلی وہی اور ساجد کا چہرہ زلزلے کی طرح سفید پڑ گیا۔

”میں تمہیں دو ہرے جرم کے اصرام میں گرفتار کرنے کی سلاش کرتا ہوں۔“ ساجد جیسے بے جاں ہو گیا تھا۔ ہمد کی کاروائیاں سچ صاحب کی نگرانی میں ہوئیں۔ عابد بڑے دل کا مالک تھا۔ ساری دروازیں کر اس نے غزل کی قدر و منزلت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ غزل اب برقرار سے آزاد ہو چکی تھی اور اس کا چہرہ اپنے شوہر بننے اور دوسرے کے لیے سد بہار لگا پ کی مانند شگفتہ و شاداب ہوئی۔

”دلہن لائیں کیوں بچھاری۔ بیشودی کام کرنا جس سے مجھے تکلیف ہو۔ اندھی دھندلی تو ایسے ہی میں ہوں۔ رات میں اٹھتی ہوں تو دس شوکرین کھاتی ہوں۔ کتنی پار کہا ہے کہ لائیں جلی پھوڑو یا کرو۔“

”تعلیم کی قیمت معلوم ہے اماں بی؟ پوری رات بھر میں جل کر خاک ہو جاتی ہے۔ اتنی دولت کہاں سے آئے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں سب کیلئے بس میں ہی ایک بوجھ ہوں سوچتی ہوگی کہ کر گرا چڑھاں، تاجک ٹوٹ جائے ہسپتال جاؤں اور مرگپ جاؤں۔ کچھ تو بوجھ کم ہوگا۔ ماری لکسی ہی بوجھ بنی ہوئی ہوں تو ایک دفعہ خود کو اسافر چہ کر دو۔ نہ ہر شکوہ الودار مجھے کھلا دو۔ ہائے اللہ اتنی طویل عمر کیوں دی کہ لوگ اکتا جائیں۔“ اماں بی شروع ہو گئیں۔

دل تو چاہا۔ ٹھیکہ بیگم کا جواب میں خوب سنائیں۔ لیکن شوہر کی چار پالی کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ ان مجرور سوپ میں محنت کرنے کے بعد رات کو تھوڑا سا سکون ملتا ہے۔ یہ سکون تو نہ چھوٹے اگر انہوں نے ایک کچی جراب دے دیا تو اماں بی ساری رات نہیں سوتے دیں گی۔ اور فریاد علی کی شکایتی لہجہ میں ٹھیکہ بیگم کے بدن میں چھپتی رہیں گیں۔ بے چارے جسم کے ابا تو بونا بول ہی گئے تھے۔ کچھ بھی ہو جائے ان کی زبان بند رہتی ہے۔ ماں کی زیادتی ہوتی ہے تو ان کی نفس کشی کرتے رہتے ہیں۔ بیوی بچھلائے تو ان نگاہوں میں شکایت ابھر آتی ہے۔ کہتے کسی سے کچھ نہیں ہیں پہلے تو ایسے تھکی۔ ہر وقت ہنستے بولتے رہنے والے نہ جانے کیوں اس طرح خاموش ہو گئے ہیں۔

شوہر کی محبت دل میں پھولی تو ٹھیکہ بیگم آہستہ سے بولیں۔

”اچھا اماں ناراض نہ ہوں۔ ابھی جلانے دیتی ہوں۔ غلطی ہوگئی۔“ اور پھر وہ ٹاٹ کے پردوں سے بنے ہوئے باورچی خانے میں گئیں۔ تختے پر سے دھچک اٹھائی اور لائیں روشن کر دی۔

”فریاد علی بے سندھ سوز ہے تھے۔ ان کا ایک ہاتھ چار پالی سے لیے لٹک رہا تھا۔ ٹھیکہ بیگم آگے بڑھیں اور شوہر کا ہاتھ آہستہ سے درست کر دیا۔ بے چارے کو صبح چار بجے اٹھنا تھا۔ باہر مل پر کمزروں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ مل میں پانی چار بجے سے آتا تھا اور گھڑے کستر بجا شروع ہو جاتے تھے رات کو بارہ ایک بجے گھڑے لائن میں لگانے پڑتے تھے۔ اگر دارا بھی دیر ہو جائے تو پھر دس

## ”ٹوٹے دلوں کا سہارا“

”حیرا ستیا ناس“ ٹھیکہ بیگم سوتے سوتے بے اختیار بڑبڑائیں اور پھر جلدی سے اٹھ کر گردن بھاڑنے لگیں۔ گردن پر ایک موٹا سا دروازہ پڑ گیا تھا۔ لیکن مکمل ہاتھ نہیں آیا۔ کچھنی کاٹ کر چار پالی کی چول میں گھس گیا ہوگا اور اس کا ایک ہی علاج تھا۔ لیکن صرف دل کی تسلی کے لئے انہوں نے جھک کر پیٹی کے نیچے پڑی ہوئی جوتی اٹھائی اور پائے کے قریب پاں پر مارنے لگیں پھر انہوں نے زمین پر جوتی کا تھکا ٹھن دیا۔ بلاشبہ کچی مکمل مارے گئے۔ لیکن معلوم نہیں کہ ان میں اصل مجرم کوئی تھا بھی یا نہیں۔

اصل نقل کی تیز کون کرے۔ ان موزوں کا تو مرنا ہی بہتر ہے۔ حالانکہ دن بھر چار پائیاں دھوپ میں پڑی رہتی ہیں۔ لیکن غریب کے گھر کے مکمل بھی موسم کی شدت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اپنا ٹھکانہ کن چھوڑے۔ جس طرح گھر میں لیکن زد بھی نہ کی کہ کر گزرا رہ کرتے تھے۔ وہ بے چارے بھی دن بھر سوپ کھاتے اور رات کو پتلا پانی جیسا خون چوس کر گزارہ کر لیتے۔

نیند اپنی جی جی۔ ٹھیکہ بیگم نے گہری سانس لی۔ لیکن دیوار پر لٹکا ہوا سا چالاک کچھ روڑک پڑیں۔

”تخت ہے ان کم بختوں پر۔ پھر لائیں بھانا بھول گئیں۔ کس قدر لا پرواہ ہیں۔ باپ کی پریشانوں کا کوئی احساس نہیں۔“ دل تو چاہا کہ وہ دونوں کی چونچیاں کھینچ کر اٹھا دیں۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر روک گئیں۔ ایک کراہ کے ساتھ چار پالی سے نیچے اتریں۔ چار پالی ان سے زیادہ قوی تھی۔ وہ ٹھیکہ بیگم سے زیادہ زور سے کراہی مچی۔ ٹھیکہ بیگم نے دالان میں تخت کے برابر رکھی ہوئی لائیں اٹھائی اور اس کی حق نیچی کر کے پھونک مار دی۔ تار کی کچھ اور گہری ہوگی پھر وہ لائیں رکھنے کے بعد اٹھا رہے بے قدم اٹھاتی ہوئی چار پالی کی جانب بڑھیں اور اسی وقت اماں بی کی آواز سنائی دی۔



انڈیا بنگم نے جس وقت اسے ہنسنے بولنے دیکھا ہوگا۔ وہ جانے کون سا وقت تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے حالات کو بہتر بنانے میں لگا رہتا تھا۔ لیکن آج کل حالات بہتر نہیں ہوتے۔ غراب سے غراب ہوتے جاتے ہیں۔ سو ایسا ہی ہو رہا تھا۔ یہ خوش کام تھی۔ مہنگائی اور دوسرے مسائل ہمسروں کی طرح افزائش پا رہے تھے۔ پہلے وہ چھ گھنٹے محنت کرتا تھا۔ اب چودہ گھنٹے مصروف رہتا تھا۔ لیکن ہونہیزی کی دیوار میں پھری نہ ہو سکی تھیں۔ کمروں کی چیمیں بدستور نشین کی تھیں۔ ہاں اگر ترقی پائی تھی تو صدف اور جسم کی جڑائی نے ان کے صمن نے۔ مسرت زدہ جھوپڑی میں ان دونوں لڑکیوں کا حسن چوری کی چیز معلوم ہوتا تھا۔ پڑوس کی اکثر عورتیں کتنی تھیں کہ دونوں لڑکیاں تو کہیں سے مہمان آئی ہوں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن یہ مہمان ہی فریادگی کے لئے سوا ہیں روح ہے۔

وہ ایک بڑھا کھٹا آدمی تھا۔ معمولی تنخواہ تھی۔ جس میں دونو جوان بیٹیاں، ایک ماں اور بیوی اور وہ خود بیسے وہ کسی گنتی میں ہی تصور نہیں کرتا تھا۔ سب کے سب زندگی کے لوازمات میں عمل ہر ضرورت کے طلب گار۔ کہاں سے پوری ہو تھیں یہ ضرورتیں؟ اس سے زیادہ کیا کیا جاسکتا تھا۔ بے شمار بوجھ تھے زندگی پر اور ان کا بانیٹھ والا کوئی نہ تھا۔ بیٹیاں بیس سال کی عمر تھیں۔ لیکن بچپن سے کم کا نہیں لگتا تھا۔ لے دے کر یہ ایک جھوپڑی تھی جو سکون کا باعث تھی۔ بیٹے کی طرح اگر یہ سر چھپانے کا مکان نہ تھی نہ ہوتا تو؟

فریادگی اپنی تمام آرزوؤں کو گہنا چکا تھا۔ لیکن زندگی کی تھکن میں اگر کوئی حسرت سراہا تھی تو صرف بیٹے کی۔ کاش اس کا ایک بیٹا ہوتا۔ صرف ایک بیٹا، ایک کڑیل جوان جو اس کے جھگٹے ہوئے بدن کے لئے ستون ثابت ہوتا۔ ہاضی بھول جانے کی چیز ہوتا ہے۔ حال جدوجہد کے لئے۔ لیکن مستقبل، مستقبل تنویش کی لکیر ہے۔ فریادگی کا مستقبل، صوب سے چپے ہوئے ایک طویل و عمریش میدان کے سوا کچھ نہیں تھا۔

جہاں کوئی سامنے دار درخت موجود نہ ہو۔ جب وہ مستقبل کے میدان پر نگاہ ڈالتا تو اس کی زبان بیاس کی شدت سے سوکھ جاتی یہ غریب صحرائہ کامل عبور محسوس ہوتا اور اس وقت اس کا بدن ہولے ہولے کانپنے لگتا۔ وہ بے چینی سے ادھر ادھر گردن وٹھنے لگتا تھا۔ کاش اس کا کوئی بیٹا ہوتا صرف ایک۔

دونوں بیٹیوں کی طرف تو اس نے دیکھا چھوڑ دیا تھا۔ چند روز قبل کی سوکھی ٹکڑیاں اچانک مرہز چوں سے ڈھک گئی تھیں جو ان کا قصور نہیں تھا۔ لیکن یہ فریادگی کا قصور بن گیا۔ عقل آمدنی

بیٹے سے پہلا خبر نہ آئے۔ اس لئے فریادگی کو یہ کارروائی کرنی پڑی تھی اور بیٹے سے وادی بھی فرما۔ علیٰ کسی خوشی اٹھائے ہوئے تھا۔

حالانکہ اس طرح گھڑوں کا خطرہ مول لینا بڑا تھا کیونکہ اکثر قتل پر سے گھڑے چوری ہو جایا کرتے تھے۔ آج کل سٹی کا گھڑا بھی پچاس ساٹھ روپے سے کم نہیں آتا۔ لیکن کیا محسوس ہوئی کہ خیال کیا جائے تو پانی بھی نہ لے۔

گھیلے بنگم نے چار پائی پر گروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر کے خیالات کو ذہن سے جھٹکنے لگیں رات کی غنڈک میں تھوڑی سی نیند آ جائے تو سکون مل جاتا ہے۔ ورنہ دن بھر کی تپش اور پھر گھر کے کام کاج، آرام کا ایک لمحہ بھی نہیں ملتا تھا۔

”بائی“ جسم نے صدف کے کلام بدن میں انکی جھوٹی اور صدف اچھل پڑی۔  
”کتنی بار کہا ہے کہ گدگدی مت کیا کر۔ کسی دن ہاتھ پڑوں گی۔“ صدف نے فیصلے کیے میں سرگوشی کی۔

”تمہارا بدن ہے یا روٹی کا ڈھیر۔ ذرا سی انگلی چھوڑ تو گدگدی ہونے لگتی ہے۔“ تبسم نے کہا۔

”تیری طرح چکر کا بدن نہیں ہے۔“  
”ہوتے ہوگا۔ میں تو بس ایک ہی خوشی ہے۔ یہ کھل ہمارے بدن میں نہیں کاٹ سکتے۔“  
”پاکل ہے تری..... سوئی کیوں نہیں؟“ صدف نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا۔  
”خدا بھلا کرے وادی اماں کا۔ لائیں پھر مل گئی۔ کچ بائی اندھیرا ہوتے ہی میرے بدن میں ریہہ کی موجیں ابھرتی ہیں۔ کینٹ کا چہرہ سوکھا سزا ہے۔ مکر موٹھیں لگتا ہے۔ دو گھبریاں ہر جڑے بٹھی ہیں۔“

”سوئے گی نہیں۔“ صدف فرمائی۔  
”ایمان سے بائی ڈر لگ رہا ہے۔ بائی تم سے لپٹ نہاؤں؟“  
”گرنی کے ماتے بدن چل رہا ہے۔ دور مت کر لپٹ۔“  
”ارے بائی ڈر جو لگ رہا ہے۔“ تبسم نے کہا اور صدف کی ڈانٹ کے باوجود اس سے لپٹ گئی۔

فریادگی کی کہانی بھی بے شمار کہانیوں سے مختلف نہیں تھی جو چاروں طرف بکھری پڑی ہیں۔

"صبح کو دودھ کس نے لیا تھا؟"

"کیوں؟"

"بتاؤ"

"میرا خیال ہے تم نے۔"

"ٹھیکہ بیگم خود لے لیا کرو۔ بچوں کا ہر ایک کے سامنے جانا ٹھیک نہیں ہوتا۔"

"اچھی بات ہے۔" ٹھیکہ بیگم نے جواب دیا اور یہ ان کی خولی قصبی شوہر کی بات کو ہمیشہ اہمیت دیتی تھیں اور زیادہ سوالات نہیں کرتی تھیں۔ فریاد خولی کو اگر کچھ خوشیاں حاصل تھیں تو اسی نعل میں کہ وہ زمانہ شناس تھا۔ اور کئی بار اس بات کو نوت کر چکا تھا کہ جب صدف یا تبسم دودھ لیتی تھیں تو چائے مزیدار ہوتی ہے۔ اس کی نگاہ تو ایک ایک شے پر تھی اور زمانے کی ہولناکیوں نے اس کی زبان بند کر دی تھی۔ ہر وقت ایک ہی خیال کھائے جاتا تھا کہ اس کا بوجھ بٹھنے والا ہونی نہیں ہے۔ خود تو جیسی گزرے گی گزر جائے گی۔ لیکن دونوں بیچاس عزت سے اپنے گھر پہلی ہائیں تری زندگی کے سب سے بڑے بوجھ سے نجات مل جائے۔ یہی گھر اس کی آنکھوں کی چٹائی کو دھار کرتی تھی وہ اپنے طور پر ہی جتنا طار رہتا جا رہا تھا۔ کسی سے اچھے سے کیا فائدہ اخبارات میں دوڑانے سرخیاں ہوتی ہیں۔

پڑوسی نے نو جوان لڑکی کو انخواہ کر لیا۔ لڑکی کو چھپڑنے سے باز رکھنے پر قتل کر دیا اور ایسی ہی بے شمار خبریں۔ اس کے علاوہ گھر سے باہر زندگی بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھی۔ چنانچہ دل ہی دل میں وہ ان حالات سے بہت خوفزدہ رہتا تھا۔

اس شام جب وہ زہنی سے واپس آیا تو گھر سے کچھ فاصلے پر بہت سے لوگ جمع دیکھے۔ اس کا دل دھک سے ہو گیا اور ہولے ہولے قدموں میں تیزی آگئی۔ لوگ فضل دین کے سامنے ملے تھے اور شیر و۔ ان کے درمیان دھماکا رہا تھا۔

"آپے گئی ہے۔ تمہارے باوا کی جائیکر نہیں ہے۔ سالے پانی پھیلا دیتے ہیں۔ کان کھول کر ان کو۔ آئندہ گلی میں کچھڑ ہوئی تو جھو پڑے میں آگ لگا دوں گا۔"

"چھوڑو..... شیر و۔ آئندہ خیال۔ جس کے۔ فضل دین۔ اور بات بھی ٹھیک ہے فضل دین۔ سب گزرنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔" ایک بزرگ نے درمیان میں مداخلت کی۔

"تو میں۔" شیر و بھیا تو باجہ گالیاں دیتے گئے۔ "فضل دین نے کہا۔"

تری یادوں کے گلاب

میں جس طرح سانس قائم تھیں۔ وہی کمال تھا۔ ان بچوں کا مستقبل کہاں سے جاتا۔ انہیں نے اسے خاموش کر دیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی شین بنادی تھی۔ لیکن اس شین کے سارے پرزے۔۔۔ تمس رہے تھے۔ زندگی کی کشش میں خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں چھوڑ دئے تھے۔ فانی اس کا ایک بیٹا ہوتا۔ کاش اس کے ہاتھ میں ایک چھوڑا ہوتا تو سائل کا قصور کیا جاسکتا تھا۔

ٹھیک چار پہلے پر لگے برتن کھڑکے شروع ہو گئے اور فریاد خولی جاگ گیا۔ اس ہستی میں وہ تجاہلی نہیں تھا۔ یہ ہستی سانس کی ہستی تھی۔ اس جیسے دوسرے بہت سے لوگوں کی ہستی جن کی کہانیاں ایک دوسرے سے قویٰ ہی مختلف ضرورت تھیں۔ لیکن ان کا ایک ہی محور تھا۔

پانچ بجے دودھ والے نے سائیکل کی بھٹی بجائے۔ بے سکونی کے باوجود گھر کے سب لوگ نلی الصبح جاگ جاتے تھے۔ دادی اس سب معمول مسئلے پر جا بھٹی تھیں اور ذالان کا انتہار کر رہی تھیں اور ٹھیکہ بیگم ذالان میں جھاز دے رہی تھیں۔ صدف گیلی گلیز میں آگ جلائے لی کوشش کر رہی تھی۔ گری کے سخت موسم میں بھی گلیز میں گیلی ہی لیتی تھیں اور یہ نال والے کی مہربانی تھی۔ کیونکہ گیلی گلیز میں وزن میں کم چڑھتی تھیں۔ بہر حال ہر شخص نے ایک دوسرے کے لئے مشغلے مہیا کر دیے تھے تاکہ زندگی کو سکون کا رنگ نہ لگے جائے۔

تبسم برتن لے کر دودھ لینے چلی گئی۔ اس نے دروازے کا پردہ ہٹایا اور برتن آگے بڑھا دیا۔ نور محمد نے تبسم کو دیکھا اور اس کے سونے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے دودھ کا برتن اس طرح تبسم کے ہاتھوں سے لیا کہ اس کی انگلیوں سے انگلیاں مس ہو گئیں۔ پھر اس نے سائیکل میں لٹکے چھوٹے ڈبے سے دودھ نکال کر دیا اور یہ دودھ بھی روزانہ سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ تبسم یا صدف جب بھی دودھ لیتی تھیں وہ گاڑھا اور مقدار سے کسی قدر زیادہ ہوتا تھا۔ اس کے برعکس جب گھر کا کوئی دھرا فر دودھ لیتا تو پانی جیسا پتلا دودھ ہوتا اور نور محمد بڑے ڈبے سے ہی دودھ لیا کرتا تھا۔

"آج چائے مزیدار ہے۔" دادی اماں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا اور فریاد خولی چونک کر اٹھیں دیکھنے لگا۔

"یہ نور محمد کی خوب ہے۔ کبھی کبھی غلطی سے اچھا دودھ بھی لے آتا ہے۔" ٹھیکہ بیگم بولیں اور فریاد خولی نے انہیں بھی غور سے دیکھا پھر دفتر کے لئے تیار ہوتے ہوئے اس نے موقع پا کر بیگم سے پوچھا۔



تری یادوں کے گلاب

"نہیں تو کیا تاشے دوں گا تیرے کو۔ بس آئندہ خیال رکھو۔" شیردہا نے کہا اور پھر اس کی نگاہ فریادہ کی پر پڑی۔

"سلام چاہا۔ اماں تم تو دیکھائی نہیں دیتے۔" شیردہا کا طعنے ختم ہو گیا۔ لوگ منتشر ہوئے تھے۔

"ہاں۔۔۔ شیردہا کو کڑی پیشہ لوگ ہیں۔ دوسروں کی مرضی پر چلتا پڑتا ہے۔ جب بھی چمنی ملے تم سناؤ کب آئے؟" فریادہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ شیردہا ایک بندوق تھیل سے جھوٹ کر آ گیا ہے۔ چرس پیچتے ہوئے بکڑا گیا تھا۔ خیمہ دو کی مڑا ہوئی تھی۔

"بندوق بھر ہو گیا۔ پر تم نظری نہیں آتے۔ فریادہ چاہا۔ سناؤ کیسی گزرو رہی ہے؟" شیردہا اس کے ساتھ ساتھ ہی آگے بڑھ رہا تھا۔

"بس شیردہا۔۔۔ خدا کا شکر ہے۔ ہم جیسے لوگوں کی زندگی کیسی گزر سکتی ہے۔ سب ٹھیک ہے۔" فریادہ نے جواب دیا۔ شیردہا کا ساتھ چلتا ہوا گارا گزرو رہا تھا۔

"نہیں چاہا، میرے لئے دعا کرتے رہا کرو۔ قسم ایمان کی کھلے کے سب سے شریف آدمی ہو۔ میں تمہیں برا ماننا ہوں۔ چاہا۔ تمہاری دعا سے سارے نمے دھندے چھوڑ دیتے ہیں۔

سوچ رہا ہوں گزار شروع کروں اور گزارہ کرنے کیلئے کوئی رچ بھجی لگا لوں۔ چار پیسے کمانا اچھا ہے۔ ویسے تو اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔" شیردہا نے کہا۔

"بہت اچھی بات ہے شیردہا، تمہاری کھائی میں بڑا مزہ ہے۔"

"نہیں چاہا ایک بزرگ سے ملاقات ہو گئی تھیل میں۔ بڑے پیچھے ہوئے تھے۔ ان کی دعا ہو گئی۔ اب میں ہاتھ ٹھیک ہو گیا ہوں۔ سوچ رہا ہوں گھر بساؤں۔ کوئی ٹیکہ بخت آئے گی تو ذمے داری بھی پڑے گی کنڈھوں پر اور پھر کسی نرے احمق سے کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں۔"

"بڑا اچھا خیال ہے۔ کسی اچھے گھر میں رشتہ کرلو۔" فریادہ کی کامکان قریب آ گیا تھا اور وہ رک گیا۔

"ہاں چاہا۔ بس تم ہی نہ رہے ہو۔" شیردہا خواہ مخواہ جتنے ہوئے گردن کھانے لگا۔

"اچھا شیردہا۔۔۔ بڑی خوشی ہوئی تمہارے خیالات سن کر۔ خدا تمہیں جہالت دے اب اجازت دو۔"

تری یادوں کے گلاب

"اب یہاں تک آیا ہوں تو چاہی کو سلام کرلوں۔" شیردہا بھرپور نے لگا۔ فریادہ نے اسے روک دیا۔ وہ اس کی نگاہوں سے دیکھا اور پھر اس کی نگاہوں میں بے بسی اور ہجر آئی۔ وہ خاموشی سے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ گھر کے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ جب اس نے ٹھیکہ پر حکم کو اشارہ کیا اور وہ طرانی ہوئی قریب آ گئیں۔

"دو شیردہا آیا ہے۔ تمہیں سلام کرنے۔"

"شیردہا؟"

"ہاں۔۔۔ کبھی میں مل گیا تھا۔ پیچھے لگ گیا۔ جاؤ پر دے کے پیچھے اسے سلام دے کر لو۔" بس جلدی سے نال دیا۔

"میں نے کبھی بات نہیں کی اس شخص سے اب کیا کروں تم کیوں لگائے اسے ساتھ۔"

ٹھیکہ پر نشان لکے میں رہیں۔

"وہ خود ہی لگ گیا۔ بد بخت جاؤ بس ویسے ہی ٹھیکہ کر کے نال دو۔" فریادہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ٹھیکہ پر بھی پر نشان ہی آگے بڑھ گئیں۔

"کیسے ہو شیردہا؟" انہوں نے کا پتلی آواز میں کہا۔

"دو چاہی۔۔۔ سلام! بس سلام کرنے چلا آیا تھا۔ پڑوس کی بات ہے۔ قسم ایمان کی ہاتھ لگنا اچھا سمجھتا ہوں۔ آپ لوگوں کو۔۔۔ کوئی تکلیف ہو چاہی تو کہہ دیا کرو۔" شیردہا نے بہت لہجہ سے کہا۔

"تمہاری مہربانی ہے۔ بس۔"

"ارے میں تو تمہارا اپنا ہی بچہ ہوں چاہی۔ اجازت دو تو کبھی بھی آیا کروں۔ بڑی محبت ہے۔ مجھے تمہارے گھر سے۔" شیردہا نے کہا۔

اس دور ان ٹھیکہ پر حکم کی بارگاہی جس کی شیردہا بار بار اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے۔

"اچھا بھیا ذرا ڈانڈی چڑھے پر رکھی ہے اللہ تمہیں خوش رکھے۔" ہلا خر ٹھیکہ پر حکم نے کہا۔

اور پڑوس کے پاس سے بہت گئیں۔ فریادہ ان سے زیادہ دور نہیں تھا اور ٹھیکہ پر حکم اور شیردہا کی باتیں سن رہا تھا۔

"ٹھیک ہے چلا جانے کا خود۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"مگر یہ مردار یہاں آیا کیوں تھا؟"





"کیا کہہ رہی تھیں؟" فریادہ نے پوچھا۔

"شیرد کی تقریریں کر رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں غول اچھا ہے۔ کوئی سر پرست نہیں تھا اس لئے غلام راستوں پر چڑ گیا ہے۔ شادی ہو جائے گی تو ٹھیک ہو جائے گا اور پھر انہوں نے صدف اور جسم کے بارے میں بھی پوچھا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ شیرد ہی نے انہیں بھیجا ہوگا۔"

فریادہ غامض ہو گیا۔ یہ خاموشی تمام دن اس پر طاری رہی۔ ساری رات ایک لمبے کے لئے بھی وہ سو نہ سکا۔ غلیلہ بیگم صاف محسوس کر رہی تھیں۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شوہر سے کیا نہیں اور پھر اس دن فریادہ نے شیرد کے کسی قہقہے کو گمز سے نہ اٹھانے دیئے۔ دوسروں سے بھی اس نے بات نہیں کی تھی اور پھر صبح کو وہ گھر سے نکل گیا۔ لیکن آج وہ خلاف توقع جلدی واپس آ گیا۔ شیرد اس کے گھر کے بالکل سامنے ایک ٹرک پول سے ٹکا ہوا تھا آدھار گمن بجا رہا تھا۔ فریادہ کی دیکھ کر اس نے جلدی سے ماؤتھ آدھار گمن پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔

"سلام چاچا۔ آج اس وقت کیسے نظر آ رہے ہو؟" اس نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"تم سے بات کرنی ہے شیرد۔ ان لوگوں کو کھینچ دو۔" فریادہ نے دوسرے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

"چلو بے پھوٹ لو۔ چلو۔" شیرد نے کہا اور دوسرے لوگ چپٹ ہو گئے۔

"گھر چلو چاچا یہاں دھوپ میں۔"

"نہیں بات کروں گا۔ شیرد۔" فریادہ کی لمبے میں تھی۔

"کیا بات ہے چاچا۔" شیرد نے انہیں گہری نظروں سے دیکھا۔

"شیرد یہ کیا حقیقت ہے کہ تم میرے گھر کو سسرال کہتے ہو؟" ایک لمبے کیلئے شیرد ہنسا گیا پھر سنبھل گیا اور پھر سسکراتے ہوئے بولا۔

"بات تم تک پہنچ رہی ہوگی چاچا تو اب مجھے اپنا بیٹا مانو۔ ایمان کی قسم زندگی بھر غلام رہوں گا۔ میں تم کا دس گام کھاتا۔ گھر بھروں گا۔ ایسا لانا تمہیں دوسرا نہیں ملے گا چاچا۔ رنجی بن گئی ہے۔ ایک دو دو سال جانے گی اور میں کاروبار شروع کر دوں گا۔"

فریادہ کی دماغ میں آگ روشن ہو گئی تھی۔ شعلے نکل رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے اس کی انگلیاں تنہا کا شکار ہو رہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ شیرد کی گردن دبا دے۔ حتیٰ کہ اس کی زبان نکل پڑے۔ آنکھیں اٹلی پڑیں۔ لیکن اس کے بعد سب بے سہارا ہو جائیں گے۔

ترکی یادوں کے گلاب

اب اس کی خوشحالی کھا کر گر گئیں اور مرجائیں گی۔ غلیلہ بیگم اندھی ہو جائیں گئیں۔ اور ان کی عزت، ان کی عزت و درد خوشحالی کھائے گی۔ صدف اور جسم گھر گھر حردوری کریں گئیں۔ یہ سارے مناظر فریادہ کی نظر میں محسوس ہوئے۔ اور اس کی انگلیوں کا تشنج کم ہو گیا۔ اس نے غصہ کی ٹکڑیوں سے شیرد کو دیکھا۔

"کسی کی عزت کو ہوں اچھا ان اچھی بات تو نہیں شیرد۔"

"دیکھو چاچا۔ شیرد شادی کرنا چاہتا ہے۔ قربانی تو لے رہا ہے۔ اسے لیکر تو نہیں بھاگا۔ کوئی قربانی ہو میرے میں تو تاناؤ کہیں نہ کہیں تو کرو گے ان کی شادی۔"

فریادہ اب وہاں نہ دک سکا۔ کچھ کہنا ہے عزتی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ خاموشی سے گھر کی طرف چل پڑا۔ شیرد وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ لیکن فریادہ کی دل کی حالت خراب تھی کاش اس گھر کو سنبھالنے والا آج کوئی ہوتا تو..... شیرد..... شیرد..... ان کے ہاتھوں زندگی نہ چلتا۔ گھر میں اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ البتہ دوسرے دن صبح وہ دس بجے گھر سے نکلا۔ یہ رات بھی اس نے آنکھوں میں کائی تھی۔

شام کو چھ بجے فریادہ گھر واپس آ گیا۔ خاموشی تو وہ ہمیشہ کا تھا۔ لیکن آج کل یہ خاموشی کچھ گہری ہو گئی تھی۔ غلیلہ بیگم نے کچھ پوچھنے کی کوشش بھی کی لیکن فریادہ کی سنجیدگی کے سامنے زبان نہ کھل سکی۔

شیرد نے دن شام کو دو گھر میں اور ایک مردان کے گھر آئے۔ وہ فریادہ کی مکان دیکھ رہے تھے اور پھر فریادہ بھی ان کے ساتھ ہی چلا گیا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔" اناس لی نے کہا۔

"خود میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا اناس لی۔ پوچھوں تو کچھ بولنے ہی نہیں ہیں۔"

لیکن اسی شام فریادہ بول پڑا۔

"سامان ہاتھ کو لکھنا اہم یہ مکان چھوڑ رہے ہیں۔ بس ضروری سامان لے لو۔ باقی اللہ خود بندوبست کر دے گا۔"

سب پر تکی کر پڑی تھی۔

"ارے گھر چاؤ گے کہاں؟" اناس لی نے زبان کھولی۔

"جہاں عزت محفوظ ہو۔ اناس لی بس یہاں سے نکلو۔" فریادہ نے کہا۔

تری یادوں کے گلاب

”سر چھپانے کا ٹھکانہ نہیں چھوڑتے فریادہلی۔ مادی مادی پھر دس گی۔ میری بڑھی بنیوں میں دم نہیں۔“

”لفاس۔“ فریادہلی کی آواز میں بے پناہ کرب تھا۔

”آپ کی بڑھی بنیوں پر میں اپنی عزت قربان نہیں کر سکتا۔ ٹھیکہ دو گھنٹے کے اندر اندر تمام تیار یاں مکمل ہو جانی چاہئیں۔“ اس نے کہا اور گھر سے باہر نکل گیا۔ دیوانگی طاری تھی فریادہلی پر۔ اس نے کسی منزل کا یقین نہیں کیا تھا۔ بس چل پڑا تھا۔ سر چھپانے کا ٹھکانہ اس نے محوڑیوں کے بھاؤ بچا دیا تھا۔ دفتر میں استعفیٰ بھی نہیں دیا تھا۔ بس خواہ لے لی تھی۔ نکتہ خریدے تھے اور چل پڑا تھا۔

صدف اور تبسم البتہ ٹرین کے سفر سے بہت خوش تھیں۔ کہیں آتے جاتے انہوں نے فریادہلی دیکھی تھیں۔ لیکن ان میں بیٹنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں اس طویل سفر سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ چند گھنٹے کے سفر کے بعد ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر کی فریادہلی نے یہیں آخرتے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ پورا کیر ساتھ تھا لیکن کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ کوئی تصور نہیں تھا اس وقت صبح کے چھ بجے تھے۔ اس ہستی کا نام نکلن پر تھا۔ وہ ڈو حال سوکانوں پر مشتمل۔ سرسبز زمینوں والی ہستی۔ فریادہلی نے یہاں قدم بھانے کیلئے کیا کیا پاد میں بیٹے۔ لیکن ایک سکون ضرور تھا اس تھوٹی ہستی میں لوگ۔ درمے نہیں تھے۔ وہ ایک دوسرے کی تھوڑی بہت مدد کر رہے تھے۔

فریادہلی کو کوئی ٹھکانہ نہ مل گیا۔ یہ ایک کسان کی جموہ پڑی تھی۔ نوازہلی نے انہوں سے بڑھ کر اپنا تیت کا ثبوت دیا۔ وہ چوہدری شجاعت کی زمینوں پر کام کیا کرتا تھا۔ چوہدری صاحب سے کہہ کر نوازہلی نے صرف بیچیس ہزار روپے میں تھوڑی سی زمین دلا دی اس زمین پر جموہ پڑی ڈولہانے میں بھی نوازہلی نے پوری چوہدری مدد کی تھی۔ ابھی فریادہلی کے پاس اپنی جمع پونجی کی تھوڑی رقم اور موجودہ تھی اور جو اس فریادہلی کو اس مختصری رقم میں اپنے اس گھرانے کا مستقبل تعمیر کرنا تھا۔

عزت کی حفاظت کیلئے یہ اندھ قحطہ مٹا تھا ضروری تھا۔ دوی باجس تھیں یا تو اخبارات میں ایک سنسنی خیز خبر چھپ جاتی یا پھر ایک بڑول باپ بیٹیوں کو لیکر کنارہ کش ہو کر زندگی گزارتا فریادہلی اس ماحول سے اتنی دور نکل آیا تھا جتنی اس میں بہت تھی۔ لیکن وہ اپنے ذہن سے خوف نہ مچا سکا۔ کوئی شیر..... یہاں بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ اس کی چھوٹی سی دکان اب چل بھی تھی اور فریادہلی کسی قدر

تری یادوں کے گلاب

پر سکون ہو گیا تھا۔ لیکن اس خوف کو دور کرنے کیلئے کیا کیا جائے پھر جب نذیر خان نے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے دکھ سے بتایا۔

”کیا کہوں نذیر بیٹائی۔ زمانے کا ستیا ہوا ہوں۔ خدا اولاد دے تو نیک دے۔ دو دنیاں ہیں اور ایک جیتا۔ مگر دنیا جیتنے سے ہی نذری محبت میں پڑ کر خراب ہو گیا۔ شہر کا کون سا مسافر ہے جو اسے نہ جانتا ہو۔ نام تو اس کا شمشادہلی ہے۔ مگر مشمو کے نام سے مشہور ہے۔ مشمو قاتل ہے۔ ڈاکو ہے۔ چلنے لوگوں کی گردنیں کاٹ لیتا ہے۔ پراگمئل اس نے اس وقت کیا تھا جب کالج کے ایک لڑکے نے میری بیٹی کو بھیڑا تھا۔ ایک ہفتہ بتاؤں۔ گیارہ قتل کر چکا ہے۔ چھ لٹنوں کی ہاتھیں توڑ چکا ہے۔ پولیس اس کے فرار ہونے کے بعد مجھے ہی پریشان کرتی ہے۔ ننگ آ کر شہر چھوڑ دیا اور یہاں آ کر آباد ہو گیا۔“

”اوہ..... تو تمہارے بیٹے کو مشمول ہے کہ تم یہاں آئے ہو؟“ نذیر خان نے پوچھا۔

”اس کے مشورے پر ہی تو یہاں آیا ہوں۔ خدا نکسا تھا اسے آج ہی جواب آیا ہے۔“

یہ سن کر نذیر نے تشویش ناک انداز میں گردن ہلائی۔ پھر نذیر نے خیر و کسان کو اور خیر و کسان نے مظلوم کو یہ سنسنی خیز خبر سنائی کہ فریادہلی جیسے نیک دل آدمی کا بیٹا شیطان ہے۔ قاتل اور مادی گمراہی ڈاکو ہے۔ وہ دروہ چلنے لوگوں کو قتل کر دیتا ہے۔

”یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔“

”اگر وہ یہاں فریادہلی سے ملے آ گیا تو؟“

چوہدری شجاعت نے فریادہلی سے ملاقات کی۔

”فریادہلی تمہارے بیٹے کے بارے میں جو کچھ سنا ہے۔ وہ ٹھیک ہے؟“

”ہاں چوہدری صاحب۔ میری ہی اولاد خدا کسی دشمن کو بھی نہ دے۔“ فریادہلی نے بڑے دودھ بھرے لہجے میں کہا۔

”لیکن فریادہلی یہ ہستی پر سکون اور مل کر رہنے والے لوگوں کی ہے ایک پر سکون اور خوشحال ہستی اگر تمہارا بیٹا تم سے ملے آ گیا تو؟“

”وہ تو ضرور ہے چوہدری صاحب لیکن اس نے کسی بے گناہ کو آج تک نہیں ستایا اس ہستی نے اس کے باپ کو پناہ دی ہے۔ یہاں اس کی بہنوں کی عزت محفوظ ہے۔ اگر وہ یہاں آئے گا بھی تو شریوں کی طرح آئے گا۔“



”خیال رکھنا فریاد علی تم نے تمہارے ساتھ نہ اسکو نہیں کیا۔“

”چوہدری صاحب میں تو یہاں رہنے بسنے آیا ہوں۔ میری دو جہان و بیٹیاں ہیں انہیں میں اسی بستی میں بیاہوں گا۔ اس بستی کی مصوبیت کی حفاظت تو میرا بھی فرض ہے، لیکن غور و دریا علی اپنے سامنے سے بھی ڈرتا تھا۔ وہ برہنہ پندرمواڑے ایک خدا لکھتے لکھتے میں رکھتا اور اس اپنا پتہ لکھ کر لیٹر بکس میں داخل آتا۔ پھر یہ خط اسے ملتا اور وہ اسے دوسروں کو ضرور سناتا۔“

”بیچارے بابا جان“

میں غیرت سے ہوں پولیس سے آگے بچو لی جمل رہی ہے۔ ابھی بچھلے دونوں ڈاکٹر ارشد کی گردن آٹا رہی ہے۔ سالہا بڑا بنتا تھا۔ آپ اپنی قسم کب توڑیں گے؟ میرے پاس کافی دولت جمع ہوگئی ہے اگر یہ آپ کے کام نہ آئی تو پھر اس کا کیا مصروف ہے۔ میری دونوں گزیریں کو پیار۔ اماں کو سلام۔

آپ کا فرامہردار

شبشاہد علی

”حرام کی دولت میں کبھی قبول نہیں کروں گا۔ مذہب بھیا۔ میرے پاس جو کچھ ہے اسی میں اپنی بیٹیوں کے ہاتھ پینے کروں گا۔ شربت کے پیالے پر نکاح کروں گا۔ پر اس کی ایک پائی بھی حرام ہے۔ میرے اوپر بھلا میرا اس دولت سے کیا واسطہ۔“

”مگر پولیس تو اس کے پیچھے رہتی ہوگی؟“ مذہب خان نے غور و دریا سے بچے میں پوچھا۔

”عجب ہے تم میرے نیک انسان کا بیٹا ایسا ہے۔“ مذہب خان کہتے اور پھر بات چاروں طرف پھیل جاتی۔

فریاد علی کو کافی حد تک سکون مل گیا تھا۔ ٹھیکہ بنگم اور اماں کی کو بھی اس نے صورت حال سمجھ دی تھی۔ اور ان سے یہ درخواست کی تھی کہ کبھی بستی کی کسی عورت کے سامنے ذکر لکھتے تو اس سے مختلف بات نہ کہیں۔

”یہ جھوٹ ہمیں اس وقت تک بولنا پڑے گا جب تک خدا ہمیں ان دونوں بیٹیوں کے بوجھ سے آزاد نہ کر دے۔“

”لیکن اس کا دوسرا رد عمل بھی ہو سکتا ہے۔“ ایک دن ٹھیکہ بنگم نے دلی زبان سے کہا۔

”کیا؟“

”اوپرے جماعتوں کی بیٹیوں کیلئے لوگ رشتے نہیں لاتے۔ سب کو اپنی عزت اور جان کا

نوف ہوتا ہے۔“

”ہاں یہ پہلو بھی ہے۔ لیکن اللہ ناک ہے۔ اس کی بھی کوئی سبیل نکل آئے گی۔“ فریاد علی

نے بڑے خیال انداز میں جواب دیا۔

کافی عرصہ سکون سے گزر گیا۔ لیکن گردش وقت سکون کی قائل نہیں ہوتی۔ تبدیلیاں اور گامے وقت کے ساتھ ہی ہیں۔ چوہدری شجاعت علی کا اچانک انتقال ہو گیا اور ان کا بیٹا کرامت علی شہر سے واپس آ گیا۔ اس نے بستی کی چوہدریٹ سنہال لی۔ لیکن وہ باپ کی طرح نیک طبیعت نہیں تھا۔ نو جوان تھا اور بستی کے لوگوں کو اپنی رسمیت تصور کرتا تھا۔

چنانچہ اس نے چند غصے لوگوں کو اپنے ارد گرد اکٹھا کر لیا۔ بہت سی شکایتیں جمع ہو گئیں جو صرف ایک دوسرے سے کی جا سکتی تھیں۔ زبانوں میں خوف اور انتشار پیدا ہو گیا اور ایک ٹھنکن کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔

اور پھر ایک دن کرامت علی نے جسم کو دیکھ لیا۔ بستی کی مکمل فساد اور تازہ خزانے دونوں لڑکیوں کو بھرپور جوانی سے نوازا تھا اور ان کے رخساروں پر شعلہ ابھرا آتی تھی۔ کرامت علی حیران رہ گیا اور اسی شام اس نے رشمو لو پار کو طلب کر لیا۔

”سرکار۔“ رشمو نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”برگم والی پکیا کے قریب ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ جس کے پیچھے مکان بھی بنا ہوا ہے

اس مکان میں کون رہتا ہے؟“ کرامت علی نے پوچھا۔

”کسی نے بتایا نہیں سرکار آپ کو۔ اگر نہیں بتایا تو میری طرف سے سن لیں اور پھر کبھی ادھر

نہ دیکھیں۔ باقی پوری بستی آپ کی ہے۔“

”کیوں؟“ کرامت علی نے پوچھا۔

”اس کا نام فریاد علی ہے سرکار۔ وہ بیٹیاں ہیں اس کی لیکن ایک بیٹا بھی ہے، جو شہر میں رہتا ہے۔ بڑا ہی خطرناک ہے۔ بے شمار گناہ کر چکا ہے۔ اشتہار ہی محرم ہے۔ صرف اپنی بیٹیوں کے لئے

دو گنا کئے ہیں اس نے۔ میرا خیال ہے سرکار بس اس مگر کو چھوڑ دیں۔“

"لیکن لڑکی بڑی خوبصورت ہے جیو۔"

"ہوں۔ یہ تو ہے۔" کرامت علی پر خیال انداز میں سر کھانے لگا۔ پھر ایک گہری سانس

لیکر بولا۔

"کچھ بھی ہو جائے رجمو لڑکی اتھو آئی چاہئے۔ کیا نام ہے اس کے بچے کا۔"

"مسمو کے نام سے مشہور ہے سرکار۔"

"تب پھر پہلے شہر میں مسمو کا بندوبست کرنا ہوگا۔" کرامت علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ

پھیل گئی اور پھر یہ مسکراہٹ فنی بن گئی۔

لیکن رجمو اس فنی سے خوش نہیں تھا کسی کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اگر زندگی راڈ پر

لگائی پڑے تو سودا ہنگامہ ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ دوسری طرف بھی بھاؤ کیا جائے اور پھر

کرامت علی کے پاس سے رخصت ہو کر وہ دوسروں کی نظروں سے بچتا ہوا فریاد علی کی دکان کی

طرف چل پڑا۔

فریاد علی کو یہاں آئے ہوئے خاصا طویل عرصہ گزر گیا تھا۔ بستی کے سارے لوگ ایک

دوسرے سے شناسا تھے۔ رجمو نے اسے سلام کیا اور فریاد علی نے بڑے تپاک سے اس کا خیر

مقدم کیا۔

"کجور جو خیریت سے ہو؟"

"ہاں۔ فریاد بھیا۔۔۔۔۔ میں تو ٹھیک ہوں لیکن۔۔۔۔۔ رجمو سوکھا سا مت بنا کر بولا۔

"کیا بات ہے جیو؟"

"فریاد بھیا بستی کی ہر جہتی پوری بستی کی عزت ہوتی ہے۔ لیکن پچھلے کچھ دنوں سے جو ہر دم

ہے اتھارے علم میں ہے۔" رجمو نے کہا اور فریاد علی کا چہرہ اتر گیا۔ کرامت علی کی داستانیں اس

کے کانوں سے دور نہیں تھیں اور اس پر سکون بستی کے سکون میں الجھ چکی تھی۔ فریاد علی تو دودھ کا

چلا تھا وہ پہلے ہی تشویش میں مبتلا ہو گیا اور ان دنوں اس کی راتیں بھر بے سکون ہو گئیں تھیں۔

"ہاں رجمو کہو تو ٹھیک رہے ہو؟" فریاد علی نے کہا۔

"کرامت علی نے نکمیں تمہاری بنٹا کو کچل لیا ہے اور آج کل وہ اس کے بارے میں سوچ

رہا ہے۔ فریاد بھیا خدا قسم میرا دل تو دھک سے ہو گیا۔ تمہارے جیسا طریق آدمی کسی مصیبت میں

پہنچ جاتے۔"

فریاد علی اپنے بدن کی کچکا پھٹ کو نہ چھپا سکا۔ اس نے کھلی کھلی خوشنودی کا ہوں سے دھنوں

نوا کیا اور پھر تھوک نکلنے ہوئے بولا۔

"لیکن تجھے کیسے معلوم ہوا رجمو؟"

"خود کرامت علی نے مجھ سے کہا تھا۔"

"اب کیا کرنا چاہئے۔ رجمو دب۔۔۔۔۔" فریاد علی کے اعصاب ساتھ چھوڑتے چارے تھے۔

"بھوری بستی پریشانی کا شکار ہے۔ سب یہ فنی بات سوچ رہے ہیں بھیا۔ خاتمہ پر بھی رحم

لے۔ لیکن بھیا میرے بھی بچے ہیں۔ خدا کے لئے یہ بات کسی کو مت بتانا کہ میں نے تم سے

کچھ کہا تھا۔"

"نہیں بتاؤں گا رجمو۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ لیکن کچھ ہو جائے گا۔ کچھ ضرور ہو جائے گا۔ اگر مسمو کو

پتہ چل گیا تو۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔"

"میں نے ذمہ دار نہ رہی ہے کسی جہتی یہ بات۔۔۔۔۔ مگر جو ان خون ہے۔ زیادہ ہی گرم ہوتا ہے

۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ نور دین آ رہا ہے۔ یہ ذمہ دار جی کا خاص کرگا ہے۔ میں چل ہوں۔" رجمو نے کہا اور

غائب ہو گیا لیکن فریاد علی کی آنکھوں میں تاریکیاں ابھرا نہیں تھیں۔

"آدھ میر کر دیا فریاد بھیا۔" نور دین کی آواز سنائی دی اور فریاد علی چونک پڑا۔

"کڑ۔۔۔۔۔ ہاں جیو۔۔۔۔۔ نور دین ابھی دیتا ہوں۔"

"کیا بات ہے بھیا کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟" نور دین سامنے نڈی بیچ کر بیٹھ گیا۔

"ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ پریشان ہوں نور دین۔ بات یہ ہے۔" فریاد علی نے کھٹکار گلا صاف کیا۔

"بات یہ ہے کہ مسمو آ رہا ہے۔ میرا بیٹا مجھ سے ملنے آ رہا ہے۔ اس کا خط آیا ہے۔" فریاد

علی بار بار گلا صاف کر رہا تھا۔

"اس نے لکھا تھا کہ اس نے ہمیں خواب میں دیکھا تھا اور اب اس کا دل تپ رہا ہے۔

ہم سے ملنے کیلئے وہ میرا بیٹا ہے۔ نور دین۔ نہ جانے بستی میں کس کا خون ہو جائے۔ میرے سب

سے تعلقات ہیں۔ اگر میرے بیٹے نے کوئی ایسی ویسی حرکت کر دی تو میرے میں اسے روک سکتا

ہوں اور نہ بستی والوں کے دل صاف کر سکتا ہوں کس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

"وہ کب آ رہا ہے۔ فریاد علی۔" نور دین بیچ سے کھڑا ہو گیا۔

"اللہ جانے کسی وقت بھی آ سکتا ہے۔"



تری یادوں کے گاہ

”خدا کے خیر کرے۔“ نور دین نے کہا اور گڑے کر جلدی سے وہاں سے چلا گیا۔ اہل سرکیز کر بیٹھ گیا تھا۔ اب کیا کروں۔ کہہ کر جاؤں۔ بے کسی سے اس کی آنکھوں سے آنسو اہل چڑے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ زندگی قیود حق صحر۔ کاش..... کاش اس صحرائی ایک سی درخت ہوتا۔ ایک سایہ دار درخت۔ وہ اپنی عزت سنبھالنے سنبھالنے تھک گیا تھا۔ کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ چاروں طرف بے بسی کی ڈھوپ تھی۔ میرے معبود..... میرے معبود میں اپنے جد و جہد سے تھک گیا ہوں۔ اب میں مدافعت نہیں کر سکتا۔ میرے مالک مجھے تیری رحمت و سایہ دار کر ہے۔ میرے آقا۔ اس کے آنسو بچے جا رہے تھے اور بچے باقی زمین پر گر رہے تھے۔

☆.....☆.....☆

جیل کی دیواروں کے پیچھے اس نے سات سال گزارے تھے۔ پورے سات برس۔ ان سات برسوں میں ہر برس اس نے جیل توڑی تھی لیکن پکڑا گیا تھا۔ سختیاں ہوئی تھیں لیکن ہر بار اس کا عزم پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتا۔ ہر بار وہ اپنی خاصیاں پر غور کرتا اور سوچتا کہ آئندہ ان کا خیال رکھے گا۔

اور اس بار شاید قسمت نے اسے سوشل دے ہی دیا۔ اس کا پروگرام بھی بہت شاندار تھا۔ اس بار وہ جیلر کی جیب لٹکر فرار ہوا تھا۔ ہمیشہ پیدل ہونے کی وجہ سے پکڑا جاتا تھا۔ لیکن اس بار پولیس اسے پکڑ نہیں سکی تھی۔ ساری زندگی سلاخوں کے پیچھے گزارنے سے تو بھر ہے کہ آزادی کی خاطر جان قربان کر دے۔

فرار ہونے سے تھوڑی دیر قبل اس نے عشاء کی نماز پڑھی تھی اور گڑ گڑا کر دعا کی تھی۔ ”میرے آقا..... دنیا مجھے جو بھی سمجھے لیکن تو حقیقت جانتا ہے۔ میں نے جن لوگوں کو قتل کیا وہ اسی قاتل تھے۔ جنگ میں نے زندگی میں کوئی نیکی نہیں کی لیکن تو مجھے ایک موقع ضرور دے۔ میں ایک نیکی کرنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک نیکی تاکہ جب صحرائی تپتی ڈھوپ میں بے حال ہو جاؤں تو میری ایک ایک سایہ دار درخت بن جائے۔ میرے لئے یہ میرا حق ہے میرے معبود یہ میرا حق ہے۔“

اور یہ حق اسے عطا کر دیا گیا۔ پولیس اس کے پیچھے تھی۔ لیکن اب وہ اتنی زور نکل آیا تھا کہ پولیس آسانی سے اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی۔ تقریباً سو بیڑھ سو میل کا فاصلہ اس نے جیب کے

تری یادوں کے گاہ

ار بے طے کیا تھا۔ پولیس کی گاڑیاں اس سے زیادہ دوڑ نہیں تھیں۔ لیکن پھر بھی اس نے جیب ایک پھر اسے پر ڈال دی اور قیود طور پر پولیس کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن تھوڑی سی دور چلا تھا کہ جیب ایک جھٹکے سے رک گئی۔ پتھر ڈال ختم ہو گیا تھا۔ اس نے نیپ چھوڑ دی۔ لیکن اس کے نزدیک ڈسکنا مناسب نہیں تھا۔ پھر ابھی وہ زیادہ دور نہیں چلا تھا کہ اسے دم سے چراغ نظر آئے۔ کوئی پسماندہ ہستی تھی۔ وہ ہستی کی جانب چل پڑا۔

ایک بڑے سے برگد کے ساتھ اسے ایک جھونپڑا نظر آیا اور رات کا بقیہ حصہ اس نے اسی جھونپڑے میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ جھونپڑا تاریک تھا۔ ان معمولی دیواروں کو پار کرنا اس کے لئے مشکل کام نہیں تھا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔ اس کے بدن پر قیدیوں کا لباس تھا اور نہ وہ کھلے علاقے میں بھی قیام کر سکتا تھا اور پھر جھونپڑی کی دیوار کے نزدیک اس نے ڈیرہ ڈال دیا۔ بدن جھکن سے بھر ہوا تھا۔ جھکن ضرور تھی لیکن اس بات کا احساس اس کے پورے بدن میں مسرت بن کر دوڑ رہا تھا کہ وہ آزاد ہو گیا ہے۔ جیل کی نگاہ دیواروں سے اس کا بیچھا پھوٹ گیا ہے اور اب..... اب وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کر سکے گا۔

دھنٹا ایک آواز اس کے کانوں میں ابھری۔

”تجسم کے ابا“

”تم..... تم جاگ رہی ہو۔ سوئی کیوں نہیں۔ رات کا آخری پہر ہے۔“ مردان آواز بھرئی آواز تھی۔

”آپ دروہے ہیں تجسم کے ابا؟“ عورت کی آواز میں ڈکھ تھا۔

”سو جاؤ گلیلہ خدا کیلئے سو جاؤ۔“

”کیا بات ہے تجسم کے ابا تم مجھ سے کہہ دو۔ میں تمہارے ڈکھ درد کی شریک ہوں میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔ لیکن تمہارے ساتھ رہ تو سکتی ہوں۔“ عورت کی سسکیاں ابھریں اور ان میں مرد کی ہچکیاں بھی شامل ہو گئیں۔

”نہ پوچھو گلیلہ کچھ نہ پوچھو۔ خدا کیلئے کچھ نہ پوچھو۔ رخصت کی کہانی سناؤں گا تو تمہاری آنکھوں سے غون اہل پڑے گا۔ مجھے تباہ کر دے۔ تم میرا ڈکھ نہیں بانٹ سکتیں تجسم کی ماں کوئی میرا ڈکھ نہیں بانٹ سکتا۔“

”ایسا نہ کہہ تجسم کے ابا۔ جہیں میری قسم ایسا نہ کہو۔ میں ان پڑھ جاہل ہوں لیکن میں تمہاری

قری یادوں کے گلاب

قری یادوں کے گلاب

”تو بڑا سا ہو کر ہے۔ قرض وصول کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگا تا تیری سہیلی تیرا فرض ادا کرنے کیلئے مجھے بھٹکانا نہیں پڑا غریب ہے۔ آقا..... ہم سے آقا زوی مانگی تو نے دیدی۔ ہم نے جو وعدہ کیا ہے۔ وہ ہم بھی پورا کریں گے۔“ اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

”آجالا پھولنے میں ابھی دیر تھی۔ وہ پھر بیڑے سے باہر نکل آیا اور پھر بسنی کی کچھوں میں خاک چھانٹنے لگا۔ سب سے پہلا شخص جو اسے نظر آیا۔ وہ دودھ والا تھا۔ جو بیسنوں کا دودھ کاڑھ رہا تھا۔ اس نے اس کی گردن پکڑی اور کھڑا کر دیا۔ وہ کھٹکھٹانے لگا تھا۔

”مرومت کھاؤں گا نہیں تمہیں۔ چوہری کراست کا گھر کونسا ہے؟“ اس کی آواز بے حد خوشی کی تھی۔

”وہ..... وہ نکالال مکان“ دودھ والا جیسے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ہوں۔“ وہ فرمایا اور پھر اس کی نگاہ کی کرنے والے گنڈا سے پر پڑی اور اس نے مسکراتے ہوئے دودھ والے کی طرف دیکھا۔ دوسرے لمحے اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن پکڑ لی اور اسے دہانے لگا۔ باو نے اٹھ پاؤں مارے لیکن وہ اس کی مضبوط گرفت سے نہیں نکل سکا اور بے ہوش ہو گیا۔ اس نے احتیاط سے اسے وہیں لٹا دیا اور پھر تیز دھار والا گنڈا اسکا اٹھالیا۔

کراست علی جوانی کے خواب دیکھ رہا تھا لیکن اس کی نیند پوری ہو چکی تھی۔ اس لئے شیشہ ٹوٹنے کی بجلی سی آواز سن کر وہ جاگ گیا۔ لیکن ابھی کچھ سوچتے ہی نہ پایا تھا کہ ایک قوی سی ٹنگل توجہ اس کے سر پر پھینک گیا۔

”ٹوٹنے کی کوشش کی تو جج سے دو کروں گا۔“ خوشی کی گراہت کراست علی کے کانوں میں گونجی اور کراست علی کی آواز اٹھنے سے بچتا رہا۔

”کیا نام ہے۔ تیرا؟“ اس شخص نے فرماتے ہوئے کراست سے پوچھا۔

”کراست علی“ اس شخص نے پوچھا اور کراست علی نے زور سے گردن ہلا دی۔

”ہم پہلے ہی سمجھ گئے تھے سرے، اس مکان میں سب سے بڑھیا کرہ تیرا ہی ہے۔“ وہ ہنسنے ہوئے بولا۔

”مم..... مگر کون ہو۔ ڈاکو؟“ کراست علی کی ہنسی پھنسی آواز ابھری۔

”ہاں..... ڈاکو..... قاتل اور آج تیرا حساب بھی کرنا ہے۔ سرے ہمارا نام فوسو ہے۔

ٹیل تو ڈکرتے ہیں تیرے لئے۔ جاری بیسنوں پر ٹی گاہ والی تو نے کیوں؟“

پوری ہوں۔ تمہاری ڈکھور کی شریک۔ تم خود کو تمہا کیوں کہتے ہو۔“

”خدا کے واسطے نہ پوچھو ٹھیک۔ تم پریشان ہونے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتی۔“ مرد نے روتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک اب میں عزت کے بوجھ کو نہیں سنبھال سکتا۔ اب مجھے احساس ہوا ٹھیکہ کرنا۔ قدیم میں لوگ بیٹیوں کو زندہ کیوں وٹن کر دیتے تھے۔ بیٹیوں کے بوجھ سے شانے ٹوٹ جاتے ہیں۔ کاش ٹھیکہ تم مجھے ایک بیٹا بھی دے دیجئے۔ کاش ان بد نصیب لڑکیوں کو کوئی بھائی بھی نہ ہو۔ لوگ اتنی آسانی سے انہیں لوٹ کا مال نہ سمجھ لیتے۔ ٹھیکہ میں شہر میں ملت مزدوری کر کے زندگی کے بوجھ کو جس طرح کھیت رہا تھا۔ میرا دل ہی جانتا ہے لیکن میں ناخوش نہیں تھا۔ ٹھیکہ میرے دل میں ایک آرزو تھی کہ میری دونوں بیٹیاں عزت سے نکلا کئے لگ جائیں۔

لیکن شہر نے میری عزت کی طرف لگا دھاڑی۔

وہ بد معاش تھا۔ کئی بار کا سزا پاتا لیکن ٹھیکہ اپنی عزت کی حفاظت کیلئے ہرے ہاتھ بہت طاقتور تھے۔ میں اس کی گردن دبا سکتا تھا لیکن ہرے شانے ٹھیکے ہوئے تھے۔ میں مر بھی تو نہیں سکتا ٹھیکہ۔ اگر میں مر جاتا تو اس مسموم بوجھ کو کھانے کون لگاتا۔ میں نے اپنے آشیانے کو آگ لگا دی اور اس ہنسی میں آکر پتالی۔ آہ..... تم اس بوڑھے باپ کی دلی کیفیات کو کبھی سمجھ سکتی ہو ٹھیکہ جو صرف اپنی بیٹیوں کی عزت بچانے کیلئے لوگوں کو ایک ایسے فرض پیٹنے کی کہانیاں سناتا رہا جو نای گرامی قاتل اور بد معاش تھا۔ میرا دل اس جھوٹ پر سوسا آسودہ تھا۔ لیکن یہ جھوٹ میں اسی لئے بولا تھا کہ لوگ میری بیٹیوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

لیکن فوسو ٹھیکہ ہمارا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ ہمارا کوئی فوسو نہیں ہے کراست علی۔ چوہری کراست علی ہماری بیٹیوں کی طرف لپٹائی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ وہ بہت بڑا شیطان ہے وہ ان کہانوں سے مرعوب نہیں ہوا۔ ٹھیکہ۔ اور کہانیاں صرف کہانیاں ہوتی ہیں۔ اب بتاؤ کہاں جاؤں..... بتاؤ ٹھیکہ..... میری مدد کرو۔ مجھے بتاؤ۔ اس ہنسی کو چھوڑ کر کہاں جاؤں ٹھیکہ میرے پاؤں ڈکھنے لگے ہیں۔ میرے بدن میں اب کت نہیں ہے۔“ مر جھوٹ جھوٹ کر روئے لگا۔

اس نے یہ ساری داستان سنی اور اس کے ہاتھوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”وہ مالک“ اس نے آہان کی طرف دیکھا۔



شش..... ہمسو۔ فریاد علی کا بیٹا؟“ کراست علی نے ہلکے ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔ ٹھیک سمجھا تو نے۔ کیا کریں اب تیرا۔ بول گردن اتار دیں یا صرف ہاتھ پاؤں کاٹ دیں بول سرے۔“ اس نے آگے بڑھ کر کراست علی کے سینے پر گھٹنا رکھ دیا اور کراست علی کی آنکھوں میں موت ناچنے لگی۔

”ظلمی ہوئی ہمسو..... معاف کر دو۔ تمہیں خدا کا واسطہ معاف کر دو بس ایک بار معاف کر دو۔ شیطان نے بہکا دیا تھا۔ وہ..... وہ دونوں میری بہنیں ہیں۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ آج سے میں انہیں بہنیں سمجھوں گا۔ ہمسو بھیا خدا کیلئے مجھے معاف کر دو۔“

”مکاری کر رہا ہے۔ سرے ہم سے مکاری کر رہا ہے اور خدا کا نام بھی لے رہا ہے۔ مگر ہم کیسی گولیاں نہیں کھیتے۔ ارے ہم جڑی کیوں نہ ختم کر دیں برائیوں کی۔ نہ جڑ ہوگی نہ برائیاں بھونٹیں گئیں۔“

”ایک بار معاف کر دو..... ہمسو صرف ایک بار دوسری بار ظلمی ہوتے پھر میں تم سے معافی مانگوں گا۔“ کراست علی نے مذہب لہجے میں کہا۔ اس کی نگاہیں چمکد اور گنڈ اسے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ خوفناک لگا ہوں سے کراست علی کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”ایک شرط پر کراست علی۔ ایک شرط پر ہم تیری جان بخش سکتے ہیں۔“

”ہولو..... ہمسو بھیا ہولو۔“

”تو نے کہا ہے کہ اب وہ دونوں تیری بھی بہنیں ہیں۔ تجھے ایک مینیج کے اندر اندر اچھے لڑکوں سے ان کی شادی کرانی ہوگی۔ ساری ذمے داری تیری ہوگی۔ میرے باپ کو کوئی پریشانی نہیں ہونی چاہئے۔ سمجھا؟“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہو گا ہمسو۔ ایسا ہی ہو گا۔“

”یہ مت سمجھا کراست علی کہ میں دوبارہ پولیس کے ہاتھ آ جاؤں گا۔ تجھ سے دور بھی نہیں رہوں گا ورنہ غلامی کی تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑ دوں گا۔ کراست علی۔ زندگی میں پہلی بار کسی کی جان بخش رہا ہوں۔ ہمسو اس کے سینے پر سے اتر گیا۔

”میں دوبارہ غلامی نہیں کروں گا۔ مستحقہ حیرت معاف کی خوف کی گہری گہری سانس لے کر ہولا اور ہمسو اب اس مڑ گیا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح کراست علی فریاد علی کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ دروازہ

فریاد علی نے ہی کھولا تھا۔ کراست علی کو دیکھ کر اس کا چہرہ اتر گیا۔

”سلام فریاد علی چاچا۔“ کراست علی نے کہا۔

”سلام سرکار۔ صبح ہی صبح کیسے تکلیف کی مجھے بدالیا ہوتا۔“

”چاچا تمہارے دل میں میرے لئے کوئی رُخا ہے؟“ کراست علی نے پوچھا۔

”نہیں..... نہیں تو سرکار کسی نے کچھ کیا ہے۔“ فریاد علی لجاجت سے بولا۔

”میں بھی تمہارا بیٹا ہوں چاچا۔ مجھے سرکار مت کہو۔ تمہاری دونوں بیٹیاں میری بہنیں ہیں۔ میں ایک مینیج کے اندر اندر اچھے اچھے لڑکے دیکھ کر ان کی شادی کر دوں گا تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ کراست علی نے کہا اور فریاد علی کا منہ کھلا رہ گیا۔ اچانک اسے محسوس ہوا جیسے دھوپ سے چپے سحر میں پانی برس گیا اور بے شمار گولیاں سر اٹھا رہی ہوں۔

☆.....☆.....☆

آقا تھا۔ ہم نے یہ گھر بچلے ماہی الہی ریٹائرمنٹ کے بعد خریدا تھا۔ چلی منزل کرائے پر چڑھا کر  
خود اوپر شفٹ ہو گئے تھے لیکن پہلے ہی دن جب اس لڑکی کو کام کاج کرتے ہوئے دیکھا تو مجھے اس  
سے عشق ہو گیا۔

میرے پاس ایک دور بین تھی جو میں اپنے کمرے کی کھڑکی کی اندرونی جالی سے لگا کر اس  
لڑکی کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہتا۔

میں ان دنوں ایل ایل بی کے پیپر دے کر فارغ ہوا تھا۔ راوی فرصت ہی فرصت نکلتا تھا۔  
لہذا میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے کھڑکی کی جالی کے ساتھ دور بین لگا کر ہر وقت اس گھر میں  
تاڑ لگائے رکھتا۔ چینیوں کی مچھ سے چونکہ میں مسلسل دور بین سے ان کے گھر کا غقبہ مشاہدہ کرتا  
رہتا لہذا چند ہی دنوں میں مجھے اس گھر کے تمام افراد کی ایکٹوٹی کا علم ہونے لگا۔ علی السبیل ماگن  
خاتون اٹھ جاتی۔ گھر کے منظر باغیچے میں ننگے پاؤں سیر کرتی۔ ہلکی پھلکی ورزش۔ اس کے بعد ملک  
فلک بنا کر جیتی اور پھر دانش روم میں ٹھس جاتی۔ اس دوران ماگن کی ماں بچن میں جاتی اور ناشتہ کی  
تیاری کرتی۔ جب تک وہ ناشتہ تیار کر کے ٹرالی پر رکھتی اس کی بیٹی اپنے کمرے سے ایسی تیار حالت  
میں باہر نکلتی کہ نہاد و گھر کا سوت لیکن کر خوب بٹی سنوری ہوتی۔ ہلکا ہلکا میک اپ۔ کھانوں میں تازہ  
پھول، بال کٹنے، گہرے چاک دہلی چست کرتا انہیں۔ فراغ سید اور لاٹا شائے پر ڈھلکا روپ۔  
آگھیں خوب خوب کالی ہو رہی ہوتیں۔ اتنی دیر میں آٹھ ساڑھے آٹھ بجے ہوتے اس کا خاوند  
جو ایک وجہ مرد تھا کسی بینک میں ملازم تھا۔ تیار ہو کر ناشتہ کرنے پہنچ جاتا۔ اوجیز عمر خاتون ناشتہ  
ان کے کمرے میں چھوڑ کر خود چلی جاتی۔ تو دونوں جوان اور خوبصورت میاں بیوی ناشتہ کرتے  
اور ساتھ میں ہلکی پھلکی شرارتیں بھی جاری رکھتیں۔ اور یہ سارا منظر میں اپنی دور بین کی آنکھ سے  
کمرے کی کھڑکی کی اندرونی جالی کے پیچھے سے خاموشی سے دیکھتا رہتا۔ گو میرے پاس ٹیلی ویژن کی  
سہولت بھی موجود تھی لیکن ہر وقت ٹیلی ویژن میں کھڑا ہونا مسیوب تھا۔

لیکن بات یہاں تو ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ ناشتہ کے لڑکی کا خاوند گاڑی نکالتا اور بینک اپنی  
ایوبلی پر چلا جاتا۔ گاڑی کے گیٹ سے نکلے تک اس کی بیوی اس کے ساتھ مسکراتے مسکراتے ہاتھیں  
کرتی رہتی۔ مجال ہے جو کبھی ایک دن بھی ان کی جھڑپ ہوتی ہو۔ مہاش بیوی کا ایک دوسرے کو  
ہائے کہنے کا آخری منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

خاوند کے جانے کے بعد ایک دفعہ پھر ٹرالی پر ناشتہ سہایا جاتا اور اب کہ وہ ماگن لڑکی خود اس

## وہ آرزوؤں کے خواب بنتا

لڑکی تھی..... جس کا چہرہ بھرا ہوا تھا۔

عمر بھی کوئی اٹھارہ بیس..... یہ سوئی سوئی غضب کی آنکھیں..... لائی لائی ہلکیں..... والٹس  
جیسے سادہ کی کالی گھٹائیں۔ بھرا بھرا گول منہ اور چہرہ..... دس بھرے ہونٹ..... معصوبیت جیسے آنہ  
بڑی ہون۔ نہ دہلی نہ سوئی۔ قد قدرے لٹکا ہوا۔ رنگت سرخ و سپید۔ کپڑے بھی چست و نئی۔ بیٹتی  
لیکن وہ آترن ہوتے..... کیونکہ وہ ہمارے سامنے والے گھر کی ملازمہ تھی۔ نکل وقتی ملازمہ۔  
رہتی بھی وہیں تھی اور ماگن اس کی ہم عمر لڑکی تھی جو ٹھہری غضب کی فیشن پہن کر، ہر وقت بیٹی جی  
سنوری..... خوب صورت ماگن بھی تھی لیکن بہر حال وہ چیز نہ تھی۔ ہمارے اور اس گھر کے درمیان  
میں فٹ کی جگہ تھی۔ ان کا مکان اس جگہ کا سب سے بڑا اور خوبصورت تھا۔ مکان کیا تھا چھوٹا سا  
بلکہ ہی تھا۔ چچا اس فٹ کا فرسٹ۔ کالا لوہے کا گیٹ۔ گیٹ کے دائیں بائیں سردے کے دو چوڑے۔  
چھوٹی سی روش، برآمدے تک جاتی دائیں طرف چھوٹا سا خوبصورت لان جس میں گھاس، سٹکے  
اور ایک دو درخت تھے۔ پائدر کے سامنے تھے دو کرسیاں اور ٹونے کی میز ہر وقت رہتی۔ گھر کشادہ  
اور رازی کی شکل میں دو منزلہ تھا۔ بچے برآمدہ اوپر ٹیلی ویژن..... اتفاق سے میرے کمرے سے تقریباً  
سبھی کمروں پر نظر پڑ سکتی تھی۔ چھوٹی سی مہراں گاڑی تھی جس کی ان لوگوں کے پاس۔ گھر کے گل باغی  
افراد تھے۔ ماگن اور اس کی ماں۔ چالیس بیڑا بیس سالہ سوئی سائوٹی عورت چہرے پر کرتنگی بھری  
لیپا چوچی..... ماگن کا خاوند جو کسی بینک میں ملازم تھا اور ایک ماگن کا دو چوڑے خوبصورت ساتھی  
چوبیس سالہ جوان شیور چوڑے..... رات بھر لیوی دیکھتا ہوا صبح سو جاتا۔ دن چڑھے اٹھتا اور دوبارہ  
دو چہرے کی کالچ کی دوسری شفٹ میں چڑھنے چلا جاتا۔

میرا کمرہ دوسری منزل پر ٹیلی ویژن والا تھا لہذا اس کمرے سے اس گھر کا سارا منظر صاف نظر



تری یادوں کے گلاب

فرانی کو جھٹکتی ہوئی اپنے دہرے کے کمرے کے دروازے کے پاس لے جاتی اور پلکے پلکے دروازہ کھٹکتی۔ دوسری یا تیسری بار دستک کے بعد دروازہ کھٹکا اور فرانی کمرے میں لے جاتی۔ جتنی دیر میں اس کا دیور دوش دوش سے منہ ہاتھ دھو کر نکلتا اتنی دیر میں ادھر ادھر کا ٹھہرا ہوا سامان اٹھا کر سلیقے سے اپنی اپنی جگہ پر رکھتی رہتی۔ پھر دیور ناشہ کرتا اور وہ اس کے پاس بھیجی جس جس کو باتیں کرتی۔ ادھر جب وہ لڑکی اپنے دیور کو ناشہ کر رہی ہوتی اس کی ادھیڑ عمر والدہ اس کو خوبصورت نوکرانی کے کمرے کی باہر سے جھنکی لگا دیتی۔

ثابت یہ ہوا کہ اس نوکرانی کے گیارہ بچے سے پہلے جاگ کر کمرے سے باہر آنے پر پابندی تھی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ نوکرانی کا نام ارم اور ماگن کا بیٹا تھا۔ بارہ بچے کے بعد بیوہ کا دیور بھی کالج چلا جاتا تو دونوں ماں بیٹی کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرتیں یا بازار چلی جاتیں لیکن جانے سے پہلے نوکرانی ارم کو دھیر سا راکام بتاتا نہ جھٹکتیں۔

☆.....☆.....☆

اس کے بعد ان کی واپسی تین بچے کے قریب ہوتی۔ جب تک نوکرانی سارا کمرہ صاف کرتی رہتی۔ کپڑے اور دیگر اکثر کام کر چکی ہوتی اور ہاڑی پکا چکی ہوتی۔ یوں جھکی ہوئی ماں بیٹی کھانا کھا کر سو جاتیں اور پری چرو نوکرانی دوبارہ کام میں جت جاتی۔

شام پانچ بجے کے بعد نادیہ کا خاندان مہران گاڑی میں واپس آتا اس وقت نادیہ قیلولہ کی غرض سے سو کر اٹھنے کے بعد سوٹ بدل کر نیا میک اپ کر چکی ہوتی۔ یوں جھکے ہارے گھراٹے والے خاندان کو فریش اور کھلی کھلی مسکراتے ہوئے ملتی اور خاندان کے گاڑی سے نکلنے ہی اس کی بانجھوں میں جھول جاتی جس سے اس کی ساری تنگیں دور ہو جاتی۔

☆.....☆.....☆

میں ایک نہایت شریف لڑکا ہوں لیکن باوجود کوشش کے وہ نوکرانی میرے داماد سے نہ نکل سکی تھی۔ میں ہر روز چھپ چھپ کر اس کا نظارہ کرتا اس کے چہرے پر ہلاکی مصیبت تھی۔ وہ دن بدن میرے دل و داماد پر چھائی چلی گئی لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں کس کو ہم راز بتاؤں۔ کس سے پوچھوں کہ مجھے بتاؤ تو کسی یہ اگر نوکرانی ہے تو رات دن اسی گھر میں کیوں رہتی ہے۔ کبھی کبھار اس کے کمرے کے باہر سے لاک کیوں کر دیا جاتا ہے۔ پھر اس کا لباس نوکرانیوں والا نہ تھا۔ اکثر اس نے ہلکا ہلکا میک اپ بھی کیا ہوتا۔ کئی بار میں نے اسے سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا

تری یادوں کے گلاب

کھاتے یا کھل کر کھپ لگاتے بھی دیکھا لیکن کام سارا وہی کرتی۔ دوسری لڑکی تو جو مجھے گھر کی ماگن ہی نظر آتی کبھی میں نے اس کو کام کرتے نہیں دیکھا۔ جب بھی دیکھا بڑے ہی غرے میں ہوتی۔ چلتی بھی ایک خاص انداز اور شوخی سے تھی۔

☆.....☆.....☆

بیان دنوں کی بات ہے جب میں فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی۔

میری ایک نئی نئی سیکلی تھی جس کا نام نادیہ تھا۔ بھائی جان جو بینک میں ملازم تھے مجھے روزانہ گاڑی پر کالج چھوڑنے جاتے۔ نادیہ کا تعلق بہت ہی غریب تھلی سے تھا۔ وہ لوگ کرائے کے چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ اس کے والد کسی پرائیویٹ دفتر میں ملازم تھے۔ وہ اپنے والدین کی انکوٹی اولاد تھی۔ اس کے شوخی کی خاطر وہ اسے بڑی مشکل سے کالج میں پڑھا رہے تھے۔ نادیہ کو مجھ جیسی سرخ و سپید تو نہ تھی لیکن اچھی خاصی خوب صورت تھی۔ اس کے چہرے پر سب سے زیادہ توجہ میز دل کر لینے والی اس کی بڑی بڑی آنکھیں اور ان پے لانی لانی چٹکیاں تھیں۔ جنہیں وہ دورانہ گفتگو بار بار جھپکاتی اور پتلیاں دائیں بائیں گھماتی۔ کسی بات پر حیران ہوتی تو چشم فراس اس کو مزید پھیلا لیتی جس سے اس کی نکلتی میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ اس کے چہرے میں مزید کشش کا باعث اس کی بات ہے بات اسی تھی۔ ذرا دماغی بات پر کھٹکھا کر ہنسا شروع کر دیتی اور پھر ہنسنے ہی چلی جاتی۔ جس سے اس کے مونچوں ایسے دانت دیکھنے والوں کا دل موہ لیتے۔ لیکن بہر حال وہ بہت زیادہ گوری نہ تھی بلکہ آپ اسے گندی رنگت کہہ سکتے ہیں۔ ہاں البتہ میں بہت زیادہ خوبصورت تھی۔

میرے ابو رچا نڈو سرکاری افسر تھے۔ اچھی خاصی پشٹن اور اتارا گھر محلے میں سب سے خوبصورت تھا۔ نادیہ روزانہ میرے ساتھ کالج جاتی اور واپسی پر بھی ہم اسے اس کے گھر تک ڈراپ کر دیتے ہم دونوں میں گہری دوستی ہو گئی تھی وہ اکثر ہمارے گھر آتی لیکن میں بہت کم اس کے گھر جاتی کیونکہ وہ جس محلے میں رہتی تھی وہاں کا ماحول کچھ زیادہ اچھا نہ تھا۔

پھر یوں ہوا کہ نادیہ کے والد فوت ہو گئے۔ نادیہ کی تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی۔ والد کی وفات کے بعد ان کے مالی حالات اتنے خراب ہو گئے کہ وہ گھر کا کرایہ ہی نہ دے سکتے۔ دو تین مہینے تو مالک مکان اس کے والد کی وفات کی وجہ سے مرمت میں رہا مگر پھر تھکا کر کے لگا لیکن جب ان کا کرایہ پانچ ماہ کا ہو گیا تو اس نے انہیں نکال دیا وہ اس کی والدہ ہمارے گھر آ گئے۔ اس کی والدہ

تری یادوں کے گلاب

میری امی سے کہنے لگیں کہ ہمیں یہاں ایک چھوٹا سا کمرہ دے دو ہم دونوں ماں بیٹی تمہارے گھر کا کام کاج کرو یا کریں گے۔ میری امی نے ابو سے مشورہ کیا مجھ سے پوچھا تو میں نے بھی یہی کہا کہ یہ بے سہارا ہیں۔ ناویہ میری گہری دوست ہے۔ اسی بہانے وہ یہاں تو رہیں گے چند ان دونوں ماں بیٹی کو چھت پر ایک خالی کمرہ دے دیا گیا۔ آتے ہی انہوں نے چند ہی دنوں میں گھر کی صفائی سنبھرائی کا ایسا نظام سنبھالا کہ سب خوش ہو گئے۔ کپڑے دھونا استری کرنا، دھن کرے چھلکے گئے۔ مکیں، دالیں روغن لٹس کرنے لگے حتیٰ کہ سنور بھی صاف سھرا ہو گیا۔ ناشتے، منج اور رات کا کھانا ہر وقت بروقت اور انتہائی سلیقے سے تیار کرتیں۔ گھر کے بھی افراد ان سے خوش تھے جس تو بہت زیادہ خوش تھی۔ ناویہ اور میں فارغ وقت میں کئی گھر کر لیں لگا لیں۔ کالج کچھ دن تو وہ میرے ساتھ جاتی رہی پھر اس کی امی نے کہا۔ بیٹی تم ابیروں کو۔ اس کمرہ دہن نے انکھ و زحمت کی میں گھروں کے کام بنی کرنے ہیں کالج پڑھا کر اس کی عادتیں خراب نہ کرو۔ وہاں تو ابیروں کو کیا جاتی ہیں۔ اس کو گھر رہنے دو۔ یہ میرے ساتھ ہی کام کرے گی۔ یوں ناویہ کالج چاتا ہوا گیا جس سے میں بہت اداس ہو گئی۔ مجھے اس سے اس قدر محبت تھی کہ کالج سے آتے ہی میں ناویہ پکار پکار کر بلا لیتی اور اس سے کپ شپ شروع کر دیتی۔ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ بھی چلنے رہتے۔ میرا ایک اٹھا کر الماری میں سلپتے سے رکھتی میرے شوز اور سوزے پانی جگہ پر صاف کر کے رکھ دیتی۔ میرے تھیل کرنے کے لیے کپڑے لے آتی۔ پوچھا م سنبھالنا۔ میرے آنے سے قبل ہی میرے لیے ملک فیک بنا کر فریج میں رکھ چھوڑتی جو گھر آتے ہی مجھے چلاتی۔ کھانا لگاتی۔ برتن اٹھاتی۔ میرے کپڑے پر نہیں کرتی۔ غرضیکہ وہ نہ صرف میری دوست تھی بلکہ میرے کام بھی دروازہ دھڑکتی۔ ناویہ کی وجہ سے مجھے بہت زیادہ سہولت ہو گئی تھی اس کی اماں یکے تو گھر گھر کے کام کرتی۔ جس میں ناویہ بھی ان کا ہاتھ بٹاتی لیکن جس وقت میں گھر پہ ہوتی تو ناویہ صرف میرے ہی کمرے میں منڈلاتی رہتی۔ اس کی موجودگی سے مجھے خاص فرحت اور سرور حاصل ہوتا۔ حالانکہ میں نے اسے کبھی ملازم نہیں سمجھا لیکن خود کو وہ ملازم ہی سمجھتی بلکہ میرے سمجھانے پر بھی باز نہ آتی میں نے کسی پارٹی یا شادی کی تقریب میں جانا ہوتا تو بے ہی چاؤ اور چاؤ سے مجھے تیاری میں مدد دیتی الغرض مجھے آہستہ آہستہ اس نے سست اور کامل بنا دیا۔ میں اپنے چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے بھی ناویہ کی طرف رجحان رکھتی یا اس کا انتظار کرتی۔ بلکہ یوں سمجھیں کہ مجھے ناویہ کا شوق ہو گیا۔ میں اس کی نشی ہو گئی۔

تری یادوں کے گلاب

شروع شروع میں امی نے شک کا اظہار بھی کیا کہ کہیں یہ ماں بیٹی چور نہ ہوں اس کی تصدیق کے لیے کئی بار امی نے اور دو ایک بار میں نے بھی جان بوجھ کر کچھ ٹوٹ بستر پر یا فرش پر بیٹک دیکھے یا کچھ کھانے کے برتنوں میں رہنے دیکھے۔ دو تین بار ناگھو، چھلا پابندہ گرا دیا لیکن دونوں ماں بیٹی اتنی شریف اور نیک نفس کہ چوری ایسا عمارتی سے اٹھا کر سنبھال دینے اور واپس کر دینے بلکہ آئندہ احتیاط کی تلقین بھی کرتیں۔ ناویہ کی امی نے تو ایک بار ہاتھ بھی جوڑ دینے کہنے لگیں بیٹی ہم غریب لوگ ہیں اور بے سہارا بھی۔ غریب پر چوری کا الزام لگنے میں دیر کتنی لگتی ہے احتیاط کیا کریں۔ اس دن کچھ بچیں تو مجھے بڑا پیار آیا یاں بیٹی پر۔ ناویہ تو مجھے جان سے پیاری تھی لیکن اس کی حد سے زیادہ خدمت کی وجہ سے مجھے کام کرنے کی عادت نہ رہی۔ اب تو میں اتنی سست ہو گئی کہ کالج سے واپس آتے ہی وہ پ سے بیڑ پر اونٹنی لیٹ جاتی اور ناویہ بے چاری ہی میرے شوز اتارتی۔ شروع شروع میں مجھے اس کی اس عادت سے جھجک ہی محسوس ہوتی۔ لیکن بعد میں عادی ہو گئی۔ یوں میں ناویہ کی وجہ سے خاصی بہل پسند بن کر رہ گئی۔

گھر میں یوں تو ہر طرح کا سکون تھا لیکن ایلا اور بھائیوں میں کبھی کبھی تلخ کھائی ہو جاتی۔ اس کی وجہ ریچرمنٹ کے بعد ابو کا کوئی کام نہ کرنا تھا۔ ابو کا موقف تھا کہ بچیں ہمال سرورس کے بعد اب میں تنہا گیا ہوں پھر جوان اولاد کو اس لیے ہے۔ جبکہ بھائیوں کا کہنا تھا کہ لوگ تمہیں نہیں مال تک سرورس کرتے ہیں آپ کو اتنی جلدی پیش لینے کی کیا ضرورت تھی ابھی ایک بھائی اور بہن پڑھ رہے ہیں۔ خیر کوئی احتیاج نہ تھا تاہم ابو بیٹوں کے منہ کو آ جانے سے چپ چاپ رہنے لگے۔

ہماری ایک بچھو کینیڈا میں رہتی تھیں۔ اچانک خبر ملی کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ امی ابو اور ہونا بھائی ارسلان کینیڈا چلے گئے۔ ارسلان پہلے ہی ایک بار چکا تھا۔

چند دنوں کے بعد ارسلان کا آدمی رات کو فون آیا۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ابو اور امی شادی ختم کے ایک بیڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے ہیں۔ یہ روع فرسا خبر تھی کہ امی اور میں اور بھائی جان ناصر بڑی دیر تک لپٹ کر دوتے چلتے رہے۔ ہم کتنے پر قسمت ثابت ہوئے کہ اب باپ کا آخری دیدار بھی نہ کر سکے۔ ہمارا تو گھر ہی ویران ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

امی ابو کے انتقال کے تقریباً دو ماہ بعد تک ہمارے گھر میں افسردگی اور اداسیوں کے



تری یادوں کے گلاب

ذمیرے رہے۔ والدین کے بغیر پورا گھر بھائی بھائی کرتا محسوس ہوتا۔ وقت گھر میں بھلا دیتا ہے ہماری بھی زندگی آہستہ آہستہ وگڑ کر آتی چلی گئی ارسلان بھائی سے روزانہ ہی فون پر بات ہوتی۔ ایک دن فون پر انہوں نے بتایا کہ وہ چند دنوں بعد واپس آ رہے ہیں۔ اس مقام مرحے میں نادیہ، اس کی امی میری دلجوئی کرتی رہیں۔ ان کی خدمت میں کوئی کمی نہ آئی بلکہ گھر کا سارا انتظام انہوں نے ہی سنبھالا ہوا تھا۔

لیکن ایک دن ایک ایسا واقعہ وقوع پذیر ہوا جس سے میں لرزہ برامقام ہو گئی اور میری زندگی کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ ہوا میں کہ ایک دن ہمارے کالج نے شمالی علاقہ جات کے نو راکہ تین روزہ پروگرام ترتیب دیا۔ میں نے گھر بھر بھائی کو بتایا تو انہوں نے بخوشی جانے کی اجازت دے دی۔ نادیہ نے میری ساری تیاری مکمل کروائی اور میں کالج کی لڑکیوں اور بچہ لڑکے ساتھ میرے پاسے کو چلی گئی۔

لیکن جب تین دن کے بعد گھر واپس آئی تو پہلا منظر جو دیکھا وہ یہ کہ بھائی جان ناصر اور نادیہ ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں اور خوش گیسوں میں مصروف ہیں۔ خاص بات یہ کہ نادیہ انتہائی خوب صورت لباس میں تھی۔ فیلنگ اس قدر رات سے لہدی پھندتی ہاتھوں ہیروں پر جھندی میری کھوپڑی ہلکے سے اڑ گئی۔ میں کوئی بھی توجہ نہیں دینی نظر میں ہی بھانپ گئی اور معاملے کی تہہ تک جا پہنچی۔ مجھے چپ سی لگ گئی۔ میری شوخی بل بھر میں اڑ چھو ہو گئی۔ میں خالی خالی نظروں سے کبھی بھائی اور کبھی نادیہ کو سمجھنے لگی۔ نادیہ مجھے دیکھتے ہی گرم جوشی سے اٹھ کر میرے پاس آئی۔ بھائی ناصر بھی کمرے ہو گئے۔ لیکن میرے قدم جم چکے تھے اور جسم لرز اٹھ تھا۔

”آؤ ادم“ بھائی اور نادیہ نے مجھے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا اور ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

”اصل میں ادم..... وہ یہ دراصل سب کچھ گھٹ میں ہوا۔“ ناصر بھائی بولنا لگے تھے پھر وہ کافی دیر مجھے اعتماد میں لینے کی کوشش کرتے رہے۔ وضاحتیں پیش کرتے رہے۔ نادیہ بھی باتیں کر رہی تھی۔ مگر مجھے کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ مجھے ان کی آواز میں دور کسی کونئیں سے آئی سرگوشیاں محسوس ہو رہی تھیں۔ کچھ سمجھ نہ آئی کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ بس نقطہ اتنا ہی پتہ چلا کہ ان دونوں نے شادی کر لی ہے۔ اور یہ تو مجھے گھر میں داخل ہوتے ہی پتہ چل چکا تھا۔

رات بھر میرا دل غم کا دل بھائی جان کمرے میں آ کر کافی دیر تک بیٹھ رہا۔ مجھے

تری یادوں کے گلاب

تملی بخشی دیتے رہے۔ لیکن میں تکیہ میں نہ چھپا کر زار و قطار روئی رہی۔ دکھ اس بات کا تھا مجھے ان لوگوں نے کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ بلکہ مجھے شہر سے کسی خوشی پا کر بھیجا۔ اور چہروں کی طرح شادی کر لی اور نادیہ کو تو دیکھو ڈانٹ نے کس طرح خالی گھر دیکھ کر قلب لگا لی۔ پتہ نہیں کس وقت بھائی جان چلے گئے رات بھر میں بلک بلک کر روئی رہی۔ امی ابو کے چاتے ہی کیسے بھائی نے مجھے فراموش کر دیا تھا۔

جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ صبح تقریباً گیارہ بجے میری آنکھ کھلی۔ نادیہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اسے اپنے پاس دیکھ کر میں جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور غصے سے بولی۔

”انگل چاہیے کمرے سے.....“ اور اٹھ سے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو نادیہ نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر دروازے کی طرف جہاں نادیہ کی ماں اور ناصر بھائی کھڑے تھے جن کے چہرے سے بددی کے تاثر اُچھرے دو تیزی سے میری طرف بڑھے۔

”کیا بیچو فون میںی باتیں کر رہی ہو ادم۔“ جہادی بھائی کتے پیار سے جھمبیں بجانے آئی ہے۔“

بھائی کی بات سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی اور میرے دل کی بات میری زبان پر آ گئی۔

”میں نوکرانی کو بھائی نہیں کہہ سکتی بھائی جان۔ بہتر یہ ہے کہ مجھے اکیلا چھوڑ دیا جائے۔“

آپ بھی چلے جائیں یہاں سے۔“ آپ کسی کے ضمیر نے کا کوئی جواز نہ دیا تھا لہذا سب ہی مجھے

عجیب سی نظروں سے سمجھتے ہوئے کشاکش کشاکش کمرے سے نکل گئے۔

شاید یہی میری غلطی تھی۔

اس کے بعد سارا دن کوئی میرے کمرے میں نہ آیا۔ میں بھی چپ چاپ لیٹی رہی اسی عالم میں شام ہوئی اور پھر رات ہو گئی۔ لیٹ لیٹ کر..... سو کر..... اور دروازہ کھٹکھٹا کر..... یوں لگا جیسے بخار ہو گیا ہو۔ بھوک جو پہلے آڑی ہوئی تھی اب چکنے لگی۔ اٹھ کر ادھر ادھر دیکھا۔ پانی کا جگ نظر آ یا۔ جانے کب کا پڑا ہوا تھا۔ گلاس اٹھا کر انچھڑ پانی میں گئی۔ گلاس سنگ میں دھک کر پانی پیا تو بھوک دہچھو ہو گئی۔ ادھر ادھر دیکھا کچھ کھانے کو نظر نہ آیا..... آٹا بھی کیسے میں تو تین دنوں بعد یہاں آئی تھی اور آتے ہی لڑائی شروع ہو گئی تھی۔

تری یادوں کے گلاب

کمرے کی لائٹ اس وقت بند تھی۔ گھڑی دیکھی تو بجے کا وقت تھا۔ اوپر گیلری کی لائٹ جل رہی تھی۔ جہاں تادیہ، بھائی جان اور تادیہ کی ماں بیٹھ کر چائے پیتے۔ رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ میرے کمرے میں چونکہ اندھیرا اور وہیں روشنی تھی لہذا سارا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کھانا غائب ہوئی سے لاپا گیا تھا۔ بھائی جان پیچھے تھے۔ تادیہ کی ماں، سیکڑ بھی چپ تھی۔ جبکہ تادیہ نے انداز سے شوٹی اور خوشی اُکڑ رہی تھی۔ چوڑوں اور پردات کی کھٹک میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ تادیہ نے شاکنگ پلنگ کمر پر ستاروں کے خوب صورت کام والا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ مگر بے میک اپ میں یہ تو ”وہ“ تادیہ کی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں کچھ دیر دیکھتی رہی پھر اپنے پیڑ پر جا کر لیٹ گئی اور ہولے ہولے سوسکتے گئی۔ سوسکتے روئے پھر میری آنکھ لگ گئی۔ دوبارہ آنکھ کھلی۔ گھڑی دیکھی تو رات کے دو بجے تھے سارا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سوائے اوپری منزل کے سائے والے کمرے میں ذہر کا جہاں بلب۔ بھائی جان نے شادی کے بعد بھی قیام اسی کمرے میں رکھا۔ یہی کمرہ پہلے بھی انہی کا تھا۔

بھوک زوروں پر ہو گئی..... پیٹ میں چوہے قوالی کر رہے تھے۔ مرنے کی کیا نہ کرتی کے صدق اٹھی اور بکن کی طرف جانے لگی۔ بکن کے پاس جا کر ڈکی تو حیرت اور غصے سے ٹھٹھا کر رہی تھی۔ بکن کو باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ پاؤں جھٹکتے ہوئے کمرے میں آ گئی۔ فیسے سے برا حال ہونے لگا۔ ضرور یہ ان کیسے ماں بیٹی کی کارستانی ہے۔ میرا گھر اور مجھے ہی بھوکوں مارنا چاہتی ہیں۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو میں چہل قدمی کرنے دوسرے کمرے میں جا بیٹھے۔ میں جا چکی لیکن خالی پیٹ اور دودھ دن کی بھوک میں کیا خاک چہل قدمی کا حوالہ لینا تھا۔ اسی وقت صبح کے چہ بجے تھے۔

اچانک ہی بھائی جان کے کمرے کا دروازہ کھلا میری نظریں اوپر کو اٹھیں مجھے تادیہ کی نظر آئی۔ ہم ایک دوسرے کو چند لمبے بچے رہیں پھر فوراً ہی تادیہ مسکرا کر گیلری سے اتر کر پیچھے آ گئی لیکن میں لاشعلی ہی بن گئی۔ وہ میرے پاس آ گئی اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”ارم بائی اچھی تک مجھے سے ناراض ہیں؟“

میں نے بڑی نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹکا لیکن خاموش رہی۔

”تمہیں اب قصہ تمھوکا دیں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ میں تنگ کر بولی۔

”قصہ تمھوکا دوں تو بات ختم ہو جائے گی تم بھائی جان کی بیوی نہیں رہو گی ہوں..... بتاؤ

تری یادوں کے گلاب

مجھے..... یا پھر یہ کہنا چاہتی ہو کہ حالات سے سمجھوتہ کر لوں۔ شکست تسلیم کر لوں۔“ میں پھٹ پڑی۔ میری اونچی آواز سن کر بھائی جان کمرے سے نکل کر پیچھے آ گئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر زبردستی میرے کمرے میں لے آئے۔ تادیہ بھی ساتھ آ گئی لیکن تادیہ کو انہوں نے یہ کہہ کر باور پائی خانے کی طرف بھیج دیا کہ فوراً ناشتہ تیار کر کے لاؤ تو وہ عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے چلی گئی۔

”دیکھو ارم میں تمہارا بڑا بھائی ہوں..... اور باپ کی جگہ پر بھی ہوں۔ میں نے آنکھ لٹی کر لی ہے تو تم ہی دو گزر کر دو معاف کر دو مجھے۔“ یہ کہتے ہوئے بھائی جان نے ہاتھ جوڑ دیئے تو پہنچ گئی اور پھر زار و وقار دھرتے ہوئے بھائی کے شانے پر سر ٹکا دیا۔ بھائی جان میرے ہالوں میں اٹھیاں بھرنے لگے اور پھر مجھے سمجھنے کراپنے کمرے میں اوپر لے گئے جہاں ہم نے ناشتا کھنے کیا۔

☆.....☆.....☆

ناشتہ کرنے کے بعد بھائی جان آفس چلے گئے۔ تادیہ نے T.V لگایا اور ادھر موجود ہو گئی اور اس کی ماں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں تھوڑی دیر وصیت بن کر بیٹھی رہی۔ تادیہ کی طرف دیکھا لیکن وہ جیسے میری موجودگی سے آگاہ ہی نہیں تھی۔ اس وقت میں نے اپنی سخت تھکی محسوس کی اور آہستگی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چھپے آ گئی۔ میرا دل بھرا آیا اور میں پھٹ پھٹ کر رونے لگی۔ روروں کو آخر کار خود ہی چپ کر گئی۔ کیوں کہ کوئی چپ کروانے والا ہی نہ تھا اور پھر دن بوجھ روز گزرنے لگے۔ صبح میں تیار ہو کر کانا چلی جاتی۔ وہاں ہی پر بکن میں جا کر کھانا کھاتی اور سو جاتی۔ پھر میں رات گئے تک اپنے کمرے میں ہی رہتی کوئی بات کرنے والا نہ تھا۔ رات کے کھانے میں بھائی جان کبھی کبھار آواز دے کر بلا لیتے اور کبھی نہیں۔ تادیہ تو وہ تادیہ ہی نہ رہی تھی۔ وہ جو کبھی ہر وقت میری تعریفیں اور خد میں کرتے نہ جھکتی تھی اب کبھی میری طرف پلٹ کر کبھی نہ دیکھتی۔ ایسا رنگ تو کبھی کرگرت نے بھی نہ بدلا ہو گا اتنی جلدی تو ساپ کینچلی نہیں بدلتے..... یوں لگتا تھا کہ وہ اور اس کی ماں اس گھر میں یہی گزار گئے تھے۔ وجود حاصل کر چکے تھے۔ تاہم ان دونوں نے کبھی مجھے چھیڑنے یا شک کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ بس بھائی جان کے گھر ہوتے ہوئے اکاؤنڈا بات کرنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتیں۔ البتہ جب دو گھر نہ ہوتے تب دونوں میری طرف سے بالکل بچائی ہو جاتیں۔ میں سارا وقت اپنے کمرے میں ٹھہری رہتی۔ اس صورت حال نے مجھے اتنی طور پر پریشان کر دیا۔ میں اپنے ہی گھر میں اتنی ہی بن کر رہ گئی۔ مگر مجھے سائیں سائیں کرتا دکھائی دینے لگا۔ میری ذہنی کیفیت کا وہی لوگ اندازہ لگا سکتے ہیں جو کبھی ایسی صورت حال سے دوچار



ان حالات نے مجھے حدود پر چڑھا دیا۔ جو بھی میرے کمرے میں آتا میں چیختی گیتی۔ کئی دفعہ بھائی جان میرے کمرے میں آتے لیکن میں نے اب ان سے بھی بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ نادیا تو بھائی جان کے ساتھ آ جاتی لیکن جب وہ کام پر گئے ہوتے تو پلٹ کر نہ دیکھتی اور نہ پوچھتی نہ کبھی اس نے مجھے کھانے کا پوچھا نہ کسی اور ضرورت کا۔ تاہم وہ خود دن بدن فیشن اسٹل ہوتی جلی گئی۔ اس طرح ایک مہینہ گزر گیا اب تو بھائی جان نے بھی ٹلک آ کر میری خبر لیتا چھوڑ دی تھی۔ صبح میں کالج چلی جاتی اور اس کے بعد انکی صبح تک اکیلی ہی رہتی..... لیکن اب تعلیم سے بھی میرا ہی آچاٹ ہو گیا تھا۔ میری تو زندگی ہی خزاں رسیدہ پتے کی طرح ہو چکی تھی۔ اب تو کسی بھی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ پھر ایک دن ایک ایسی بات ہوئی کہ میری زندگی میں جیسے بھوپال آ گیا۔ جس صبح سویرے کالج جانے کے لیے تیار ہوئی کہ بھائی اور نادیا (بھالی) میرے کمرے میں آ گئے۔ دونوں کو اچانک اپنے کمرے میں پا کر میں حیران ہوئی۔

تھوڑی سی روکٹلائی پھر سنہیل گئی۔ لیکن میری کچھ میں نہ آ رہا تھا کہ ان سے کس انداز سے میں بات کروں۔ ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ نادیا نے بڑھ کر میری کتابیں میرے ہاتھ سے لے لیں اور بولی۔

”آج چھوڑو کالج واپس آج ہم تم سے باتیں کریں گے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ سامنے صوفے پر بیٹھ گئی اور کتابیں اس نے اپنی گود میں رکھ لیں۔ بیانیے میرے شانوں پر ہاتھ رکھ کر خفیف دباؤ سے مجھاپے سامنے بٹھالیا۔

”دیکھو ارم.....!“ بیانیہ ہاتھ ہاتھوں میں لے کر بولے۔ ”جو ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ۔ کھوکھو کہ یہی قسمت تھی۔ لیکن اب ہمیں پرانی طرز زندگی کو بحال کرنا ہوگا۔ میں مگر کی دہی روایتیں اور تمہاری وہی خوش حراچیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ابھی بیانیہاں تک ہی بولے تھے کہ نادیا کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابوں میں سے ایک تصویر گر پڑی۔ تصویر دیکھ کر بیانیہ لٹے ہوئے دکھ گئے۔ نادیا نے آہستگی سے تصویر اٹھائی۔ میں بھی حیران تھی کہ میری کتابوں میں تو کوئی تصویر نہ تھی یہ کیا ہے؟ بیانیہ ہاتھ بڑھایا تو نادیا نے عجیب سی شکل دکھائی تو وہ بے تصور بیانیہ کے ہاتھ میں دے دی۔

چند لمبے بغور تصور کو دیکھنے کے بعد بیانیہ نے میری طرف دیکھا۔ ان کی نظروں کے تیز

مجھے کچھ نا پسند یہ دکھائی دیے۔

پھر تمہیں خاموشی سے انہوں نے تصویر میرے ہاتھ میں پکڑادی۔ میں نے دیکھا کہ یہ ایک خوبصورت سائوجان تھا۔ پینٹ ٹرٹ میں ملیں کوئی کالج بوائے لگتا تھا۔

”کون ہے یہ.....؟“ بیانیہ بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم.....“ میں خود حیران تھی۔

”لیکن تصویر تو تمہاری بگ سے لگی ہے؟“

”مجھے نہیں پتہ کہ یہ..... یہاں کس نے رکھی ہے۔“ میں نے صاف کوئی سے کہا۔

”یہ کیا بات ہوئی.....؟“ بیانیہ تیر لہجے میں بولے۔

”بیانیہ تم لے لیں جو مجھے اس تصویر کے بارے میں کچھ بھی پتہ ہو.....“ یہ کہتے ہوئے

میں نے نادیا کی طرف دیکھا تو وہ دوسری کتاب کی ہوں ورق گردانی کر رہی تھی جیسے شاید کوئی اور چیز بھی مل جائے۔

میرا جواب سن کر بیانیہ لمبے مجھے ٹھہرتے رہے اور پھر چلو نادیا کہہ کر بغیر جواب لے کرے سے باہر نکل گئے۔

ان کے پیچھے پیچھے نادیا بھی ہالوں کو ایک جھٹکے سے شانوں کے پیچھے بیٹھ کر چل دی۔ اور میں اپنی جگہ گم سمی۔ کچھ رو گئی۔

ایک بار پھر غور سے تصویر کو دیکھا..... لیکن ذہن پر زور دینے کے باوجود بھی نہ جان سکی کہ یہ کون ہے یہ تو کوئی انجینی لڑکا تھا۔ پھر یہ میری بگ میں کس نے رکھی..... کیا نادیا نے رکھی اور پھر بیانیہ نے بھائی جان کو اس طرح میرے کمرے میں لائی ہو۔ جیسے بہن بھائی کی صبح کروانے جا رہی ہو۔

☆.....☆.....☆

اس واقعہ کے بعد تو بھائی نے جیسے مجھ سے آنکھیں ہی پھیر لیں اب میں پھر مگر بحر میں تھا ہوا چکی تھی۔ بیسوں سے بھی ٹک رہنے لگی۔ ایک دو بار بھائی جان سے پیسے مانگے..... پیسے تو وہ دے دیتے۔ لیکن نہ پھر کر کوئی بات کیے بغیر۔ لہذا اب مجھے پیسے مانگتے ہوئے شرم آنے لگی جبکہ نادیا سے پیسے مانگنا میں اپنی تو جین کھین تھی۔

ایک دن سنا کہ میرے کمرے اور اوڑے پر قند رے زور سے دھک ہوئی میں چونک پڑی

”آہ..... مٹی..... میں آ گیا۔“ ارسلان بھائی کو غیر متوقع طور پر سامنے پا کر میں دوزخ ان کے گلے سے لگ گئی۔ لیکن تھوڑی دیر خوش رہنے کے بعد سسکتے اور بھر زور زور سے رونے لگی..... ارے..... بھلی کیا ہوا تجھے.....؟ ارسلان بھائی نے سہارا دے کر مجھے بٹھا دیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے میری آنکھیں صاف کرنے لگے۔ گڑبڑ کیوں روتی ہے.....؟ میں آ گیا ہوں ناں..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے سب پتہ چل چکا ہے۔“

”بھیا.....“ میں پھر سسکی اور دل کا کم پانی بن کر عارض ہو گئے۔

ارسلان بھائی کی ڈھیروں تحلیلوں و تفسیروں کے بعد مجھے قرار آیا۔ اس دوران ناصر بھائی اور نادیا اور اس کی ماں سب ہی میرے کمرے میں آ گئے۔

”ناصر بھائی ارم کی حالت بتا رہی ہے کہ یہ نہ صرف ذہنی طور پر نہیں ہے بلکہ جسمانی طور پر بھی اس کی صحت نوئی طرح گری ہے۔ کیا یہ سب آپ کو نظر نہیں آ رہا؟“

”کیا کیا جتن نہیں کر چکا میں اس کو مٹانے کے لیے.....“ ناصر بھائی باہمی کے سے انداز میں بولے۔ یوں ناصر اور ارسلان میں بحث شروع ہو گئی اور پھر یہ بحث بڑھتی چلی گئی۔ حیرت انگیز طور پر نادیا اور اس کی ماں سیکھنا بالکل خاموش رہے۔ میں بھی کوئی خاص نہ بولی لیکن دونوں بھائی زور و شور سے تند و تیز جھگڑوں کا تار تار کرتے رہے۔ ارسلان کا موقف تھا کہ شادی کرنا آپ کا حق تھا لیکن ارم کو بس کی حیثیت سے اعتماد میں لینا ضروری تھا۔ جبکہ ناصر بھائی کا موقف تھا کہ اگر میں اپنا عشق طشت از باہم کرنا تو یہ شادی ہو ہی نہیں سکتی تھی جبکہ نادیا سے مجھے مشتق ہو چکا تھا۔ بہر کیف دو شخصوں کے طبع و عمل مباحثے کے بعد یہ طے پایا کہ ارم کی حیثیت گھر میں مرکزی ہوگی۔ خرچہ بھی اس کے ہاتھ میں دیا جائے گا۔

اس بحث کے آخر میں نکا ایک ناصر بھائی نے میری کتاب سے لڑکے کی تصویر مگر کرنے والی بات کر دی۔ ماحول یکدم سکد رہ گیا۔ ارسلان بھائی کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گڑبڑا گیا لیکن میں نے فوراً ہی اپنی بے گناہی میں حلیف بیان دے کر کہا کہ یہ یقیناً نادیا کی شرارت ہے۔ میری اس بات کا کہنا تھا کہ ناصر بھائی سچ پاؤ گئے کہ تم میری بیوی پر الزام لگا رہی ہو۔ بات ایک بار پھر ٹوٹ گئی۔

تاجم حریف کھڑے ہوئے بعد ہم سب میں صلہ ہو گئی اور میں ہنسنے کے بعد پہلی بار نادیا سے گلے

لی اس نے بڑی گرم جوشی دکھائی جبکہ سیکڑ خالہ کے روپے میں میں نے سرد میری محسوس کی۔ دوپہر کا کھانا میں نے اور نادیا نے بڑے چاؤ سے مل کر تیار کیا اور سب نے مل کر کھا لیا۔ آج بڑے دنوں کے بعد ہمارے گھر میں مشترکہ قہقہے کوئی اور میں خود کو ہلکا ہلکا تصور کرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

چند دن خوش و غم گزر گئے۔ ارسلان بھائی نے کالج میں داخلہ لے لیا لیکن صبح کی شفٹ میں نہیں بلکہ شام کی شفٹ میں۔ یوں وہ گیارہ بجے تک سوتے رہتے اور بارہ ایک بجے کالج جاتے۔ میں بھی دوبارہ کالج جانے لگی۔ میں اور ناصر بھائی اکٹھے ہی گھر سے نکلتے۔ وہ گاڑی میں مجھے کالج ڈراپ کر دیتے۔ ہم جب گھر سے نکلتے ارسلان بھائی سوئے ہوئے ای ابو چوکہ نیچے رچے تھے لہذا میرا کمرہ شروع ہی سے نیچے تھا۔ اب بھی میں نے نیچے ہی رہنا پسند کیا کیونکہ خالہ بھی نیچے ہی رہتیں۔ اس عورت میں بھی بچی کی شادی کے بعد عجیب تبدیلی آ گئی تھی۔

میلے کپیلے کپڑوں میں ملبوس اور خیالی چادر میں لپٹی سانولی فنی سی قدرے چھوٹے قد کی بیٹی تالیس پچاس سالہ سیکڑ..... جو ہر وقت ناک کاٹھن کھاتی رہتی۔ اب بھی کاسوٹ پہنے نظر آتی۔ چہرے پر مسکینگی کے بجائے اب ہر وقت طنزیہ مسکراہٹ مجھے دکھائی دیتی۔ روزانہ خوشبودار صابن اور گرم پانی سے غسل کی وجہ سے اس کا روپ بھی قدرے نکلتا آتا تھا۔ ہر وقت چمکتی ٹٹ کٹے دھتھی۔ چادر اوڑھنے کی بجائے دو پٹے ڈھانے پر ڈالے رکھتی۔ ہفتہ بھر گزرتا تو میں نے وہ باتیں نوٹ کیں۔ پہلی تو یہ کہ جب دونوں بھائی گھر پر نہ ہوتے تو وہ دونوں ماں بچی مجھ سے بات ہی نہ کرتیں۔ البتہ بھائیوں کے سامنے اچھی طرح ہنس بول لیتیں۔ دوسری یہ کہ ارسلان بھائی کے ساتھ بھی نادیا بڑی ہنس بول کر باتیں کرتی اور ارسلان بھائی بھی اس کے ساتھ بڑی خوش مزاجی سے بات کرتے۔ اس بات سے میرا ہاتھ ڈھکا۔ ایک بار میں نے جب تمنا شاد دیکھا۔ اس دن ہمارے کی ماں کی رات سے ہی طبیعت خراب تھی لہذا وہ صبح نہ اٹھی مجھے بھی چونکہ سلسلہ کی محسوس ہو رہی تھی جس کی وجہ سے کالج نہ گئی۔ بڑے بھیا ناصر کو بیٹے جیک پٹے مجھے تفریحاً سارے صوبے میں اٹھی اور جیسے ہی کمرے سے نکلی تو میری نگاہ اوپر برآمدے میں اٹھی تو نادیا ہنسنے کی کڑائی لے کر ارسلان بھائی کے کمرے کے دروازے پر کھڑی نظر آئی اس کی پشت میری جانب تھی لہذا وہ دیکھ نہ پائی۔ میں یکدم دروازے کی اوٹ میں کمرے کے اندر رونی جانب سے ہو کر دیکھنے لگی۔ نادیا اس



تری یادوں کے گھاٹ

وقت بیک ٹکر کے نرا دروسٹ میں لبوس تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے تیسری دستک پر دروازہ کھلا اور ارسلان بھائی کا چہرہ دکھائی دیا۔ ناویہ کو دیکھتے ہی ان کے چہرے پر غنیمت کی مسکراہٹ آجھری اور انہوں نے پیادے ناپ کی ناک چپکے سے پکڑ کر چھوڑ دی اور ناویہ بھی دھیمی سے ہنسی۔

میں اس بات پر ہکا بکا رہ گئی۔ میرے خیال میں تو ارسلان بھائی باہر پیچے سے پہلے نہیں آتے تھیں گے۔

میرے من میں تجسس نے سر اُبھار اور میں قسمت کی ماری لگے پاؤں ہی بیڑیاں چڑھ کر اوپر کے برآمدے میں پہنچ گئی اور وہ پاؤں کمرے کی کھڑکی کے پاس جا کر آتے گھنٹیں لگا دیں۔ تو میری کھوپڑی جھک سے اڑ گئی۔ میں نے جو منظر دیکھا تو اس پر یقین کرنے کو ہی نہ چاہا۔ ناویہ ارسلان کے سینے سے لگی تھی اور ارسلان نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھے تھے۔ ایک بار تو جی چاہا کہ چیخ کر گھر سر پر اٹھاؤں۔ لیکن پھر یکدم سوچ کر واپس پلٹی اور بیڑیاں اترنے لگی جیسے ہی میں نے آخری بیڑی پر قدم رکھا تو چاک جھٹھے ناویہ کی ماں یکے نامے کمرے کی دلیز پر کھڑی نظر آئی اس کی نظریں مجھ پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ لمبے لمبے کواہری نظریں چار ہوئیں لیکن نہ اس نے مجھ سے کوئی بات کی اور نہ میں نے بات کرنا مناسب سمجھا۔

☆.....☆.....☆

اپنے کمرے میں آ کر میں بیڈ پر اونٹنی لیٹ گئی اور سکتے لگی۔ میں جان چکی تھی کہ ناویہ کی ہر حرکت اس کی ماں کی خواہش کے عین مطابق ہے۔ میں شور مچاؤں بھی تو کوئی فائدہ نہ ہو گا اس لیے کاب ناصر بھائی کے بعد ارسلان بھائی بھی ناویہ کی زلف گرہ گیر ہو چکے ہیں اور ناویہ اور اس کی ماں تو پہلے ہی مجھ پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں۔ میں اپنے ذاتی بھرے منے مگر میں ایک بار پھر اکیلی ہو چکی تھی۔ بہر حال میں نے تیر کر لیا تھا کہ ناصر بھائی آئیں گے تو ساری بات ان کے گوش گزار کر دوں گی۔

لیکن میری بات کرنے کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ ابھی گھنٹہ بھر ہی گزرا تھا کہ ارسلان بھائی میرے کمرے میں آدھکے کان کے چہرہ دکھائی دے گئے۔ میں ڈر گئی۔

”تجہار افون آیا ہے؟“ انہوں نے تمہیر نیچے میں کہا۔

”کس کا؟“ میں نے اضطرابی طور پر پوچھا۔

”خود ہی سن لو!“ یہ کہہ کر وہ پلٹ گئے۔ میں سمجھی کہ میری کراچی والی کزن محبت ہو

تری یادوں کے گھاٹ

گی۔ وہ ہفتہ میں ایک بار ضرور فون کرتی تھی۔ اور فون ناصر بھائی کے کمرے میں تھا۔ میں اٹھ کر چل پڑی لیکن ارسلان کے سوا کو کون سا ہے۔ یہی سوچتی میں ناویہ کے کمرے میں پہنچ گئی۔ ریسپورڈر فون سے ہٹ کر پڑا تھا۔ ناویہ ایک طرف کرسی پر جمی گئی سے بیٹھی تھی۔

”ہیلو۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”کیسی ہو میری جان۔“ ”ایک سروانہ آواز نے مجھے چہ نکا دیا۔ آواز میں بازار کی بین چھلکتا تھا۔

”کون کون۔۔۔؟“ میں اس غیر متوقع صورت حال کے لیے تیار نہ تھی، وہی جس کی تصویریں کتابوں میں دیکھتی ہو۔

یہ سنتے ہی ریسپورڈر میرے ہاتھ سے گر پڑا اور میں ٹھگ ہو کر ارسلان بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔

ارسلان نے ریسپورڈر اٹھا کر فون پر لٹا دیا اور مجھے بھڑکتے ہوئے بولا۔

”کون ہے۔۔۔؟“

”میں مجھے نہیں پتہ۔۔۔“

”لیکن اس کی تصویر تجہاری کتاب میں تھی؟“

”جسم نے نہیں مجھ سے جو مجھے ادا بھی اس کے بارے میں معلوم ہو۔۔۔۔۔ یا میں نے کبھی اسے دیکھا بھی ہو۔“

”دیکھو ارم یہ حرکتیں ٹھیک نہیں ہیں۔ اس معاملے کو سب سے ڈک جانا چاہیے۔“ میری حالت تو یہ تھی کہ کافر تو ہو نہیں۔ قدم من میں مگر سہو چکے تھے۔ مارے شرم کے میں ذہن میں آؤ تھی تھی۔ پھر کوئی جرم ہوتا بھی تو؟۔۔۔۔۔ یہاں تو اٹے پھر کو تو ال کو ڈاؤنٹ رہے تھے۔

پہلے وار کرنے والے اکثر کامیاب رہے ہیں۔ اور ناویہ اور اس کی ماں بے درپے مجھ پر وار کر رہی تھیں۔

میں بڑی مشکل سے اپنے آنسو جی چھوٹے چھوٹے قدموں پلٹی کمرے سے نکل اور بیڑیاں اترنے لگی۔ آخری بیڑی پر قدم رکھا تو ناویہ کی ماں پہلے کی طرح ایک بار پھر اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی نظر آئی۔ اب کان کی نظریں کینہ توڑ تھیں۔ میں سمجھی کہ یہ سب کچھ اسی کے کھلائے ہوئے ہیں۔ لیکن میری ہڈی ٹھنڈا ہونے لگی تھی۔ میں کچھ بولنے بلیرا اپنے کمرے میں

پرتی یادوں کے گلاب

”کس نے باوجودِ حجابِ یہ بہتان کس سے دشمنی ہے تمہاری؟“

”کیوں اپنا الزام کسی کے سر تھوپتی ہو۔“ ناصر بھائی نے بیوی کی دگالت کر دی۔ ”صرف

”مادیہ بھابی ایسی حرکت نہیں کر سکتیں۔“ ارسلان کے منہ سے سن کر میں پھٹ پڑی۔

تواش..... اما صبر کا تھپن میرا نہ لال کر گیا۔ اب بھابی کے ساتھ بھائی پر بھی الزام لگا رہی

... ☆ ... ☆

اکلی صبح مجھے تاشتے کے وقت نہ بلایا گیا نہ ہمیں نے دروازہ کھولا۔

267

میری توقع کے برخلاف ناصر بھائی کو فون کے متعلق ارسلان نے کچھ نہ بتایا۔ رات کے کھانے پر بھی خاموش رہی صرف ناصر بھائی نے ہی مجھ سے ایک آدھ بات کی یا پھر یاد ہے جو صرف ناصر بھائی کے ہوتے ہوئے بات کرتی تھی۔ ارسلان نے کوئی بات نہ کی۔

”کون ہو تم.....؟“ وہ غرائے۔

”کیا ہوا ناصر.....؟“ ناویہ نے بھولپن لیکن تھکنی آواز میں پوچھا تو ناصر بھائی  
چٹ پڑے۔

”کیا ایسے فون پہلے بھی آتے ہیں؟“

لیکن مصر بھائی کو شدید فتنے میں دیکھ کر ارسلان نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

دلوں میں رہے سامنے والی کر سکیں پر بیٹھ گئے۔

اس کا پھر فون آیا تھا۔ ارسلان نے غصہ غصہ لہجے میں کہا۔





"دیکھو..... ارم" نادیہ نے گفتگو شروع کر دی۔

"مجھے پتہ ہے کہ تم ہر معاملے میں بے قصور ہو....." اس کی بات سے مجھے بڑی

حیرت ہوئی۔

"نہ تم نے کئیوں میں کسی کی تصویر بھی نہ تم نے کسی کو اپنی تصویر میں دیں۔"

"پھر یہ سب کچھ؟" میں مسک پڑی۔

"یہ سب میرے دے چائے ہوئے ڈرامے ہیں۔" وہ پوری سنجیدگی سے بات کر رہی تھی۔

"مگر کیوں..... میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ تمہیں کون سا دکھ دیا؟"

"تم نے مجھے کوئی دکھ نہیں دیا۔ بلکہ آج میں اگر اس گھر میں مضبوط حیثیت رکھتی ہوں تو وہ

صرف تمہاری مہربانی منت ہے۔"

"تو کیا انسانوں کا بدلہ ایسے چکا چاتا ہے۔"

"اس میں سراسر قصور تمہارا ہے۔"

"وہ کیسے.....؟"

"وہ اس طرح کہ تم میرے وجود کو بھائی کے روپ میں برداشت نہیں کر رہی تھی۔ اب اگر

تمہاری ضد کی وجہ سے ناصر اور ارسلان میرے خلاف ہو جاتے تو میں کہاں جاتی؟ لہذا اپنے قدم

بجائے کرنے کی خاطر مجھے تمہیں نشانہ بنانا پڑا۔"

"تو کیا یہ جو فون آتے ہیں.....؟"

"جی بالکل میں ہی کرواتی ہوں۔" وہ دھڑائی سے مسکرائی۔

"اور وہ جو شیا آپاگل اپنے بیٹے کے نام خط لے کر آئی تھیں۔"

"اس بات کی اس کو ادھیسی پے منٹ کی ہے میں نے۔ میری اماں اس کو پیسے دے کر خرید کر

لائی ہیں۔ اور وہ خط جو تم سے میں نے چھ ماہ قبل کھسوائے تھے وہ میں نے جان بوجھ کر کھسوا کر محفوظ

کر لیے تھے۔ کیوں کہ ان دنوں میں تمہارے بھائی ناصر سے عشق شروع کر چکی تھی۔ سو چا

ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اور وہ پڑ گئی۔" نادیہ ہنس کر بولی۔ اس کے کہنے سے مجھے چاکلکھٹا آ گیا۔

میں بھر کر آنکھ کھڑی ہوئی۔

"نیک ہے نادیہ..... اگر یہ بات ہے تو میں آج ہی بھائیوں سے مکمل کر بات کرتی

ہوں..... اور تمہاری یہ ساری باتیں انہیں بتا دوں گی۔"

"بے وقوف لڑکی....." نادیہ بے نگری سے ہنسی۔

"اگر تم نے ایسی کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی بھی تو تمہارے بھائی تمہاری کسی بات کا

یقین نہیں کریں گے۔ تمہاری مظلومیت سے زیادہ میری لڑاؤں میں جاوے..... اور یہ تم جان بھی

چکی ہو۔"

"میں ناصر بھائی کو آج ہی تمہارے ارسلان سے عشق کا سارا قصہ بتاتی ہوں۔"

"کچھ نہیں ہوگا....." نادیہ ہنس کر بولی۔

"یہ کام تم پہلے بھی کرنے کی کوشش کر چکی ہو اور پھر میں خود بھی ناصر سے کہ چکی ہوں کہ

ارم اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے مجھ پر کوئی بھی الزام لگا سکتی ہے لہذا میرے پہلے بتانے

سے اب تمہاری بات کا کوئی یقین نہیں کرے گا۔" نادیہ کی بات سن کر میں بے بسی سے ہونٹ

کانٹنے لگی۔

میں تو چاروں جانب سے خطرات میں گھر چکی تھی۔ لے دے کے بھائی ہی تھے۔ جن کی

نظروں سے مجھے گرا اچا چکا تھا۔ محلے میں بھی کل کے واقعہ کے بعد میرے کردار کے بارے میں

چہ میگوئیاں ہو رہی ہوں گی۔

"اب کیا چاہتی ہو.....؟" میری بے بسی کا جملہ سن کر نادیہ ہلکھلا کر ہنس پڑی۔

"صرف یہ کہ مجھے نہ صرف بھائی تسلیم کر لو..... بلکہ میری برتری کو بھی تمہیں تسلیم کرنا ہوگا۔"

"برتری سے کیا مراد ہے تمہاری.....؟" میں حیران تھی۔

"برتری سے مراد یہ ہے کہ مالی معاملات میرے ہاتھ میں ہوں گے..... اور تم بھی

بھائیوں کو یہ کیونگی کہ بھائی کو ہی پیسے دیا کریں۔"

"اور تم آئندہ مجھے تم نہیں بلکہ بھائی کہ کر خطاب کرو گی اور مونا مونا کام تو باقیس خاں کر

جایا کرے گی لیکن..... جانا کام گھر کا تم کیا کرو گی۔ اس وقت جب ناصر اور ارسلان گھر میں نہیں

ہوں گے۔ ان کے سامنے تم بے شک کچھ نہ کیا کرو گھا نا بھی ہم سب ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھایا کریں

گے..... بظاہر مل جل کر زندگی گزار رہے ہوں گے۔ بھائی خدشہ بڑا پیدا ہوگا۔ لیکن درودن خانہ

صورت حال وہی ہی ہو گی جیسے میں نے کہہ دی ہے۔"

نادیہ کے منہ سے صلح کی شرطیں سن کر میں گھٹ ہو گئی..... مجھے زمین کھوتی ہوئی محسوس

ہونے لگی۔ میرا سر جھکانے لگا.....



قری یادوں کے گلاب

عالم پریشانی میں نہیں نے کمری کی پشت سے سر نکالایا۔ تھوڑی دیر بعد میری حالت قدرے سنبھل تو میں نے آنکھیں کھولیں۔ "نادیہ کو سکرانے پایا۔ وہ سیب کاٹ کر کھا رہی تھی۔ اس کی ماں اسی طرح صوفے پر بیٹھی تھی۔ اس نے دھل انداز کی تھی۔"

میں نے پھر آنکھیں موند لیں۔ "نادیہ کی باتیں میرے ذہن میں بخوبی کی مانند برسی رہی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مجھے اپنا غلام بنانا چاہتی ہے۔ مجھے بیک میل کر رہی ہے۔ میرا گھر اور مجھ پر رعب میری بی اور مجھے ہی مہاؤں۔ آج اگر میں نے اس کی یہ باتیں مان لیں تو کل کو یہ مزید جارحیت کرے گی۔ میری زندگی ابیرن کر دے گی۔ نہیں..... نہیں میں آج ہی دونوں بھائیوں سے کل کر بات کروں گی..... اس کا بھانڈا پھوڑ دوں گی۔ یہ میرا گھر ہے۔ میرے والدین کا گھر ہے۔ یہ تو میری نوکرانی تھی..... آج ایسٹ انڈیا کمپنی والا کھیل بکھل رہا ہے۔"

مجھے اس کی بات نہیں مانتی تھی..... لیکن کوئی ڈرامہ کرنا ہوگا۔ ابھی اس سے صلح جو لے میں بات کرتی ہوں..... پہلے ناصر اور سلطان بھائی کو احاطہ میں لے لوں۔

"کہاں تم ہو گی ہمارم.....؟" "نادیہ کی آواز سے میں چونکی۔

"آں..... ہاں....." میں گڑبگڑائی۔ "نادیہ کی نظریں اپنے چہرے پر گڑی دیکھ کر بھی کہ شاید اس نے میرے دل کا چرہ پکڑ لیا ہے۔"

"بتاؤ نہیں تم نے؟" "نادیہ نے نرم لہجے میں پھر پوچھا۔

"میں میں کل بتاؤں گی..... مجھ سے کوئی بات نہیں پڑی۔" "نادیہ میرے حواس پر چھا چکی تھی۔ میں اب اس کے سامنے خوفزدہ ہو جاتی گڑبگڑا جاتی۔

"کل نہیں..... آج ہی....." اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اور ناصر اور سلطان کے آنے سے پہلے پہلے وہ پانچ بجے کے بعد شام کو آتے ہیں۔

"اب تم جا سکتی ہو....." اس کے حکمانہ لہجے نے میرے تن بدن میں انگارے بھر دیے۔ جی میں آپاں اس کا مستوح لوں لیکن وقت کی نزاکت جان کر خون کے گھونٹ پی کر رو گئی۔ اور ابھر کوئی بات کیے کرے سے نکل گئی۔

"اس لومڑی کی دم کا پتہ تو زندگی بھر میں کرو گی نادیہ بیٹی....." یہ نادیہ کی ماں کے الفاظ تھے جو اس نے میرے کمرے سے نکلنے کے بعد ادا کیے تھے میں نے کھڑکی کے پاس رک کر

قری یادوں کے گلاب

من لیے..... اس کا یہ جملہ گرم پیر۔ بن کر میرے کانوں میں گھسا۔ غصے کی ایک لہر میرے دل و دماغ سے پھولی جس نے پورے وجود کو اپنے لیے میں لے لیا۔ میں پھری ہوئی شیریں کی طرح جلی اور کمرے میں جا گئی۔

"کیا بکواس کی ٹوٹنے دو نکلے کی نوکرانی....." میں تیر کی طرح نادیہ کی ماں کی طرف لگی اور اس کی چٹپٹا کچڑ کر کے صوفے سے فرش پر گر لیا اور اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی نادیہ کی طرح اس پر پٹی پڑی اور اسے لاقوں اور گھونٹوں پر دکھایا۔ پھر مجھے پیچھے سے نادیہ نے بالوں سے پکڑ لیا۔ میں پیچھے دیکھنے کی کوشش میں نادیہ کی کے بعد لڑکھائی اور پھر نہ سنبھل پائی بلکہ کسی چیز میں پاؤں ایسا الجھا کے سر کے بل پیچھے گر پڑی تو دونوں ماں بیٹی میرے اوپر بیٹھ کر مجھے مارنے لگیں۔ میں اکیلی اور وہ دو خرام کھا کھا کر پٹی ہوئیں۔ میں کب تک ان کا مقابلہ کرتی۔ انہوں نے دروازہ بند کر دیا اور میرے منہ میں زبردستی دوپٹہ غنوں دیا میری آواز بند ہو گئی تھی۔ تو نادیہ کی ماں پیچھے سے دونوں ہاتھ میرے پیٹ پر باندھ کر مجھے اپنی گود میں لے کر صوفے پر بیٹھ گئی..... اور نادیہ نے پانچ سات تھپتھپ میرے گالوں پر اتارتے زور سے مارے کہ میری آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

"حرام زبانی کو اور مار....." اس کی ماں کہہ رہی تھی۔

"نہیں اماں۔ اب پھوڑ دے اس کو....." یہ پرکھی جڑیا کہاں جانے کی.....؟ "نادیہ کے کہنے پر پکینے نے مجھے صوفے پر پٹ پٹ دیا۔ میں نے پہلے اپنے منہ سے دوپٹہ کھینچ کر نکالا اور پھر رونے لگی۔ چند منٹ رونے کے بعد میں چپ ہوئی تو دیکھا تو نادیہ کمرے میں اکیلی تھی۔ اس کی ماں جا چکی تھی۔ میں سمجھ گئی یہ جیتنا باہر دروازے پر بیٹھی ہوگی۔ کیونکہ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ یعنی اب میں پرغال تھی۔ نادیہ گہری خاموشی سے میرے چہرے پر نگاہیں گاڑے تھی۔ اس نے ہٹکارہ بھر کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ نگاہیں ملتے ہی وہ مسکرائی۔

"ارم آؤ صبح کر لیں..... صرف اس شرط پر کہ تم مجھے بھائی ماں لو..... اور کوئی شرط نہیں....." اس کی نئی کروت دیکھ کر میں دل ہی دل میں چونکی لیکن کوئی تاثرات چہرے پر نہ ابھر نہ دیے۔

میں دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ چلو کیا مہرج ہے۔ کچھ تو فیشن کم ہوگی۔ مگر میں تھوڑا سا تناسب کچھ تو کرے گا۔ شاید اسی طرح ہی میں بھائیوں کا اندازہ پارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

”اب ہمیں یہ گرج کر کہیں اور شفٹ ہونا پڑے گا۔“ ارسلان ہنسے میں تھا۔  
”کیوں.....؟ کیا ہوا.....؟“ یہ صبر بھائی تھے۔

ابھی جب میں کالج سے واپس آیا تو گلی کے چند لوگوں نے مجھے روک لیا اور اس کے کھسے ہوئے ٹولیز دکھا کر مجھے کہنے لگے۔ کہ یہ شرطیوں کا قتل ہے۔ ایسے لکھن کرنے ہیں تو اس بھلے کو پھوڑ دو۔ کہیں اور جاہو۔“ ارسلان نے غرت سے مجھے دیکھا۔

میں نے متوجہ نظر دے سے ناصر بھائی کی طرف دیکھا۔  
وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ لیکن اب ان کا پہلے والا سونڈ تھا۔ ان کی نگاہوں میں مسکرت پن پیدا ہو چکا تھا۔

میرے وجود میں لڑش شروع ہو گئی۔ اس سے قبل کہ میں کچھ بولتی ناوی کی ماں بیکہ نہ کرے میں داخل ہوئی اس کے بازو پر سفید پٹی بندھتی تھی جو سرخ ہو رہی تھی۔

”کیا ہوا خالہ.....؟“ ناصر بھائی اپنی سانس کی طرف بڑھے۔  
”کچھ نہیں ہوا.....“ ناوی بھی آ گئی۔ وہ اپنے کمرے سے لپٹ بپٹ ہو کر نکلی تھی۔ ای کیوں میں ہزنی کاٹ رہی تھیں کہ چھری لگ گئی۔

”ہزنی کاٹ رہی تھیں تو چھری بازو پر کیسے لگ گئی؟“ ارسلان اپنی بات بھول کر بولا۔  
ارسلان کی بات سن کر کچھ خالہ نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھا لیکن ناوی پھر بول پڑی۔ ”بس کسی طرح لگ گئی۔ اس میں کیا ہے اور تو کچھ..... نہیں.....“ اس نے لہجہ کچھ اس طرح اختیار کیا۔ جیسے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔

اسے میں کیونکہ خالہ سسکیاں بھر کر رونے لگیں اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگیں۔ ”چلو تم کہتی ہو تو کچھ بھی نہیں ہوا ہوگا۔“

”جی جی تاؤ ناوی کیا ہوا.....؟“ ناصر بھائی نے ناوی کو شانوں سے پکڑ کر اتنی زور سے ہلا کر اس کی پھری کا نیچوں کی چوڑیاں تک چھیننا اُٹھیں۔

”تم تاؤ خالہ اصل قصہ کیا ہے؟“ ارسلان پوچھنے لگا۔

خالہ نے پہلے مجھے غور سے دیکھا اور پھر کہنے لگی۔ ”میں دو پہر کو ہزنی کاٹ رہی تھی کہ ارام بچن میں آ گئی اور چھری میرے ہاتھ سے چھین کر کہنے لگی..... کہ مای مصیبت اس گھر میں سارا فساد تیری وجہ سے ہے۔ آج میں تیرا قصہ ہی تمام کر دوں گی۔ یہ کہہ کر اس نے چھری میری طرف بھرائی

”کیا سوچ رہی ہوا.....؟ کیا ہم ایک گھر میں اچھے دوستوں کی طرح نہیں رہ سکتے؟“

ناوی کے بچے میں حد درجہ حلاوت تھی۔ میں کچھ گئی کہ وہ بھی کسی نہ کسی طور اس معاملے کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اور میری خبریت بھی فی الحال اسی بات میں ہے کہ یہ معاملہ ختم پڑ جائے۔ تاکہ بھائیوں کے دوپے میں فزنی آ جائے اور پھر میں ان کے سامنے سارا معاملہ کھول کر دکھا سکوں۔ اس خیال کے انحرے ہی میں نہ سون ہوئی چلی گئی۔ میرے چہرے پر اطمینان کی لہریں پسینے دیکھ کر ناوی بھی شاید کچھ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور میرے پاس آ بیٹھی اور پیار سے میرے گلے میں بائیں حائل کر دیں میں بھی ناوی کے گلے لگ گئی۔

ناوی تھوڑی دیر مجھ سے باتیں کرتی رہی پھر کہنے لگی۔

”اٹھو کیا حالت بنا رہی ہے تم نے اپنی چلونا دھڑک رہی تبدیلی کر لو۔“

☆.....☆.....☆

پانچ بجے کے قریب ارسلان آیا..... میں اس وقت سو کر اٹھی تھی اور بائیسے میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ ہنسے میں تھا۔ میرا خیال تھا مجھ سے بات کرے گا لیکن وہ تیز تیز قدم ملے کر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ناوی اور اس کی ماں اس وقت اوپر ناصر بھائی کے کمرے میں تھیں۔

میں چائے پی کر ارسلان کے کمرے میں گئی تو دروازہ اندھ سے بند تھا۔ دھک دی ایک دو آوازیں بھی دیں لیکن اس نے دروازہ نہ کھولا۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ ناراض لگا تھا۔ میں نے ناوی کے کمرے کو دیکھا اس کا دروازہ بھی بند تھا۔ شاید سو رہی تھی۔ میں نیچے آ گئی۔ تقریباً دروازہ کھسنے کے بعد باہر گلی میں گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ یقیناً ناصر بھائی آئے تھے۔ میں نے اٹھ کر گیت کھولا۔ انہوں نے گاڑی اندر کر کے پورچ میں کھڑی کی اور باہر لکڑی میری طرف بڑھے ان کا سونڈ خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔

لیکن اس سے قبل کہ وہ میرے قریب پہنچے ارسلان کی آواز آئی۔

”ناصر بھائی اوپر آئیں اور ارام کو بھی لیتے آئیں۔“

”خیریت.....؟“ انہوں نے سڑک کو اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ آئیں تو کسی.....“ ارسلان کے انداز میں گئی تھی۔

”آوارام.....“ ناصر بھائی کہہ کر تیل پڑے میں ان کے پیچھے لپکی۔



تری یادوں کے گلاب

جو میرے بازو میں کھب گئی۔ وہ تو ہادیہ میری چیخ سن کر آگئی اور اس نے اس کے ہاتھ مروڑ کر ہونکا دیا۔ چھری گری اور اس کو کھینچ کر اوپر لے آئی۔

”کیوں ہادیہ؟“ نامہ نے پوچھا تو ہادیہ نے بھی آنکلی سے انہیاتی انداز میں سر ہلا دیا۔ میں دونوں ماں بیٹی کے سفید جھوٹ سے نہ صرف ہکا بکا ہو گئی بلکہ اس غیر متوقع شدید صدمے سے حواس باختہ ہو گئی۔ ارسلان نے آگے بڑھ کر کھینچ کر چائنا میز سے منہ پر مارا۔ ”میری وجہ سے نہ مگر میں جھین ہے اور نہ باہر۔ سارے فساد کی جڑ تو یہی ہے۔“ ارسلان نے تاہم توجہ پھرنوں سے میری تواضع شروع کر دی۔ ناصر بھائی سمیت کسی نے چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ مار سے بچنے کے لیے میں ناصر بھائی کی طرف چلی تو آگے سے انہوں نے اسے زور سے چھین مارا کہ میں بیڑ پر اونٹنی جا کر گی۔

☆.....☆.....☆

دونوں بھائیوں نے اچھی طرح میری دھنائی کرنے کے بعد مجھے اوپر ہی بکنا کے ساتھ سنوڑ میں بند کر دیا۔ میں کافی دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ جالی سے بھائیوں کو آواز میں دیں مگر کسی نے میری نہ نہی۔ تھک ہار کر سنوڑ میں چڑی ایک ٹوٹی ہوئی لوہے کی چار پائی پر پڑ کر سو گئی۔ صبح سنوڑ کا دروازہ کھلا۔ ارسلان نے مجھے باہر نکالا اور ناصر بھائی کے کمرے میں لے گئے۔ جہاں ہادیہ اور اس کی ماں بھی موجود تھیں۔ سب بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھروسوں کی طرح کھڑی تھی۔

”سنوڑ ام!“ ناصر بھائی خنجر کی سے بولے۔

”تمہاری وجہ سے ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے اور خالہ کو چھری سے ڈھکی کر کے تو تم نے حدی کر دی ہے۔ اب تمہارا علاج یہی ہے کہ تم اپنے کمرے میں بند ہو گی۔ ایک ماہ کے بعد اگر تم سوچو تو یہ دیکھیں گے کہ کیا کرتا ہے۔ اس سے پہلے تمہارا جدم گھر سے باہر نکلا وہ تمہارے دھڑ سے الگ کر دیا جائے گا۔“

☆.....☆.....☆

اس کے بعد میری زندگی کے ہر ایک دور کا آغاز ہوا۔

رات سادہ میرے کمرے کے دروازے پر تالا چار ہوتا۔ صبح آٹھ بجے کھٹکا۔ ناشتہ دینے کے بعد پھر کمرے کو باہر سے بند کر دیا جاتا۔ پھر شام کو بھائیوں کی واپسی پر کھٹکا۔ سارا دن کمرے کی

تری یادوں کے گلاب

اکھوٹی کھڑکی سے میں باہر کا نظارہ کرتی رہتی۔ البتہ شام پانچ بجے مجھے ”کھول“ دیا جاتا۔ بھرات نو بجے تک میں آزاد ہوتی۔ دوسرے ہی دن جب شام کو مجھے آڈول کیا گیا تو میں بھائیوں کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ لیکن انہیں مجھ پر ترس نہ آیا۔ ہادیہ اور اس کی ماں نے میرے خلاف کچھ ایسے جال بچائے تھے۔ کہ میں پلڑ پلڑا کر رہ گئی تھی۔ بھائیوں کو اہل عقد سے بے عزت کر دیا گیا۔ میرے گلے ہوئے عشقیہ خطوط دکھائے گئے۔ لڑکے کی تصویر میری کتاب سے نکل تھی۔ دسی لڑکوں پر میرے متعلق نازیبا افواہ کو استعمال کرتا تھا اور بھائیوں کو ہمیشہ سے بکنا سے زیادہ اپنی عزت پیاری لگتی آئی ہے۔ میری تو کسی بات کا وہ یقین کرنے پر تیار نہیں تھے لہذا میرا دونا بیکار کیا! اگلے دن صبح پھر مجھے ناشتہ کے بعد بند کیا گیا تو میرا دل بڑی طرح جھٹکنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں ازل سے اس کمرے میں بند ہوں۔ بیکون نے مجھے کمرے میں دھکیل کر تالا لگا دیا۔

ان تین دنوں میں غیر محسوس طریقے سے میرے کمرے سے انٹر ٹینٹ کی ہر چیز ہٹائی گئی۔ سونی کا فیک پڑا تھا۔ آج اب وہ بھی نہیں تھا۔ یقیناً میرے ہاتھ سے کے دوران نکالا گیا تھا۔ ٹی وی کل صبح نکالا گیا تھا۔ میرے پاس اب سوائے رونے دھونے کے اور کوئی فٹل نہ رہ گیا تھا۔ لیکن اب تو آنکھوں کے سوا سبھی خشک ہو چکے تھے نیند بھی اڑ چکی تھی۔ بیڑ پر سیدھا لیٹ کر میں عمار ناچیت کی کڑیاں گن رہی تھی کہ بھیا کی گاڑی شارٹ ہونے کی آواز آئی وہ یقیناً بنگ چار ہے تھے۔ میں اٹھ کر کھڑکی میں آنکھڑی ہوئی گاڑی گیٹ سے نکل رہی تھی۔ ہادیہ نے گیٹ بند کیا چلی مجھے دیکھا۔ مسکرائی۔ میری طرف آنکھڑی کر کے پاس رک گئی۔ کہنے لگی۔

”یہ خوف لڑکی اس دن تو نے میری اہی کو مارا۔ جس کی وجہ سے یہ صورت حال بنی۔

کیوں اپنی جان کی دشمن بن رہی ہو۔ میری شرطیں مان لو۔ میں وعدہ کرتی ہوں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ورنہ ابھی ہادیہ کے ترکھیاں میں حرید تیر بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر تو میرے حسن و فیشن کا کھنجر ہے جس سے نہ نامہ نکل سکتا ہے اور نہ ارسلان۔ اور پھر ابھی جو یہ نے ترپ کا پتہ پھینکا ہی کب ہے۔“ میں اس کی باتیں سن کر ہونٹ کانٹنے لگی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں سسکتے لگی۔ میں اب نہ حال ہو چکی تھی۔ بھائی میری بات سننے کے بھی رد ادا نہ تھے۔

”اچھا میں چلتی ہوں۔ آج ناشتہ آپ کو نہیں مل سکتا۔ ذرا ارسلان کو ناشتہ دینا ہے۔ وہ کچھ چلا جائے پھر آؤں گی۔“ یہ کہتے ہوئے ادھر اوجھاب سے بغیر خوشی سے اچھٹنے کے انداز میں زینے تلے کرتی اوپر چلی گئی۔

تری یادوں کے گلاب

میں اب بایوی کی افتادہ گمراہیوں میں ڈوبنے لگی تھی۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ اس کی یہ بات اب بھی میں نے تپ کا پتہ نہ کر سکا ہے۔ اس بات کا اشارہ تھا کہ ابھی وہ کوئی بہت بڑا الزام میرے پر تھوپ کر مجھے حریف بنے عزت کرنا چاہتی ہے۔ اگر وہ ایسے ہی پتہ پرے وار کرتی رہی تو میں منہ میں بدنام ہو جاؤں گی۔ یہ نہ ہو کہ رشہ بھی کوئی نہ کرے۔ کون جھوٹے الزام کو چٹائی کی کہانی پر پرکھتا ہے۔ الزام ہی کو جرم مان لیا جاتا ہے۔ میں گھنٹوں میں مردے کروڑوں لگی۔ تھوڑی بہ بعد خود ہی چپ ہو کر آنکھیں صاف کرنے لگی۔ تسلی دینے والا تو کوئی تھا ہی نہیں میں بھرے پن۔ گھر میں تنہا تھی۔

☆.....☆.....☆

اور پھر ارسلان نے بھی "ناشیہ" کر لیا اور کالج چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ ارسلان کے جانے ہی ناویہ میرے پاس آ جائے گی مگر ایسا نہ ہوا۔ کام والی خالدہ بھیس کو میں کمزری سے صفائی ستھرائی کرتے دیکھتی رہی پھر وہ کچن میں دوپہر کا کھانا بنانے لگی اور کھانا تیار کر کے اوپر ناویہ کے کمرے میں لے گئی۔ مجھے کسی نے نہ پوچھا۔ ناشیہ بھی نہ کیا تھا۔ میں بھوک یی میرا شکم کے پیٹھی رہی۔ کوئی مصروفیت بھی تو تھی۔ کیا اندھیر تھا۔ کیا ظلم کا راج تھا کہ میرا گھر اور میرے گھر میں تقب لگانے والیاں جو کبھی گھر کی نوکریاں تھیں کس لحاظ اور آزادی سے فنی خوشی کھانا کھا رہی تھیں اور اصر میرے کمرے میں پانی تک موجود نہ تھا اور میں ان کے رحم و کرم پر تھی۔ مجھے کھانا دینا یا نہ دینا۔ کرتے کرتے سر پہر کے چار بج گئے۔ ناویہ اور اس کی ماں کھانا کھا کر شاید تیلو فرما رہی تھیں کیونکہ گھر میں سنا تھا۔ بھیس کام کر کے جا چکی تھی۔ اصر میں دل ہی دل میں ناویہ سے مکمل طور پر شکست قبول کر چکی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی میری حریف بدنامی ہو جو میرے مستقبل پر نہ سے اثرات مرتب کرے بہتر یہی تھا کہ فی الحال جیسے تیسے صلح کر لوں اور وقت گزاروں۔ موقع ملے ہی سارے حساب چکا دوں گی۔ میں انہی سوچوں میں تھی کہ ناویہ کی انجساز بھری چٹکتی آواز ابھری۔

"کن سوچوں میں کم ہونہی؟" میں نے آہستگی سے پلٹ کر دیکھا۔ ناویہ صبح والا سوٹ بدل چکی تھی۔ ہاتھ میک اپ، کھلا کھٹا چہرہ، دندنی سے بھر پور مسکراہٹ اور مسکراہٹ کے پیچھے چمپا ہوا لٹر۔ ایک لمبے کو میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ لیکن پھر میں سنبھل گئی۔ یہ کڑوا کھانے کا موقع نہ تھا۔

میں تھوڑی دیر اسے دیکھتی رہی پھر ہنس پڑی۔ مجھے روتا دیکھ کر ناویہ ہلکھلا کر ہنس پڑی

تری یادوں کے گلاب

اور تالا کھول کر اندر آ گئی۔ اس کے اندر آنے سے ہوں محسوس ہوا جیسے خوشبوؤں کا سیلاب آ گیا ہو۔ چڑیوں کی کھٹک اور نئے سوٹ کی سرسراہٹ الگ تھی۔

"پھر کیا سوچا تم نے ارم.....؟" ناویہ نے فیسے سے بیٹھنے ہوئے سوال کیا۔

"م..... مجھے منظور ہے۔" میرے ہونٹوں نے بیشکل جملہ نکل کیا اور پھر میری آواز بھرا گئی۔

☆.....☆.....☆

شام کو بھائیوں کے آنے پر ناویہ نے میری بھرپور سفارش کی اور میرے من میں زور و شور سے وکالت کی۔ محلے والوں کو بھرا بھلا گیا۔ ناصر اور ارسلان کو کہنے لگی کہ میں دوسروں کے کہنے پر کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے اپنی بہن کو دیکھتا ہے۔ اور پھر یہ میری تندی نہیں سنبھلی بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آج میں اگر اس گھر کی بہنوں تو وہ اپنی دوست..... اپنی ماگن ارم کی وجہ سے ہوں..... اس نے ایسی پکٹی چیز کہاں اور جہاں باقی تقریر کی کہ بھائیوں کے دل بچ گئے اور مجھے آزادی مل گئی۔ تاہم فی الحال کالج نہ بھیجے کی تلقین کرنا ناویہ نہ بھولی۔ رات کا کھانا میں نے سب کے ساتھ کھایا۔ صبح ناشنے کے وقت بھی ناویہ آ کر مجھے ساتھ لے گئی۔ بھائیوں کے سامنے دونوں ماں بچی نے مجھے کوئی کام نہ کرنے دیا۔ ناویہ کی ماں خود ہی کچن میں گھس کر برتن وغیرہ دھوئے لگی۔ ناصر بھائی چٹک چلے گئے تو ناویہ مجھے ارسلان کے کمرے میں لے گئی۔ جہاں ہم دو کھینے تک کپ شپ کرتے رہے۔ بھیس خالہ بچے کام کرتی رہیں۔ بارہ بجے کے بعد ارسلان بھائی بھی کالج چلے گئے۔ تو میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں ناویہ نے ایک لحاف میرے سامنے لا کر رکھ دیا۔

میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"کھول کر دیکھو تصویریں ہیں کچھ۔" ناویہ نے بے پروائی سے بالوں کو کان کے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

میں نے لحاف کھولا تو دو تصویریں تھیں۔ پہلی ہی تصویر دیکھ کر میرا جسم لرزنے لگا۔ اس میں وہی لاکھا جس کی تصویر میری کتاب سے گری تھی۔ میری کمر ہاتھ دے کے میرے پیچھے کھڑا تھا اور میں ہنس رہی تھی۔

دوسری تصویر میں اس لڑکے نے ہاتھ میرے شانوں پر رکھے تھے۔ تصویریں دیکھ کر میں



ٹنگ ہوئی تو فوراً ہی نادیر نے تصویریں میرے ہاتھ سے چھین لیں اور کہنے لگی۔

”تمہاری تصویریں..... تمہارے الم سے نکال کر ایک ماہر فوٹو گرافر کو دے کر اس فوٹو کے کی تصویریں بڑی محنت سے ہم آجنگ پوز میں بنوائی گئی ہیں۔ اور فوٹو گرافی کی بدولت کپی پیٹر انرٹیکٹک سے جوڑی گئی ہیں۔ ہے تو یہ سب جھوٹ..... شاید تمہارے بھائی بھی اسے دیکھ کر سمجھ جائیں کہ یہ کیسے بنائی گئی ہیں مگر جب یہ تصویریں زیادہ تعداد میں ملنے کے لڑکوں سے ہاتھوں میں تیار ہو کر بیچیں تو پھر کیا ہوگا۔ یہ تو تم سمجھ ہی سکتی ہو۔ ان تصاویر کی درجنوں کاپیاں محفوظ ہیں میرے پاس۔“

”اب تم کچھ کتنی ہو کہ نادیر کے ساتھ دوسرا بازی کرنے کی کوشش میں تم کتنی بدنام ہو جاؤ گی۔ ہو سکتا ہے بھائی تمہارا خون ہی کر دیں۔ ایسی صورت میں بھی..... فائدہ سے میں نہیں ہی رہوں گی۔ تمہارے غل میں تمہارے بھائی پھنس جائیں گے اور میں اس گھر کی اکلوتی وارث بن جاؤں گی۔“

”یاد رکھو میں دن تم نے اپنے بھائیوں سے میری شکایت لگائی..... اس کے آدھ گھنٹے کے اندر اندر تصویریں ملنے میں پچھلاؤں گی۔ اور ہاں ان دو تصویروں کے علاوہ بھی تمہاری ایک خاص ذاتی تصویر میرے قبضے میں ہے وہ میں تمہیں ابھی نہیں دکھاؤں گی۔ کیونکہ اصل کا ہوا ہی تصویر نے کرنا ہے۔“

مجھے نادیر کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میرا سر گھومنے لگا۔

”لو پانی پیو.....“ آٹھویں کھولیں تو نادیر نے پانی کا گلاس میری طرف بڑھا کر دکھا تھا جو میں نے اس کے ہاتھ سے لے کر غٹا ہٹ لیا۔

”زیادہ پینشن لینے کی ضرورت نہیں ارم.....“ نادیر نہایت ہولناکت لہجے میں کہنے لگی۔

”نہیں سمجھو نہ کچھ ہوا ہے اور نہ کچھ ہوگا۔ سب کچھ صرف تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ہاں..... جن شراکتہ پر میں نے تم سے صلح کی ہے ان کا ختمی سے خیال رکھنا ہے۔ کوئی کوتاہی نہ ہو۔ اگر ایسا کرتی رہو گی تو پھر ہر گز تم دل و دماغ سے نکال دو بصورت دیگر میں ہر دستاویز حربہ استعمال کروں گی۔ اب تم جاؤ اور کچن کی صفائی کر کے دو پہر کا کھانا تیار کرو۔“ پانی تو گرائی اور تپتی بائکن کا پہلا گھم بن کر میرے ہونٹ چٹکی گئے اور میں آنسوؤں کو جیتی ہوئی پیچھے آ کر کام میں لگ گئی۔

ناصر اور ارسلان کے سامنے نادیر مجھ سے انتہائی پیار کرنے والی بھابی ہوتی۔ اس کی ماں میری تشریفیں کرتے نہ جھگڑتی۔ نادیر جب کبھی شاہجہان کرنے جاتی میرے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لاتی۔ اپنے کپڑوں کے ساتھ ساتھ میرے لیے نئے فیشن کے کپڑے خریدنا نہ بھولتی۔ آؤ ٹنگ میں بھی میں ان کے ساتھ ہوتی۔ رات دیر تک ہم بیٹھی برسوسو خرچہ کر گئیں لگاتار۔ دونوں ماں بیٹی کی ایکٹنگ اس قدر فطری تھی کہ کبھی بھابیوں، مہمانوں یا کسی کے سامنے مجھے گھور کر کبھی نہ نکلتیں۔ مجھ سے اتنا پیار، محبت و جفا نہیں کہ دیکھنے والے اتنی اچھی بھابی ملنے پر میری قسمت پر رشک کرتے..... سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے بعد نہ کبھی اس لڑکے کا خون آ پانا نہ فریاد آپانے ٹنگ کیا۔ لیکن بھابیوں کے گھر سے نکلنے ہی یا چننا ہوتے ہی ان کی آنکھیں ماتھے پر چڑھ جاتیں۔

بلقیس غلام صفائی سٹرائی کر جاتی لیکن کچن کا تینوں وقت کام اور برتن دھونا صفائی کرنا میری ذمہ داری میں شامل تھا۔ اس کے علاوہ نادیر کے کپڑے پر پیرس کرنا، اسے تیار ہونے میں مدد کرنا، سب میرے ذمے تھا۔ خاص طور پر دو پہر کے کھانے کے وقت جب اکثر بھابی گھر میں نہ ہوتے کھانے کی سرورس بھی ماں بیٹی کے سامنے مجھی ہی کرنی پڑتی۔ میں خود کھانا ان کے بعد کچن میں بیٹھ کر کھاتی۔ کھانا کھا کر اکثر دونوں سو جاتیں لیکن میرے دو پہر کو سونے پر سخت پابندی عائد تھی اور یہ سارا جہاں انہوں نے اس خوبصورتی سے بچھا یا تھا کہ ناصر اور ارسلان دونوں کو ٹنگ کا شائبہ تک نہ گزرتا۔ مجھے یہ عزم تھا کہ صبح سویرے غسل کر کے کپڑے بدل لیا کروں تاکہ میلے کپڑے نہ کچھ کر کسی کو ٹنگ نہ ہو جائے۔ ہر ہفتہ دس دن بعد نادیر مجھے دھمکیاں دیتا نہ بھولتی۔ ناصر بھائی ساری تنخواہ لانا کر نادیر کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ بنگ ٹیجر کی حیثیت سے ان کی تنخواہ ابھی خاصی تھی۔ جن میں سے تین ہزار روپیہ وہ ارسلان کو دے دیتے اس میں سے کبھی ہزار بارہ سو نادیر لے لیتی۔ گھر کے اخراجات سے ابھی خاصی خرچ بردہ کی جاتی۔

ایک ماہ بعد میرے لیے خاتم جاری ہوا کہ وہ ٹنگ سوتی رہا کر جتنی کہ ناصر و بنگ چلے جائیں اور نادیر ارسلان کو کنبھائی میں ناشو کروا چکے۔ ارسلان کے کالج جانے کے بعد مجھے اپنے کمرے سے باہر آنے کی اجازت تھی۔ اور اُنھیں ہی پہلے مہن برآمد سے کی صفائی کرنی پھر ناشو کرنی۔ شروع شروع میں میں بہت گھبراتی۔ بہت زیادہ ٹنگ جاتی تھی اور پھر اتنا کام کرنے کی تو مجھے عادت ہی نہ تھی۔ اور میری یہ عادت نادیر ہی نے بنائی تھی۔ مگر تو کر کیے تے غزو کی..... آہستہ آہستہ میں اس غلامی کی عادی ہو گئی۔ اگر کبھی اتفاق سے ناصر یا ارسلان بھائی اچانک، ایسے آ

تو جی یادوں کے گلاب  
جاتے اور میں محن میں کام کر رہی ہوتی..... تو مجھے اونیچی آواز میں بات کرنے کا حکم تھا تاکہ ناہی  
اور اس کی بات کو اطلاع ہو جائے اور وہ اٹھ کر دکھاوے کے طور پر کوئی کام کرنا شروع کر دیتی۔  
ایک دن میرے کمرے میں آئی اور مجھ سے پوچھے بغیر میرے ڈرائنگ ٹیبل سے تمام اچھی اچھی  
چیزیں نکالیں اور مجھے آڈر لگایا کہ جا کر میں اس کی ڈرائنگ ٹیبل پر سیٹ کر کے رکھ دوں۔  
میں ڈراما نگار بنی تو سمجھ کر میرے چائے اس نے میرے گال پر ہمارا اور کہنے لگی۔  
"میری بات پر فوراً عمل کیا کرو۔"

مہینہ میں ایک آدھ بار میں ناصر بھائی سے گزارا لیتا رہتا تھا جو بھائیوں کے جانے  
کے بعد ناہی کے کمرے میں آ کر مجھے اس کے پرس میں خود ڈالنے پڑتے۔ اسی کا زیور بھی ناہی  
نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ بسا کے ساتھ جاتی تو کپڑوں کے ایک جیسے دو سوٹ لاتی..... لیکن  
مجھے یا سوٹ پہنا منع تھا۔ میرے کپڑے ناہی ایک دور لے بیٹھے کے بعد مجھے دینی دو پہر اور رات  
کا کھانا پکانا..... برتن اور کھان کی صفائی فرمیں کہ گھر کا ہر وہ کام جو کسی بھی وقت کیا جاسکتا تھا میری ذمہ  
داری تھا۔ کئی بار یوں ہوتا کہ رات دیر تک کپڑے استری کرتی رہتی۔

اکثر میں راتوں کو مجھے میں صبحا کر پھوٹ پھوٹ کر دیتی جس سے دل کا غبار کچھ ہلکا ہو  
جاتا۔ سب سے تکلیف دہ کام میرے لیے ناہی کے کمرے کی صفائی ہوتی جب وہ دونوں اس بجلی  
خود تو بنی محسوس کر سکتیں سے بیک لگا کر یا صوفے پر بیٹھی ہوتیں اور میں ان کے قدموں میں فرش کی  
صفائی کر رہی ہوتی۔ یہ موقع تقریباً روزانہ آتا اور روزانہ ہی میں اندر ہی اندر مٹھتی رہتی خاص طور پر  
جب دونوں طرف کے تیر بھی برسا رہی ہوتیں اور میری طرف دیکھ دیکھ کر ہنستیں۔ وہ اس وقت باقاعدہ  
مجھ سے نوکرانیوں والا سلوک کرتیں۔

پھر یوں ہوا کہ ایک دن میں واشنگ مشین لگا کر کپڑے دھونے میں مشغول تھی اور بلیس  
خالہ محن میں کام کر رہی تھی۔ ناہی کی ماں سیکڑ بخاری کچرے سے لیتی ہوئی تھی جبکہ ناہی کے کمرے سے  
موسیقی کی آواز ابھر رہی تھی یا اس کی روٹیں تھی کہ روزانہ جب سب چلے جاتے تو یہ پراوندی لیٹ  
کر ڈیک پر گائے سنتی اور موسیقی ویشن میگزین کی دہلی گردانی کرتی رہتی میں آ کر کمرہ کی صفائی و  
شیٹنگ کر دیتی۔

بلیس خالہ عام طور پر مجھ سے کم ہی بات کرتی لیکن اس روز بڑی اچانکیت سے میرے پاس  
آ کر کھڑی ہو گئی اور ایک تہہ کیا ہوا خط میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہنے لگی۔

تو جی یادوں کے گلاب  
"اس خط کو پڑھ لو..... انہوں نے دیا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ہمارے سامنے والے۔ کان  
کی طرف اشارہ کیا تو میں نے غبر اور ادبی طور پر نگاہ اٹھ کر دیکھا۔ ایک نہایت وجہ پڑا تھا۔ میری  
نظریں جیسے ہی اس کی آنکھوں سے ٹکرائیں اس نے آنکھوں میں انداز میں آداب کر ڈالا۔  
میں اس صورت حال سے گز پڑا تھی اور خط واپس بلیس خالہ کی طرف بڑھاتے ہوئے نہ نہ  
کے انداز میں سر ہٹانے لگی۔

"رکھ لو نا....." بلیس خالہ جھڑک کر بولیں۔ "جلدی کرو چھپاؤ اسے ناہی نے دیکھ لیا تو  
قیامت آ جائے گی..... اور ہاں اسے پڑھنا ضرور۔" یہ کہہ کر بلیس اپنے کام میں مصروف ہو  
گئی۔ میں خالہ ہاتھ میں پکڑے ہکا بکا رہ گئی اور پھر چور نظروں سے گیلری کی طرف دیکھتے ہوئے  
لغافہ تیزی سے چھپا لیا۔ میرا دل دھڑا دھڑا دھڑکنے لگا۔

رات تک نہ تو کوئی موقع ملا اور نہ جرات ہوئی کہ لغافہ کھولوں..... رات کو جب کمرہ بند کر لیا  
تو میں نے لرزے ہاتھوں سے لغافہ کھولا۔

"میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اسی مکان میں رہتا ہوں۔ یہ میرا اپنا گھر ہے۔ اہل  
اہل بی کر رہا ہوں۔ جواب کا خنجر ہوں۔"

خط سادہ کاغذ پر تھا۔ نیچے کوئی نام و پتہ نہ لکھا تھا۔  
خط پڑھتے ہی مارے خوف کے مجھے ہینسا آ گیا۔ اگر یہ خط بھائیوں یا ناہی کے ہاتھ لگ گیا  
تو..... کچھ بھی نہ کرنے کی پاداش میں میری زندگی کو اجڑا دیا گیا تھا..... یہ تو کچھ کولیئر میرے  
پاس تھا..... اور پھر جانے کب میں سو گئی۔ خط میں نے سونے سے پہلے منہ جال لیا۔

☆.....☆.....☆

پھر ایک دن میرے دل میں خوشی کی ایک کونہل بھوٹ پڑی..... میں گھر آ یا تو اسی عورت کو  
اپنے گھر میں کام کرتے دیکھا جو سامنے والے گھر "نصیر منزل" میں کام کرتی تھی۔ اسی نے بتایا کہ  
یہ اس بھائی کی بیٹی تھی میں رہتی ہے بڑی مشکل سے راضی ہوئی ہے کہ وہ پھر کے بعد آ کر رہے گی۔  
چار سو روپیہ ملے ہوئے۔

اب میں بہانے بہانے سے خالہ بلیس سے بات کرتا۔ بڑی ہی اچھی عورت تھی۔ مجھے پھر  
کی معلومات تھیں اس کے پاس مگر نہایت احتیاط سے بولتی کم کو بھی تھی۔ کئی سوال کرنے کے باوجود  
بھی ہوں ہاں سے زیادہ نہ بولتی جس سے مجھے مایوسی ہونے لگی۔ ابھی اسے کام کرتے ہوئے چند



ی دن ہوئے تھے کہ مجھے کہنے لگی۔

”بچے بچلے کا بل جمع کروانا ہے اکل مل کی آخری تاریخ ہے میں روپے کم ہیں۔“ میں نے کمال کر دے دیے۔

چند بیٹے اور گزر گئے۔ ایک بار پھر اس نے میں روپے مانگے۔ میں نے خاموشی سے دے دیے۔ اکثر دیکھتا کہ کام ختم کر کے جانے سے پہلے خالہ بقیس فرخ میں سے بچا ہوا پانا سامان، بھوسہ بھگڑے یا کوئی پرانا کپڑا لے جاتی۔ پھر یوں وہ بارہ دنوں کے بعد تیسری بار اس نے مجھ سے میں روپے مانگے تو مجھے حوصلہ ہو گیا۔ ثابت ہوا کہ یا تو بہت ہی غریب اور ضرورت مند ہے اور یا پھر نہایت لالچی عورت ہے۔

پھر ایک دن مجھے اس سے بات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ اتفاق سے اس دن تمام گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے۔ کہ خالہ بقیس کام کرنے آ گئی۔ میں جان بوجھ کر اس کے سامنے پرس سے پیسے نکال کر گنتے اور جھوٹ موٹ کوئی حساب کرنے لگا۔ سو سو کے کئی دو جن سرخ نوٹ دیکھ کر بقیس خالہ غیر محسوس انداز میں میرے قریب آ کر باتیں مکھڑنے لگیں۔ اور آخر وہ سنی اور گھر کی کوئی انتہائی مانی مجبوری بنا کر بچاس روپے کا تحائف کر دیا۔ میں فکس چلا کر کہنے لگا۔

”خالہ لگی دفعہ تو مجھ سے ادھار پیسے لے کر گئی ہے تاج تک راجس نہیں کیے۔“

میری بات سن کر خالہ میرے قریب ہی بیٹھ گئی اور لگی اپنی غریبی کا ذکر شروع کر دے۔ مگر ”اچھا چھوڑ خالہ میں نے لوہا گرم دیکھ کر ضرب لگائی۔ چھوڑ نہیں تیس روپوں کی بات۔ اگر تو میرا ایک کام کروئے تو میں تمہیں پانچ سو روپے دے سکتا ہوں۔“

”وہ کون سا بیٹا؟“ پانچ سو کی بات سن کر خالہ بقیس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

میں نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔

”یہ بے بیٹے والے گھر کی نوکرانی کے بارے میں کچھ جانتا چاہتا ہوں۔ جہاں تم صبح کام کرنے جاتی ہو۔“

”کیا جانتا چاہے ہو۔“ بقیس خالہ کی آنکھوں میں الجھن اور تذبذب کے آثار ابھرے۔

”نیکو کرو کہ ہے اس کے ماں باپ۔“ میں نے فضائی کہاں ہیں؟“

”نیکوں شاہد باوتم نے یہ جان کر کیا کرنا ہے؟“

”بس ہے ایک ضرورت۔“

”وہ دراصل بات یہ ہے کہ دیکھنا انہوں نے منع کیا ہوا ہے کہ دہار۔ مگر ملی کوئی بات کسی کو نہیں بتائی۔ ورنہ مجھے کام سے نکال دیں گے۔ اس گھر کی تنخواہ تیرے گھر کا فرائض پانا ہے۔ آٹھ سو روپے چوبیس گھنٹے دیتے ہیں۔“

”چلو کوئی بات نہیں خالہ میں دم سمیٹ کر پرس میں رکھ کر دے دیتے ہوں۔“

”جب پچھلا ادھار واپس کر دو گی تو پھر نیا ادھار دوں گا۔“ میں اٹھنے لگا۔

”اورے سنو تو بیٹا۔“ خالہ بقیس پریشان ہو کر بولیں۔ ”پانچ سو روپے بہت بڑی رقم تھی اور خالہ بقیس اسے کسی بھی قیمت میں کھانا نہیں چاہتی تھیں۔“

”میں تمہیں بتا تو دیتی ہوں۔ مگر۔۔۔۔۔ وہ بھر کر گئی۔ تم آگے کسی کو ذکر نہ کرنا ورنہ میرے لیے مشکل ہو جائے گی۔“ خالہ شاہد پریشان ہو گئی تھی۔

”دیکھو خالہ بات سیدھی ہے۔ وہ لڑکی مجھے اچھی لگتی ہے۔ تم اس کے حشمت مجھے جگ جگ بتاؤ گی تو پانچ سو روپے بھلا دوں گا۔“

”اس لڑکی کا نام ابرم ہے۔ اس کے ماں باپ فوت ہو گئے ہیں اور یہاں لوگوں کے پاس ہی رہتی ہے۔ خالہ بقیس نے گول مول جواب دیا۔“

”اس کے کوئی بہن بھائی؟“

”نہیں بھائی ہیں اس کے۔“

”وہ کہاں ہوتے ہیں کیا کرتے ہیں؟“

”وہ۔۔۔۔۔ اصل میں۔۔۔۔۔ دراصل۔“ خالہ بقیس گڑبڑانے لگی۔

”چھوڑ دے خالہ میں کسی اور سے پوچھ لوں گا۔ تیرے کن میں چور ہے تو مجھ سے پیسے بھی لینا چاہتی ہے اور بتانا بھی نہیں چاہتی۔ میرا تو خیال تھا کہ تجھے پانچ سو کے بعد پیسے اور بھی دے دوں مگر ٹو بے ایمان ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے پرس پینٹ کی جیب میں اس کا سا اور کچھ اٹھایا۔

”تمہو تو بیٹا۔“ خالہ نے میرا دامن پکڑ لیا۔ میں تمہیں ایک ایک لفظ جگ بتا دوں گی۔

”دیکھ تو مجھے جو کچھ بتائے گی میں اس کی تصدیق کروں گا۔ اگر وہ جگ نکلا تو مزید پانچ سو روپے تمہیں دوں گا۔ یعنی ہزار روپے تجھے ملیں گے۔ پانچ سو ابھی پانچ سو بعد میں اور اگر جھوٹ دلا تو پھر ٹو مجھے جانتی نہیں میں ایک ایک روپہ واپس وصول کروں گا۔“

”دیکھو بیٹا۔۔۔۔۔“ خالہ راز داری سے بولی۔ کسی سے ذکر نہ کرنا۔۔۔۔۔ واپس لوں گے بھی کان

تری یادوں کے گلاب

ہوتے ہیں۔ اس گھر میں نہ تو مجھے والوں کا آنا جانا ہے اور نہ یہ کسی کے گھر آنا جانا پسند کرتے ہیں۔ اس لیے کسی کو درست بات معلوم نہیں۔ اصل میں یہ لڑکی ارم جسے تم ملازم سمجھ رہے ہو یہ تو یہاں رہنے والے دونوں لڑکوں کی بہن ہے۔ ارم کی بھابی اصل میں پہلے تو کرائی تھی۔ دونوں ماں بیٹی تو کرائیاں تھیں۔ انہوں نے ایسا چکر چلایا کہ دونوں مالک بن بیٹھیں اور اس لڑکی کو بدنام کر دینے کے ڈرامے دے کر اس سے تو کرائیوں کی طرح کام کرائی ہیں۔

”کیا کبھی وہی ہو خال؟“ یہ انکشافات میرے لیے حیرت انگیز تھے۔ میں تو تنگ سی رہ گئی پھر میں کرید کر خال سے باتیں پوچھنے لگا۔ تو خال نے ایک ایسی اچھوتی کہانی سنائی کہ دماغ میں گرم ہواؤں کے جھگڑ چلنے لگے۔ خاص طور پر یہ کہ اس کے بھائیوں کو ساری صورت حال کا علم ہی نہیں۔ اور یہ کہ ان کے گھر میں جھوٹے آتے ہیں سب وہ نادان یا چکر چکری تھا جس نے درجنوں فون کروا کر لڑکی کی عزت خاک میں ملا دی تھی۔ میں نے قیافہ سوسو کے پانچ نوٹ سن کر خال کی تسلی میں دینے جھوٹا ہی اس نے چھپا لیے۔

”خال.....؟“ میں پچھنے ہوئے انداز میں بولا۔

”مجھے ساری کہانی الف سے ہی تنگ کج کج بتا دے ابھی تجھے پانچ سو روپے مزید انعام

دوں گا۔“

پھر خال نے بتایا کہ محلے کا ایک لڑکا اس کو فون کرتا ہے۔ ارم کے ہاتھ کے ٹکے ہوئے پرانے خط جو ارم نے ناویہ کی کبلی کو لکھ کر دیئے تھے وہ خود ناویہ نے مجھے دیئے تھے اور وہ ڈپاکے نوالے خور میں نے ہی کیے تھے۔ اس کام کے لیے ناویہ نے دو سو روپے مجھے اور تین سو روپے پیرا کو دیا تھا اور مزید باتیں بتاتے تھے۔

”دیکھو خال.....؟“ ساری کہانی سن کر میں لمبی سانس بھر کر بولا۔

”ٹو مر کے اس حصے میں جب کہ تیری ہاتھیں قبر میں ہیں۔ ارم کی زندگی برباد کرنے میں تمہارا بہت بڑا حصہ ہے۔ تجھے کیا ملا چند سو روپے؟ یا پھر بہت چند روپے اور بعد تجھے سو پچاس اور اسے دیتی ہوں گی۔ لیکن تو نے اپنی ماقبت تو خراب کر لی ہے۔ اب اللہ کو راضی کرو اور اپنی آخرت کی فکر کرتے ہوئے اپنی ماقبت سنوار لے۔ اس کا طریقہ یہی ہے کہ ٹو میرا ساتھ دے میں تجھے پیسے اتنے دوں گا کہ ٹو نے کبھی خراب میں بھی نہ دیکھے ہوں گا۔ میں ارم سے شادی کرنا چاہتا ہوں..... مگر ٹو میری اور ارم کی دوستی کرادے تو تجھے خوش کروں گا۔“

تری یادوں کے گلاب

اور پھر میں نے جلدی سے سادہ کاغذ پر ارم کے نام شادی کا بیٹام بھیجا اور لٹانے میں بند کر کے خال کو دیا۔ یہ خط اس کو میرے سامنے دینے کا سو روپے انعام اور اگر اس سے جواب نہ آئے تو مزید دو سو روپے انعام دوں گا۔

”ٹھیک ہے بیٹا..... کھل تم صبح ٹھیک بارہ بجے گیلری میں کھڑے ہو جانا اور دیکھتے رہنا میں خط اس کو دوں گی۔“

☆.....☆.....☆

ایک جھٹکے سے میری آنکھ کھل گئی۔ میرا وجود ہیبت میں ڈوبا ہوا تھا اور دل ایسے دھڑک رہا تھا کہ سینہ پھاڑ کر باہر آ جائے۔ خواب ہی ایسا دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میری سہاگ رات ہے اور وہی والا لڑکا جس نے خال بقیس کے ہاتھ سے خط بھیجا تھا وہ لمبے کے روپ میں میرا گھر ٹھٹھٹا نظر آ رہا ہے۔ اور پھر میری نیند ٹوٹ گئی..... حلق میں کانٹے سے چھو رہے تھے۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پانی بگ سے اٹھ پلا اور غٹا غٹ لپ گئی۔ اب نیند اڑ چکی تھی۔ وال کھا کی طرف نگاہ بھری تو پیہ چلا کہ صبح کے چار بجے ہیں۔ باہر جھانکا تو نہ پھوٹ رہی تھی۔ سب گھر والے سوئے ہوئے تھے۔ یہ کیا ہوا؟..... ایسا کیوں ہوا؟ اور پھر آہستہ آہستہ میں ناول پلٹی گئی۔ اٹھ کر دھوکا اور صبح کی نماز پڑھی اور اللہ سے دعا کہ ہوئی کہ میرے حال پر رحم کر۔ اور مجھے ان کی سازشوں سے محفوظ رکھے۔ اس کے بعد میں گھر کے کاسوں میں معرول ہو گئی۔

لیکن وہ رو کر مجھے خال بقیس کا خط دینا..... اس لڑکے کا آہستگی، خاموشی سے آداب کرنا اور رات والا خواب یاد آ رہے تھے۔ بار بار ذہن جھٹکے کے باوجود یہ باتیں جیسے میرے دل و دماغ سے چپک کر رہ گئیں۔ مجھے ایک بے قراری اور بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ ساتھ ساتھ میں لیکن میں صبح کے ناشتے کی تیاری کر رہی تھی۔ اسے میں آہٹ ہوئی دیکھا تو ناویہ کی امی سیکھتی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر نفرت کے آثار ابھرا آئے۔

”اسے لڑکی رات تا صبح تک کے کسی کام سے کراہی چلا گیا ہے۔ ارسلان، ناویہ اور میں آج کہیں چپک چارے ہیں۔ ناشتے کے وقت ارسلان تمہیں ساتھ چلنے کے لیے زور دے گا لیکن تم نے طبیعت خراب ہونے کا یا سوڑ نہ ہونے کا یا پھر کوئی بھی بات کہہ کر انکار کر دینا ہے۔ کبھی.....؟ تم ساتھ نہیں جاؤ گی.....“ سیکھ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔

”ہم شام تک آ جائیں گے اور سنوار سلطان جا گا ہوا ہے..... ناویہ اس کے کمرے میں



ہے۔ میں ناشتہ بنانے آئی ہوں۔ میں اپنے کمرے میں ہوں۔ تم ناشتہ بنا کر مجھے بتاؤ میں اوپر لے جاؤں گی۔ تم دو بار بعد میں آؤ گی۔" یہ کہہ کر کینٹ چلی گئی۔

میں کبیری سانس لے کر دو گئی۔ تھوڑی دیر میں خالد بلیس بھی کام کرنے آ گئیں۔ پھر میں نے دیکھ کر کیا جو یاد آیا اور اس کی ماں کی منشا تھی۔ ارسلان بھائی نے بھترنارود یا لیکن میں نے سو نہ ہونے کا بہانہ کر دیا اور پھر تقریباً ساڑھے گیارہ بجے وہ تینوں مری کھل گئے۔ گاڑی ارسلان چلا رہا تھا۔

میں سمجھ گئی کہ تادیب ناصر بھائی کی عدم موجودگی کا قاعدہ اٹھا کر ارسلان پر اپنی اداؤں کے جال پھینک کر اسے حریف اپنے سے قریب کرنا چاہتی ہے۔ ساتھ آج اس سے اچھی خاصی شاہک بھی کرے گی۔ بڑھاپا تو صرف اس لیے ساتھ گئی ہے کہ کوئی شک نہ کرے کہ "دوہر بھائی" کیسے کیوں نظر ہیں۔ ورنہ فرنٹ سیٹ پر تادیب ہی تھی۔ ان کے جانے کے بعد میں مرو دل سے اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ کرا چاک آہٹ ہوئی میں نے یکدم آنکھیں کھول دیں۔ میں کبھی خالد بلیس کسی کام سے آئی ہوگی۔ مگر پھر اچانک اپنے سامنے ایک نوجوان شخص کو دیکھ کر میری ہلکی سی چیخ نکلی تھی۔ یہ وہی نوجوان تھا جس نے کل اپنی ٹیلی سے مجھے آداب کیا تھا۔ اور خالد نے جس کا خط مجھے دیا تھا۔

میں بکا بکا تھی..... میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ ناصر کیسے آیا اور اب میں کیا کروں؟

پھر اچانک ہی ایک خیال بھیجاک خوف کی طرح میرے دماغ میں مزیت کرنا چلا گیا کہ کہیں یہ بھی تادیب اور اس کی ماں کی سازش تو نہیں..... کہیں وہ بھائیوں کے سامنے میری رہی سہی عزت کی دجیاں تو نہیں اڑانا چاہیں۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو پھر جیتنا تادیب کسی بہانے سے ارسلان کو لے کر فروری طور پر واپس ضرور آئے گی۔ تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے لیکن کو کسی نوجوان کے ساتھ دھک دلیاں مٹاتے دیکھ لے۔ یہ سوچتے ہی میرے پیروں میں جان نہ دی اور میں چکرار و حزام سے فرش پر گر گئی اور پھر مجھے ہوش نہ رہا۔

☆.....☆.....☆

چند منٹوں بعد میرے حواس بحال ہوئے تو میں اپنے بستر پر تھی۔ بید کے ایک طرف وہ نوجوان اور دوسری طرف خالد بلیس بیٹھی تھیں۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر دونوں کے چہروں سے اطمینان چمکنے لگا۔ ایک غیر مرد کو اپنے بیدروم میں دیکھ کر میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میرا نام شاہد ہے۔ میں آپ کے بالکل سامنے والے گھر میں رہتا ہوں۔ ایل ایل بی کر

رہا ہوں۔ مستقبل میں وکالت کا ارادہ ہے۔ اپنے والدین کا اگلا بیٹا ہوں۔ دو بھئی ہیں اور امی ابو ہیں۔ میں گزشتہ کئی ماہ سے آپ کو چیکے چیکے دیکھتا رہا ہوں۔ آپ کی بھولی بھالی صورت کو دل سے بیٹھا ہوں۔ کل ایک خط بھی آپ کو بھیجا تھا۔ آج خود حاضر ہو گیا ہوں۔ یہ سب خالد بلیس کی سرکاری ہے۔ حرف مدعا یہ ہے کہ آپ سے شادی کا خواہش مند ہوں۔ اس ساری بات میں نہ تو کوئی جکڑ ہے اور نہ ہی ہر پھیری میں اندھ کو حاضر با ظہر جان کر کہتا ہوں کہ آپ سے شش کرنا چاہتا ہوں مگر شادی کے بعد۔ اب آپ کی مرضی ہے کہ دل میں جکڑ مٹا دیتے فرما دیں۔ یا دھکا لیں۔"

"تم پھر اجازت اندر کیوں آئے ہو؟" میں حواس مجتمع کر کے بولی۔ "شادی کا بیٹھام دے۔" اچھا طریقہ نکالا ہے آپ نے اگر کوئی دیکھ لے تو میری کیا عزت رہ جائے گی؟

"اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ کی عزت کو اپنی عزت سمجھتا ہوں۔ اگر آپ قسم کریں تو ابھی اپنی شکل تم کر لیتا ہوں تاہم میری درخواست پر خود ضرور کیجئے گا۔ نوجوان کی خوب صورت کینٹنگ اور شاندار شائستگی سے میری زبان تنگ ہو گئی۔ میں چاہنے کے باوجود اسے جانے کا نہ کہہ سکتی اور اگر نکال دے تو کینٹنگ ہی۔ میری خاموشی سے اس کا حوصلہ بڑھا۔ "اگر آپ کہیں تو آپ کے بھائیوں کو رشتہ کا بیٹھام بھیجوں۔" اس کی اس بات کا جواب تو میرے پاس کوئی نہ تھا۔ میں نے نظریں جڑا لیں۔

"ایک کام میں دیر کا ہے گی یہ ضرور دیکھنا مگر اب چلو کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔" یہ خالد بلیس کی آواز تھی۔

اس کے جانے کے بعد بھی میں کافی دیر غم مہم رہی..... سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اب کیا ہو گا۔ میں نے خالد کو بلایا۔ اس نے بغیر حیل و حجت کے مان لیا کہ اسے میں ہی اندھ لاتی تھی۔ اس نے مجھے تہہ بالا نظر آ دینا۔

"مجھے کل سے ہی پتہ تھا کہ تمہارے گھر والے آج چلک پر جائیں گے اور تم بھییں رہو گی۔" اسے بیٹا میں تو کہتی ہوں رشتہ آئے تو قبول کر لیجئے..... ورنہ یہ ڈانسیں تو قطرہ قطرہ کر کے تمہارا خون پوس لیں گی۔"

اگلے ہی دن انکشاف ہوا کہ تادیب نے ڈرانے لگ سکول میں داخلہ لے لیا ہے۔ صبح دس بجے اکیڈمی کی گاڑی خاتون انٹرکمز سمیت ہار پک لینے آ گئی۔ اس کی ماں بھی ساتھ چلی گئی۔ پھر تو روزانہ ہی دونوں ماں بیٹی جج دھج کر چلی جاتیں۔ آج نہیں تیسرا دن تھا۔

تری یادوں سے گھر۔

اتوار کی وجہ سے دونوں بھائی گھر پر تھے۔ نادر اور اس کی ماں کو گھنٹے ہوئے ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہ تھا کہ ہماری تین لڑکیاں آگئی۔ خالد بقیس نے دروازہ کھولا..... آنے والے ایک مرد اور عورت تھے۔ پتہ چلا کہ شاہد کے والدین ہیں۔ خالد نے نادر اور ارسلان کو بتایا۔ مجھے چاہئے وغیرہ کی بات ہوئی۔ بھائیوں نے رشتہ کا بیچا من کر خاموشی اختیار کر لی۔ شاہد کی تعلیم ایل ایل بی چان کر رہا۔ کی خاطر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ مشورہ کیا..... پھر مجھے بلا یا۔ بات میرے سامنے کئی میں نے کہا جیسے آپ کی مرضی۔ دونوں اس معقول رشتے سے مطمئن نظر آتے تھے۔ خالد بقیس بھی وہیں موجود تھا۔ کہنے لگی۔ بیٹا انہوں نے ساری معلومات مجھ سے ہی لی تھیں..... میں تو کتنی ہوں تعلیم یافتہ و شریف اور خوشحال خلی ہے اتنا اچھا رشتہ نکل میرا تو مشکل ہو جائے گی۔

نادر بھائی کہنے لگے۔ "نادر سے کیوں یہ مشورہ کر لیں۔"

"اے ہے بیٹا ان کو تو ہاں کر دو..... محلے کے کئی اور لوگوں کی بھی اس لڑکے پر نذر ہے۔ نادر کو دونوں بھائی بعد میں بتا دیا۔ رشتہ سے خوش ہی ہو گئی..... پھر ارم بھی سن کر آپ کی بات نہ فیصلہ تو آپ دونوں نے کرنا ہے۔" بقیس خالد کی سیالی باتیں سن کر دونوں بھائی ایک دوسرے کو اشارہ کر کے اٹھے اور انہوں نے جا کر باہر کر دی۔

شاہد کے ابو منگالی لانے کے لیے جانے لگے تو نادر بھائی نے کہا۔ میری والدہ اس وقت گھر میں نہیں ہے۔ آپ ایسا کریں شاہد کو پا لے ہمارے ساتھ ہی جیسا وہ بھی آ جائے گی۔ چاہئے ہماری ابو منگالی آپ کی..... نادر بھائی کی بات سن کر سب ہنس پڑے۔

☆.....☆.....☆

خالد بھٹہ رنگ رہا ہے۔ کہیں نادر نے ہاں کر دی تو بھائی بھی انکار کر دیں گے۔ تم آج نہیں رنگ جاؤ۔ اور میں دونوں ماں بچی کی سن گئی۔ میں نے خالد سے کہا تو خالد اچانک رو پڑا۔ اسے روتے دیکھ کر میں چونکی۔ "اس میں رونے کی کیا بات ہے خالد؟"

"بیٹی....." خالد نے اچانک میرا سراپے پینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے ساتھ نہ کچھ بھی نادر اور اس کی ماں نے کیا ہے اس میں میں بھی برابر کی شریک ہوں۔ شاہد نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اب میں تمہاری مدد کر کے اپنے گناہوں کا گھاوا کرتا جا رہی ہوں۔ خالد کی بات سن کر میں حیران ہوئی۔ لیکن پھر خالد نے مجھے شاہد سے ملاقات کی تمام باتیں سن و سن سنائیں آ میرے دل میں شاہد کی عزت اور محبت نے مزید سر اٹھایا اور خالد باپسیوں کے گناہوں پر اندھیر۔

تری یادوں سے گھر۔

میں روشنی کی کرن دکھائی دینے لگی۔ ایک بیچے کے قریب نادر اور اس کی ماں انہیں آگئیں۔

وہ بیچرے کھانے پر جب نادر بھائی نے انہیں ساری بات بتائی تو وہ چونک پڑیں اور ایک دوسرے کو کون انکھیں سے جو بکھا..... میں اسی وقت میں نے خالد اور خالد نے مجھے دیکھا۔ نادی کی ماں کہنے لگی۔ بھئی تمہاری بہن ہے تم نے ہی فیصلہ کرنا ہے اور ساتھ پہلو میں بھی نادی کے پاؤں پر اچھا پیڑا کرنا ہے خاموش رہنے کی وجہ سے اس کی اس حرکت کو میں نے بھی نوٹ کیا اور خالد نے بھی۔ کھانے کے بعد میں بیچے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کیونکہ چھٹی والے دن بھائیوں کے سامنے مجھے نادر کا کام کرنے کی ضمانت ہوتی تھی۔ ارسلان اپنے کمرے میں گھس گیا۔ نادر اور نادی اپنے کمرے میں قیلولہ کرنے لگے۔ نادی کی ماں بھی بیچے اپنے کمرے میں آ گئی۔ جو میرے کمرے سے ایک کمرے کے فاصلے پر تھا۔

مختصر پھر گزر رہا ہوں گا۔ نادی میری جیسا آرتی نظر آتی وہ سیدھی اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ بقیس خالد بھی کام کے بہانے کمرے کے گرد منڈلانے لگی۔ میرا دل جیسے لگا۔ نادی کا اس پر سراہا طریقہ سے ماں کے پاس آنے کا مقصد یقیناً کسی نئی سازش کے تانے بانے بنا تھا..... ایک ایک منٹ میرے لیے ہماری بوریا تھا۔ پندرہ منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ خالد بقیس میرے پاس آ گئی۔ آتے ہی کہنے لگی۔ ارم بیٹی کوئی نا اگل کھلانے والی ہیں یہ دونوں۔ میں ان کے کمرے میں کام کر رہی تھی کہ نادی نے آ کر مجھے باہر جانے کو کہا لیکن میں ان کی کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر ان کی باتیں سننے کی کوشش کرتے تھی۔ لیکن صرف یہ ہی سن پائی ہوں کہ اس بیٹی سے کہہ رہی تھی کہ جب تک یہ پر کئی طوٹی اس گھر کے باغچے میں بند ہے گی سب ٹھیک رہے گا۔ جیسے ہی اس کی شادی ہوئی یہ سب ہی آنکھیں دکھانے لگے گی اور ایک ایک کر کے سب نیچر میں توڑتی چلی جائے گی۔

"اور کیا بنا خالد....." میری بے تابیاں دینے لگیں۔

"کچھ بھی نہیں..... اس کے بعد وہیں ماں بچی کی آوازیں مدھم مدھم ہو گئیں اور وہ سر نہ جھڑ کر کھڑے پھر اور کا ناچھوئی کرنے لگیں۔"

ابھی خالد بات کر رہی تھی کہ باہر قدموں کی چاپ ابھری جو یقیناً نادی کی تھی۔ خالد جلدی سے میرے درمیان ٹھیک کے پاس جا کر وہ سلیٹنگ نکال کر نہ پر پڑنے لگی۔ میں نے پشت کے مل سیدھی لیٹنے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

"خالد تم کیا کر رہی ہو یہاں؟ ابھی گئی نہیں؟ اور ابھی جانا بھی نہیں اور پھر میری میں جا کر بیٹھو



مجھے تم سے کوئی کام ہے..... میں آتی ہوں۔"

"اچھا جی....." اچیس خالہ کمرے سے نکل گئی۔

نادیہ نے زور سے مجھے بلایا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔

"آنکھ کر بیٹھو....." وہ تھکسا نہ لہجے میں غلاب ہوئی۔ میں بیٹھ گئی۔

"شام کو رشتہ والے دو بارہ آئیں گے تو تم نے اس کو رانی ہے۔"

"عمر کیوں بھالی.....؟" میرے دل میں ہول اٹھنے لگے۔

"صرف اس لیے کہ یہ میرا حکم ہے..... یہ نہ ہو کہ اور حسب لوگ چائے پی رہے ہوں اور

گلی میں تہہ باری تصویریں اور فطوطا پانے جا رہے ہوں۔"

"لیکن بھالی..... اتنا ظلم تو نہ کرو..... میں نے آپ کی ہر شرط پر عمل کیا اور یہ بات شرط میں

شام نہیں تھی۔"

"نہیں تھی تو آج سے شامل سمجھو اور اپنی بکواس بند کرو۔" نادیہ نے تھپڑ کھینچ مارا۔

اگلے دس سال تک شادی نہیں کرو گی۔ جس وقت وہ چائے پی رہے ہوں گے ہاں بھالی تم سے

تہہ باری مرضی کا پوچھیں گے۔ تو تم نے مضبوط لہجے میں لڑکے کو دیکھنے کی خواہش کرتی ہے۔ کوئی سا

بھی اس میں ایسا شخص نکال لینا۔ جس سے لڑکے یا اس کے والدین کو نفرت آجائے مثلاً اگر گرج

سا نولا ہے تو قد چھوٹا ہے تو..... قد زیادہ لمبا ہے تو..... کوئی بھی شخص اور یہ شخص تم نے خود سوچنا

ہے....." اور پھر نادیہ چلی گئی۔

نہیں کمال پر ہاتھ رکھ سکتے کے عالم میں تھی۔ میں سمجھتی کہ نادیہ اور اس کی ماں میری زندگی

مکمل تباہ کر کے چھوڑ دیں گی۔ ابھی میں سوچوں میں کہ تھی کہ بیڑیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ

بنائی دی۔ میں جان گئی کہ خالہ اچیس بیچے اثر دے رہی ہوں گی۔ کیونکہ نادیہ نے اس کو اوپر بھیجا تھا۔

میں آنکھ کر صحن میں آئی تاکہ خالہ سے کوئی بات کر سکوں لیکن نادیہ اوپر گیلری سے دیکھ رہی تھی۔ نادیہ

کی موجودگی میں مجھے خالہ سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ خالہ بھی ایک طاغرانہ نظر چھوڑا دیتے

ہوئے گیت کھول کر چلی گئی تو نادیہ نے اشارے سے مجھے گیت بند کرنے کو کہا۔ میں گیت بند کر

کے چلتی۔ دیکھا تو نادیہ ہانچتی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آ کر ستر پر گر گئی۔ اور سستے گئی لیکن پھر کسی

آہستہ کو پا کر چلتی یہ نادیہ کی ماں تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو کچھ کر سکتے تھے۔

"یہاں سوتے نہ بہا..... اور آنکھ کر گین صاف کر اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا۔

"شام کو مہمان بھی تو آئے ہیں۔" طہر کے شکر کا کردہ بھی نکل گئی۔ میں بھر دے لگی۔

☆.....☆.....☆.....

تھوڑی دیر بعد آنکھوں سے پانی صاف کر کے اٹھی اور کچن میں چلی گئی جہاں ناشتے اور

دو پھر کے کھانے کے گندے برتنوں کا ڈھیر لگا تھا۔ چپ چاپ کام کرنے لگی۔ نادیہ دیر نہ گزری

تھی کہ ادیا آ گئی..... آتے ہی کہنے لگی۔

"جلدی سے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جا..... میں کام کرتی ہوں۔" اس کی اس

بات سے میں جی حیران ہوئی۔ لیکن نادیہ کا حکم تھا۔ مجھے جانا ہی تھا۔ میں کمرے کے باہر ہی

برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ چند ہی منٹوں بعد مجھے ہاں بھالی اپنے کمرے سے نکل کر آتے

نظر آئے۔ مجھ سے تو کوئی بات نہ کی البتہ گاڑی نکالنے لگے۔ ان کے جانے کے بعد نادیہ نے سی

گیت بند کیا اور میرے پاس آ کر لیٹی۔ وقفہ ختم! اب جا کر کام کرو..... یہ کہہ کر وہ ہنسی ہوئی

سیڑھیاں چڑھ گئی۔ میرے دیکھنے ہی دیکھتے وہ اپنے کمرے کے بجائے ارسلان کے دروازے پر

دھک دینے لگی۔ دھک دینے کے بعد وہ چلتی مجھے دیکھا جس کربالوں کو طہر یہ انداز میں نخرے سے

جھکا اور مجھے سامنے سے بہت جانتے کہ کہا۔ میں حیرتی سے اپنے کمرے میں گھس کر کونڑی میں آ کر

کونڑی ہو گئی جس کے باہر جانی گئی تھی۔ لیکن اندر سے سب تھوڑا نظر آتا تھا۔ میرے دیکھنے ہی دیکھتے

ارسلان نے دروازہ کھولا۔ نادیہ کو تھوڑے تھوڑے ان ہونے لگا تھا کہ نادیہ نے ہانپیں وا کر دیں اور اونچی

آواز میں پشنے لگی۔ ارسلان کچھ بکھو نہ پایا تو نادیہ نے بے انگلی سے اس کے کان میں کچھ کیا تو

ارسلان نے نادیہ کو کمرے سے پکڑ لیا۔

☆.....☆.....☆.....

شام چھ بجے کے قریب مہمان آ گئے۔ شام کے اوی اور اس کی بیٹھیں پاکیزہ اور حسین

انتہائی ماریت اور حیرت آمیز طرز پر پڑکشش تھیں۔ نادیہ چہرے پر شکر آہستہ بجائے استقبال کرنے

گئی۔ اس نے چاکا سٹک کا سفید ٹراڈر سوت ڈیپ تن کر رکھا تھا جس کے کرتے پر پڑ پڑ کلک کا مڑوا

تھا۔ پڑ پڑ کلک کا دو پندہ شانے سے ڈھکا رکھا تھا۔ اونچی میل والے سرخ یہندلوں میں پڑکشش

نظر آتی تھی۔

ڈرائنگ روم میں مہمانوں کو بٹھایا گیا۔ وہ اپنے ساتھ سفلی کی چھوٹی سی نوکری بھی لا گئے

تھے۔ خالہ اچیس بھی آ گئی۔ لیکن خالہ اچیس چائے وغیرہ تیار کرنے لگیں۔ ارسلان بیکری سے کچھ

تری یادوں کے گلاب

”اگلے ارجم اب آپ کی بیٹی ہے جب چاہیں اسے لے جاسکتے ہیں۔“ ناصر نے سعادت مندی اور سلیجے ہوئے لہجے میں کہا تو نادیا نے گہری نگاہوں سے ناصر کو دیکھا۔

”تو پھر ٹھیک ہے۔“ پاکیزہ تیزی سے بولی۔ ”نیکسٹ فرائی ڈے ون ہو گیا۔ ارجم آج سے ہماری بھائی ہے۔“ میں دانتوں کی طرح جھنجھی گئی۔ مجھے یہ سب کچھ غراب مانگ رہا تھا۔

اگلے دن ناصر بھائی گھنٹی پر تھے۔ لیکن نادیا اور اس کی ماں آرائی ٹیگ انسٹرکٹر کے ساتھ چلی گئیں تو ناصر بھائی میرے کمرے میں آ گئے۔ ان کو اچانک سامنے پا کر میں جہان بھی ہوئی اور پریشان بھی۔ دو چند لمبے ارداز سے مجھے غور سے دیکھتے رہے اور پھر گھمبیر خاموشی سے میرے سامنے آ کر بیٹھ گئے۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا کباب کیا بات کریں گے؟

”ارسلان ارسلان کیا آپس میں کیا چکر ہے؟“ غصہ غصہ لہجے میں انہوں نے سوال دیا۔ اس غیر متوقع سوال کو سن کر مجھے کچھ نہ آئی کہ کیا جواب دوں۔ میں خاموشی سے ان کا منہ دیکھتی رہی۔

”میں کیا پوچھ رہا ہوں؟ کچھ جانتی ہو؟“

میں پھر بھی خاموش رہی۔

”ابھر دیکھو میری آنکھوں میں.....“ انہوں نے سخت انداز اختیار کرتے ہوئے اپنی آنکھ سے شہادت سے میرا چہرہ اوپر کیا۔ ہماری آنکھیں چارہ ہوئیں وہ بغور میری آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ مجھے ان کی آنکھوں میں دشت آجی محسوس ہوئی۔

”کچھ جانتی ہی نہیں یا بتانا نہیں چاہتی ہو.....؟“ ان کا سخت انداز غراہٹ میں تبدیل ہونے لگا۔ میں ڈر محسوس کرنے لگی۔ میں ان سے نظریں جدا کرنا چاہتی تھی۔ مگر کوشش کے باوجود اپنی نگاہوں کا زور یہ تبدیل نہ کر سکی۔

مجھے گنگ رہا تھا کہ واصل مذاق قائم جانے بغیر نہیں گے..... لیکن پھر مجھے ناچہ کی دھمکیاں یاد آ گئیں..... میری آنکھیں نم ہونے لگیں..... بچہ نے پانی سے مہرنے لگے..... میرے ہونٹ ہلچل گئے..... میں سسکتی گئی۔

”تم جانتی ہو.....“ ناصر بھائی چیخے۔ ”سب جانتے ہیں۔“ ان کی آواز پھٹ گئی۔

”بتاؤ..... جلدی سے بتاؤ.....“ وہ تنہا راکھ کھونٹ دوں گا یا پتا سر دیا جا رہا ہے دے ماروں گا۔“

”ناصر..... بھائی.....“ میں زور سے جھنجی اور بھائی سے پٹ گئی۔ میرے حواس پر

تری یادوں کے گلاب

لینے چلا گیا۔ میں نے کپڑے تبدیل کر کے بکا سائیک اپ کر لیا حالانکہ احمد سے دل غمناک ہوا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ نادیا سارو کچھ کر دے گی کہ ایک بار پھر ارم سے پوچھا جائے اور مجھے انکار کرنے کا پابند کر دیا گیا تھا۔ اور پھر ارسلان نے کون سی نادیا سے ہٹ کر بات کرنی تھی میرا دل بھرا ہوا تھا۔ میں بھی مچن میں ہی تھی۔ خالہ ایتیس کسی بہانے سے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ڈرائنگ روم سے ڈراؤنچی آواز سنائی دی۔ پھر شاہد کی اوی نے مجھے ارانگ روم سے نکل کر باہر جاتی نظر آئیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی۔ چند منٹوں بعد وہ وہاں آئیں تو شاہد بھی ان کے ہمراہ تھا۔ نادیا کی اوی کچن میں ہی رہیں اس نے ڈرائنگ روم میں جانے کی کوشش ہی نہ کی۔ شاید اسے اپنی بیٹی پر پورا اعتماد تھا۔

اور پھر ایتیس خالہ آئیں اور مجھے چائے لے کر جانے کی ہدایت کی۔ اس کا چہرہ سیاہ تھا۔ میں نے دو چند اوزھا اور چائے کی غولی ڈرائنگ روم میں لے کر پہنچ گئی۔ چائے رکھ کر آنے لگی تو ناصر بھائی نے مجھے اپنے پاس ہی بیٹھنے کی ہدایت کی۔ سب چائے نوش کرنے لگے۔ مجھے غم تھا کہ چائے پینے کے بعد ناصر بھائی مجھ سے کیا سوال کریں گے۔ نادیا نے اسی لیے شاہد کو بھی بلوا لیا تھا۔ میں نے ایک دو بار شاہد کو طائرانہ نظر سے دیکھا کہ کیا نقص نکالوں۔ وہ قدرے غلغل ہوئی رگھت کا ہونے چوٹ کا محنت مند اور خوبصورت نوجوان تھا گنتی سو گنتیں ہلکی ہلکی رہی تھیں۔ جڑھا نکھلا تو وہ تھا ہی نکھلا بھی سن بھی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا کہہ کر سب کے سامنے انکار کروں گی۔ میرے پاؤں لرزنے لگے۔ مجھے ہاتھوں پر غصہ محسوس ہوا تھا کہ اچانک شاہد کی اوی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور میری طرف بڑھیں ناصر بھائی نے ان کے لیے جگہ خالی کر دی۔ بیٹھنے ہی انہوں نے ڈیہ کھولی۔ اس میں سے اچھوٹھی نکالی اور میرا ہاتھ پکڑ کر پتا دی۔ سب نے مبارک مبارک کہا۔ نادیا خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔ پھر اسے کچھ خیال آیا تو اس نے یکدم مسکراتے ہوئے پہلے شاہد کو اور پھر مجھے مبارک باد دی۔ میری تو کھدائی ہی پٹ پٹا ہو گئی تھی۔

سب کچھ میری توقعات کے برعکس ہوا تھا۔ ناصر بھائی نے تو مجھ سے میری مرضی دوبارہ پوچھی ہی نہیں تھی۔

”میرا خیال ہے نیک کام میں از نہیں ہونی چاہیے۔ میں شادی کو سادگی سے کرنے کا قائل ہوں۔“ یہ شاہد کے ابو تھے۔ مکے کے چند اطرا اور چند رشتہ داروں کی موجودگی میں جمعہ المبارک کو اس فرخ کواد کر دیا چاہیے۔



تری یادوں کے گھر

تارکیاں چماتے تھیں۔ میرا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ ناصر بھائی نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔  
 ”اس بے چاری سے کیا پوچھتے ہو ناصر میاں..... اس کی زبان پر تو بیک میٹنگ کے نام لگے ہیں۔“ یہ خالد بقیس کی آواز تھی اور پھر میں بے ہوش ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

اوش آقا اپنے بستر پر تھی خالد بقیس مجھ پر ہلکی میرے گال چھینتا رہی تھی..... کمر..... من شہر تھا..... چند سیکنڈ میں نہیں پورے خوابوں میں واپس آ چکی تھی۔ دیکھا تو ناصر بھائی اور ماران دھار کے ساتھ لگا کے مار رہے تھے۔

”بھول..... بول..... تجھے جان سے مار دوں یا خود کشی کر لوں.....“ صورت حال کو بھانپتے ہی میں ہلکی سی تیزی سے اٹھی اور جا کر ناصر بھائی کا ہاتھ روکے گی۔ لیکن وہ تو پاگل ہو چکے تھے۔ چائے، ٹھنڈے، گھونٹے، ملا تھیں سب کچھ اور سلطان پر آزار پہ تھے۔ لیکن اور سلطان صرف خاموشی سے ہٹ رہا تھا۔

میں دونوں بھائیوں کے درمیان آ کر کھڑی ہو گئی جس سے اور سلطان کے بجائے میں پٹے لگی۔ ”آپ کا اللہ کا واسطہ بھائی جان میں نے ہاتھ جوڑ دیئے۔“ میں نے انہیں کچڑا پاپا تو انہوں نے مجھے اتنے زور سے دھکا دیا کہ میں زمین پر گر گئی۔ ادھر ادھر دیکھا تو بقیس خالد کہیں نظر نہ آئی۔ میں پھر اٹھ کر دوڑی لیکن ناصر بھائی تیزی سے باہر نکل گئے۔ میرے ہاتھ پاؤں بھولنے لگا۔ کچھ نہیں آ رہی تھی کیا کروں۔ اور سلطان سر پہوڑا لے کھڑا تھا۔ اسے تو چپ سی لگ گئی تھی۔

اچانک باہر سے دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ دیکھا تو شاہد اور اس کے ابو آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے شاہد کی امی اور خالد بقیس تھیں۔ شاہد وہی ان کو بلا کر لائی تھی۔ اسنے میں ناصر بھائی کا ہاتھ پکڑ لے کر آگے اور گرے.....

”ہٹ جاؤ سب..... میں گولی مار دوں گا اسے۔ جان سے مار ڈالوں گا اسے..... اس کو شرم نہیں آئی..... بھائی کی عزت سے کھیلے ہوئے.....“ صورت حال سمجھیر دیکھ کر میں اور سلطان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ شاہد ناصر بھائی سے پلٹ گیا، لیکن وہ تو کسی طور پر قابو میں ہی نہ رہے تھے۔ یقیناً خالد بقیس نے انہیں اور سلطان اور نادیہ کے قتل کے بارے میں بتایا ہوگا جس سے وہ آپے سے بی باہر ہو گئے۔

بڑی مشکل سے شاہد اور اس کے ابو نے ناصر بھائی کو کنٹرول کیا اور صوفے پر بٹھا لیا لیکن ان

تری یادوں کے گھر

کے منہ سے جھانک اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ بقیس خالد خلدی سے پانی لے کر کمر گئیں۔ شاہد نے انہیں پانی پلایا جس سے انہیں قدرے سکون آیا۔ تو شاہد نے بائیں آہنگی سے ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ اچانک اور سلطان کے گم سم وجود میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ تیزی سے چلے ہوئے۔ بھائی ناصر کے پیروں سے پلٹ گیا۔ ”بھائی جان مجھے معاف کر دیں..... میں آسمان کا بھرم ہوں..... جو چاہیں مجھے سزا دیں۔ جان سے مار دیں یا گھر سے نکال دیں۔“ اور سلطان زار و تھار دھونے لگا۔ اب گم سم ہونے کی باری ناصر بھائی کی تھی۔ انہوں نے اور سلطان کو کوئی جواب نہیں دیا۔ شاہد نے اور سلطان کو فرش سے اٹھا لیا اور صوفے پر بٹھایا۔ چند لمحوں کے لیے عین خاموشی میں تھی۔ اور سلطان پھر رونے لگا۔ ناصر بھائی کسی سوچ میں گم تھے۔ گہری سوچ میں..... جیسے کسی نتیجے پہنچ جانے کی کوشش کر رہے ہوں۔

”دیکھو جانا“ شاہد کے ابو بولے۔

”مجھے تو کچھ پتہ نہ تھا کہ اس گھر میں کیا ڈرامے کھیلے جا رہے تھے۔ چند دن پہلے شاہد زبانی اور پھر بقیس سے پتہ چلا۔ تو ان ماں بچی کے گھٹاؤ نے پھرے سامنے آئے جو تینوں بڑے بھائیوں کا خون ہونکوں کی مانند چس رہی ہیں۔ ناصر بیٹے..... اب بہتر یہ ہے کہ ان کے آنے۔ پہلے ماحول کو تامل کر دیا جائے تاکہ انہیں فی الحال پتہ نہ چلے۔ باقی میرا تو مشورہ ہے کہ تم دونوں بھائی اتفاق سے رہو..... اور سلطان نے خاموشی سے مار کھا کر اور پھر برا ملا و سزا ف کھا کر سعادۃ مندی کا ثبوت دیا ہے۔ بہتر اسی میں ہے کہ تم بھی اسے معاف کر دو رہی بتا رہی باتے شاہد ہمارا واحد بیٹا ہے۔ اس نے کبھی بے جا ضد نہیں کی اور ہمیشہ خوب صورت اور درست فیصلے دیتے ہیں۔ اور تم کو ہماری بیوہ بنانے کا فیصلہ بھی یقیناً بہتر ہے۔ ہمارا اس مسئلے میں کوئی اثر نہیں ملے گا۔ یاد یہ کہ معاملہ تیار اندرونی معاملہ ہے۔ اس پر آپ مل جل کر فیصلہ کریں اور اس سارے معاملے کو ریڈ ہتھیں سے جاتا ہے جس کو اس پر چاہے میں اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا اور ابھی دوسرا طریقہ تھا جس سے وہ اپنے گناہوں کو بخشوا سکتی تھی۔“

”مم..... میں آپ کا شکر گزار ہوں اگلے!“ ناصر بھائی بھی ہلکے بولے کہ ”آپ سارا صورتحال جاننے کے باوجود بھی اپنے فیصلے پر قائم ہیں۔“ ناصر کی بات سن کر شاہد نے آگے بڑھ کر ناصر کا شانہ چھینچا لیا اور کہنے لگا۔

”چلو اب دلوں بھائی مجھے ملو..... کہ اسی میں اس گھر کی جگہ ہے۔“ شاہد کی بات سن کر

تری یادوں کے گلاب

ارسلان اپنی جگہ سے اٹھا اور پھر بڑے بھائی کے قدموں میں بیٹھ کر رونے لگا۔ ناصر چند لمحوں سے گھورتا رہا۔ اور دونوں بھائی کچھ لگ کر رونے لگے۔ میں بھی بھانجیوں سے پلٹ گئی۔ تینوں بہن بھائی چٹکیاں لے لے کر رونے لگے۔ خالد بھیس اور شاہد کی امی بھی چادر کے پلوں سے پلوں کے پھٹے ہوئے صاف کرنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد خالد بھیس چائے بنا لائیں۔ پیالیوں کی کھٹک اور چائے کی بھاپ سے ماحول کا کھنکھار کم ہو گیا۔ چائے پی کر شاہد اور اس کے والدین چلے گئے۔

ناصر بھائی مجھے اور ارسلان کو کچھ ہدایات دینے لگے اور پھر آگے پیچھے ہو گئے۔ خالد اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ جتنی یہ عورت مجھے ذہنی ترقی تھی اب مجھے اس پر اتنا ہی پیار آنے لگا تھا۔

ارسلان اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں لیجن میں ناویہ اور اس کی ماں کے لیے کھانا تیار کرنے لگی۔ گھر کا ماحول ہر طرح سے ڈھل کر رہ گیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ وہ دونوں آ گئیں۔ وہ گاڑی سڑک اور ڈرائیونگ کی باتیں کر رہی تھیں۔ ناصر بھائی کو نہ پا کر ارسلان سے ناویہ نے پوچھا جہاں ابھی غسل خانے سے نہا کر نکلا تھا۔

وہ کہنے لگا کہ..... اسی دوست کا جو فون آتا تھا ملے گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ کھانا کھا کر آؤ گے۔ ہاتھیں کرتے ہوئے ناویہ بھی ارسلان کے کمرے میں چلی گئی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ناویہ اور

ارسلان کی آواز میں گیلری سے سنائی دیں۔  
"کب تک آؤ گے؟"

"مختصر بیڑہ تو لگے گا بھائی۔"

میں اوٹ سے بھاگی تو دیکھا کہ ناویہ، ارسلان کا چہرہ ہاتھوں سے تھامے مسکرائے جا رہی تھی اور پھر ارسلان بیٹی بھاتا ہوا بیڑہ صبا آئے اور گیٹ کھول کر چلا گیا اور ناویہ ہم جگم کرتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس کے بعد گھر میں ناہ چھا گیا پندرہ منٹ مزید گزر گئے۔ میں کھانا تیار کرنے کے ساتھ ساتھ چائے کے برتن بھی دھو رہی تھی۔

"ارم..... ناویہ کی آواز اپنے کمرے سے ابھری۔  
"مئی بھائی۔"  
"کھانا.....؟"

تری یادوں کے گلاب

"بس دس منٹ میں لاری ہوں بھائی۔"  
"پہلے مری ہوئی ہوئی ہے؟ ٹائم دیکھا ہے۔ دو بج رہے ہیں۔" ناویہ کی سریلی پاٹ دہر

تھیلی آواز ہوا کے دوش پر لہرائی۔  
"ابھی لائی بھائی۔ بس چند منٹ۔"

"جلدی نہ..... بھوک سے جان نکل رہی ہے۔"  
پھر جلدی جلدی میں نے کھانا ٹرے میں سجایا اور دو پیکروں میں تمام برتن اوپر لے گئی۔

دونوں ماحولیاتی ڈانٹ بھیل پر بیٹھ کر یوں تناول فرمائے گئیں جیسے ان کے باپ کا گھر ہوا اور میں ان کے آس پاس منڈلاتی رہی۔ ایک ملاؤم کی طرح تاکتا نہیں سروس دے سکوں۔ کبھی پانی کا گلاس

پھر کرپیش کر رہی تھی اور کبھی دوڑ کر بکس سے ٹک لاری تھی..... کبھی کوئی ڈانکا آگے کر رہی تھی..... دیکھتی آنکھوں اور سننے کانوں نے ملاحظہ کر لیا کہ ان مہرور اور لقب زن ملا بیٹی نے ایک بار بھی

سکے منہ سے مجھے یہ نہ کہا کہ تم بھی آؤ بیٹھو..... کھانا کھاؤ۔  
کھانے کے بعد میں فریج سے نکال کر نکلتا ہوا پلیٹ میں سجایا ہوا فروٹ لے آئی اور ان کی

خدمت میں پیش کر دیا۔  
اب ناویہ کھل طور پر میری طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ سب کی کاش منہ میں رکھتے ہوئے اس

کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں میرے چہرے پر جم چکی تھیں جیسے کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر اس کے چہرے پر کڑنگلی اور نفرت کی آمیزش سے پُر غور تاثرات ابھرے اور وہ پھر سے یقین اور

احقاد سے گویا ہوئی۔  
"آج تم اس رشتے سے انکار کر دو گی....." یہ بات کہتے وقت اس کی آنکھیں میرے

چہرے کو بڑھادی تھیں۔  
"لیجن بھائی....." میری زبان قہر خورانی..... "مگر کیوں.....؟"

"اس لیے کہ میں نہیں چاہتی کہ فی الحال تم اپنا گھر بناؤ۔"  
"لیکن آپ کو کیا نقصان ہے بھائی؟"

"یہ میں تمہیں بتانے کی پابند نہیں ہوں..... اور یہ تم ابھی طرح جانتی ہو..... کہ میری بات پر عمل نہ کرنا تمہارے لیے کس قدر نقصان دہ ہو سکتا ہے۔"

"لیکن بھائی آپ نے کہا تھا کہ بیاباھ سے سب کے سامنے ایک بار پھر میری مرضی



ترکی بیادوں کے گلاب

کرتے نہ پائی۔۔۔ اس کا منہ کھلے کا کھٹارہ مہیا..... کیوں..... کہ  
 دروازے میں ناصر اور ارسلان دونوں کھڑے تھے تو زلفیروں سے ناویہ اور اس کی ماں کو  
 محسوس رہے تھے۔ ناویہ کی ماں بھی یہ صورتحال دیکھ کر شہنشاہ کر رہی تھی کہ گیسٹ تو اندر سے بندھوا۔ یہ  
 دونوں کس وقت اور کیسے آئے۔

”ہم صبر..... آ آ..... پ۔“ ہمارے یہی زبان میں جھلکا ہٹ آگئی۔

”یہ بے دلوں سے تمہارے اس ادارے کی نین گھن محسوس کر رہا تھا۔“

”ہاسر چٹا۔“ ہادی کی ماں تیزی سے ہاسر کی طرف بڑھی۔ ”آج بچے نہیں ان دونوں کو کیا ہوا۔ کھانے کے دوران لڑ پڑیں..... میں بڑی دیر سے ان کو چپ کروا رہی تھی۔“

”بٹ جاؤ بے غیرت عورت!“ اور سلطان نے پوری قوت سے تھپڑ لگنے کے منہ پر مارا۔

”ارسلان.....!“ تاویہ دانت چست ہوئی ارسلان کی طرف چلی۔ لیکن ہنصر بھاگی نے اسے بانوں سے پکڑ لیا اور دھینکا شروع کر دیا۔ اچھی طرح ناک منہ سماتنے کے بعد اس کو چھوڑا۔ اور ارسلان نے یکے کو دو چار ہاتھ جوڑ دیئے جس سے دونوں ماں بیٹی کا رہتہ نہ لکھی پڑی چونک کر سہلے نکل گئے۔

”اب اس گھر میں رہنے کا قسم ہاں بنی گا کوئی جواز نہیں..... تمہاری ساری محنتوں ہم دونوں نے خودی ہی اور جس طرح تمہاری بہن کو بیک میل کر کے اسے نوکرائی بنا کر دکھا ہوا ہے وہ منظر بھی آنکھوں سے دیکھ لیا۔“

”اب میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں ناد یہ کہ تمہیں اسی وقت طلاق دے کر فارغ کر دوں۔ چلو..... اٹھو..... اٹھو.....“ حاضر نے ہار پر کواپاؤں سے غور کر رہے ہوئے کہا۔

صورت حال کو بھانپتے ہوئے ہمارے تجزیے سے اطمینان اور ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”مجھے، جان کر دینا ناصر۔ خدا ارادہ لقا شد میں۔ میں یرادہ ہو جاؤں گی۔“

”جیسا کہ ہمیں - حاف - کرو میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔“ سیکو تا صر کے چروں کی طرف  
 بڑھی تو دو تیزی سے جیسے ہو گیا۔

"بہت جا۔۔۔ مجھے شغل۔۔۔ تیری لڑکی بھائی کی وجہ سے ہم نے کئی بار اپنی لاڈلی بہن کو مارا۔۔۔ اور اس کی طرف سے لاج واپس گئے۔"

"جا میں تجھے..... طفل....." ناصر بھائی جیسے ہی کہنے لگے میں نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ترقی یافتہ ممالک کے لیے

پوچھیں گے تو..... میں کوئی نقص نکال کر اٹھ کر دوں گی لیکن وہاں تو مصلحتی کر دیتی تھی..... اور جیسا کہ مجھ سے پوچھا تک نہیں۔“

”لیکن..... اب تم از خود انکار کر دو گی..... شام کو جب ناصر اور سلطان دونوں گھر پہ ہوں گے تو تم یہ انگوٹھی لاکر ان کے سامنے رکھ دو گی۔ اور کوئی بھی یہاں نہ کر کے رشتے سے انکار کر دو گی۔“

”تمہیں بھالی۔ ایسا مجھ سے نہ ہو سکے گا۔“ میں نے پہلی بار جرأت دکھائی۔ ”اب میں خود انکار نہیں کروں گی۔“

”ادم.....“ نامور اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی۔ ”میرا خیال ہے تم اپنی ان تصویروں کو بھول چکی ہو.....“ اس کا انداز معنی خیز تھا۔

”بھابی! پلیز ایسا نہ کرنا..... دیکھو میں نے تمہاری کتنی شرمیں لینی ہیں اپنے ہی گھر میں۔“

”تم نے مانی نہیں۔۔۔ لڑکی۔“ یہ ناریہ کی ماں تھی۔ جس نے پیچھے سے آ کر اچانک مونی  
 بچا چڑائی۔ ”ہم نے سوال کیا جس نے باوجود سارے بچنے کی کوشش نہیں کرتی تم نے۔“

”دس سال تک ہم تمہاری شادی نہیں ہونے دیں گے۔ اور ہر آنے والے رشتے کو قحط خواہ مخواہ کی جاکہ کسی کو کانوں کاٹنا پڑے نہ چلے کہ یہ ہماری عادت ہے۔“

”لیکن۔۔۔ کیوں تم ماں بیٹی میری جان کی دشمن ہو۔۔۔؟“ اس لیے کہ میں تمہیں اس وقت اس گھر میں لائی جب تمہارا ملک مکان تم لوگوں کا سامان باہر پھینک دالا تھا۔ میں نے تو تم لوگوں پر

”چھوڑو اس کو۔“ مادر نے جڑھ کر مری بی بیوں کے ہاتھ سے چھڑوائی۔

”زیادہ تر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں..... میں یا تو تمہارے دونوں بھائیوں کو خوش رکھ سکتی ہوں اور باہر تمہیں..... تینوں کو ایک ساتھ خوش رکھتا میرے بس میں نہیں اور باور رکھو میری

بات کو رد کرنے کا سچا بھی نہیں۔۔۔۔۔ اور نہ تہا بے نام کے فون بھی اس گھر میں آنا شروع ہو جائیں گے اور تہا بے نامی کے نام لکھے کو لیٹر بھی شاید اور اس کے رشتہ داروں کو پہنچ جائیں گے اور

تمہاری تصویریں بھی غلہ بھر میں پھیلا دی جائیں گی۔ اب تم دغااں نہ جاؤ.....“ ٹاویو نے جائیں  
 ماتھو سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

Courtesy of www.pdfbooksfre

تری یادوں کے گلاب

"نہیں بھائی جان..... معاف کر دیں۔ انہوں نے زیادتیاں ہرے ساتھ کیں اور میں انہیں معاف کرتی ہوں۔"

میری بات سن کر ناصر بھائی ڈک گئے۔ تھوڑی دیر بعد دیکھتے رہے اور پھر سمجھ کر ہلکے سے لگا لیا۔ میں ان کے شانے سے سر ہٹا کر رونے لگی۔

نادیہ اور اس کی ماں یکے پاؤختہ اُلٹ جانے پر برا سارا پریشان مروجہ کائے گھڑی تھیں۔ اب یہ اللہ بھتر جانتا ہے کہ وہ چشیاں تھیں یا کوئی نئی چال تھی۔ ارسلان نے ہم دونوں تک بھائیوں کو الگ کیا اور کہنے لگا۔ ابھی بات مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ناصر بھائی۔

"مجھے پتہ ہے چھوٹے بھائی..... ہاں تو نادیہ....." ناصر اپنی بیوی سے مخاطب تھا۔  
 "وہ تصویریں..... اور خطوط..... ابھی اور اسی وقت نکال کر اس بھلی پر رکھو اور اس لڑکے کا نام بتاؤ جو تمہارے کہنے پر اس گھر میں فون کرتا تھا۔"

نادیہ چپ چاپ اٹھی اور تھوڑی دیر میں مطلوبہ چیزیں پیش کر دیں۔ اس کا چہرہ متناہوا تھا۔  
 "اس لڑکے کا نام.....؟" ناصر بھائی نے پوچھا۔

"سلیم..... مجھے۔" نادیہ سر جھکا کر مری ہوئی آواز میں بول رہی تھی۔  
 "یہ جو اس گلی میں رہتا ہے۔ وہ آوارہ سالوکا۔"

"وہ جہیں کہاں سے مل گیا؟"  
 "خانوہلقیس کے ڈورے سے بات ہوئی تھی۔"

"کتنے میں سو رہا ہوا تھا؟" ناصر کا طعوس کے لہجہ کی گلی میں ڈوبا تھا۔  
 "پانچ سو روپے میں۔"

تواغ کی آواز آئی اور نادیہ لڑکھڑا کر رہ گئی۔  
 "بے غیرت..... میری بہن کی بے عزتی کے لیے تم نے میری ہی محظواہ استعمال کی۔"

نادیہ کال پر ہاتھ رکھ کر سسکتی گئی۔  
 "ارسلان جا کر شاید اور خالہ تھیں کو بلا لائے۔"

انکے چند منٹوں میں دونوں آ گئے۔  
 ناصر نے شاید کو سلیم کے بارے میں بتایا تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔

"نہیں کتنے کی یہ بہت، ناصر بھائی آپ فکر نہ کریں۔ اب یہ میرا کام ہے۔ اس کے ساتھ

تری یادوں کے گلاب

وہ کروں گا کہ نہ صرف ساری زندگی اس لڑکے پر زبان بند رکھے گا بلکہ آئندہ کسی شریف خاتون کو شک کرنے سے قویہ کرے گا۔"

☆.....☆.....☆

اور پھر اگلے دن سے شادی کی شاپنگ زور و شور سے شروع ہو گئی۔ شاید کی دونوں بہنیں پاکیزہ اور لیکن اس شاپنگ میں امارے ساتھ ہو گئیں۔ درمیان میں دن ہی کتنے تھے۔ لہذا صبح سے شام تک شاپنگ، شاپنگ اور پھر شاپنگ۔ ہمارے تو قریبی رشتہ دار بھی نہ تھے۔ اگر تھے تو وہ بیرون ملک تھے۔ نادیہ اور سلیم کو صرف گھر تک محدود کر دیا گیا لہذا پاس چڑوں والیاں رات کو آ کر ڈھک ڈھک جہان شروع کر دیتیں۔ اگلے ہی دن آسنے آسنے دونوں گھر جمادیے گئے۔ تمام رسوم مشترک ہی ہو گئیں۔ محدہ المہارک کو بعد نماز جمعہ سادگی سے نکاح چڑھا دیا گیا اور میں گلی کے اس پار چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

کلیدوں سے کچی اور پھولوں سے لدی بیج پر ارم اپنے گھٹنوں کو بازوؤں کے حصار میں لیے اپنے آپ میں سٹ رہی تھی۔ شب کے ہارونچ بچے تھے۔ گزشتہ تین صفت سے وہ ہر آہٹ پر چونک اٹھتی تھی۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ بیک میٹنگ کی دوزخ سے نکل کر امانوں کی دشت میں پناہ پائے گی۔ اور کوئی پل کو امانوں کا دیوتا طور پر نہ ہونے والا ہے۔

اور پھر چوٹی دروازے کے باہر کھٹ پٹ ہوئی..... دروازہ کھلا..... کوڑا کسے۔ ارم نے ہلکے جھکے گھر گھٹ کی اوٹ سے ٹپکیں اٹھا لیں۔ یہ شاید ہی تھا جو پلٹ کر بچتی لگا رہا تھا۔

اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا..... اس کے سینکے وجود سے سنسنائیں پھوٹنے لگیں۔  
 دواؤں مشق سے شہزادہ..... ہر چوں کی شہزادی کو لٹے..... پرستان کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔

شاید دھیرے دھیرے آگے بڑھا اور ڈھل بند کی بیج کے قریب آ کر رک گیا۔ چند لمبے گز گئے تو ارم نے ٹپکیں اٹھا لیں لیکن شاید کو دایا نہ انداز میں گھورتے دیکھ کر جلدی سے جھاریں گرا لیں۔ وہ جھینپ گئی۔ وہ بیڑہ کیا۔ وہ سسکتی گئی اور سر کئے لگا۔

"آج تھے اپنی دہن کے روپ میں سامنے پا کر دعاؤں کی قبولیت پر یقین ہو گیا ارم۔" یہ شاید تھا۔ جو اس کی خونخیزی انکشت شہادت سے افسار ہوا تھا۔

ارم کے کلابی چہرے سے غلاب پھوٹنے لگا۔



تری یادوں کے چراپ

”زندگی کتنی خوب صورت ہے۔“ اس نے گفتگو جاری رکھی۔ ”ہاں کبھی کبھی کچھ ماقبت  
ماندیش لوگ دوسروں کی خوشیوں بھری زندگی میں زہر گھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاہم  
دورانِ محضر اور عارضی ہوتا ہے اور سازشی ہمیشہ دوسروں کے لیے کھودنے والے گڑھے میں نہ  
گرتے ہیں۔“

ارم کو شادی کی آواز نہ کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔  
”شاید.....! اورم بول اٹھی۔

”بعض باتیں بظاہر یقین سے بہت دور نظر آتی ہیں لیکن قدرت کے فیصلے الگ ہوتے  
ہیں۔ آج سے چند دن قبل تک میں اپنی شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ پھر جانے کیا ہوا۔ اے  
کے سب ہی کانٹے بچے چلے گئے۔ لہٰذا..... لیکن مجھے تو ابھی تک کچھ سمجھ نہیں آتی۔ اورم کی  
جھجک دور ہو رہی تھی..... کچھ تم ہی سمجھاؤ نا..... یقیناً یہ ساری بساطِ قائم نے ہی بچھائی ہوگی۔“  
”سمجھاؤں گا۔۔۔۔۔“ شاید کا صلا کم کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن آج نہیں پھر کسی دن آج  
کی رات ہماری زندگی کی یادگار رات ہے۔ آج ہم صرف اپنی باتیں کریں گے دوسروں کی کوئی  
بات نہیں ہوگی۔“ جذبات کی شدت سے شادی کی آواز بھرا گئی۔ اس نے ساتھ ارم کے گداز و زور  
کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ ارم کسمانے لگی۔ لیکن اس کی برائے نام وفادت اور  
لطیف جدوجہد کامیاب نہ ہو سکی۔

اور پھر جب چیزوں کی چھبھاہٹ کے ساتھ شوخ و خشک کریمیں ان کی تھانویں میں جھانک  
جھانک کر گھل ہونے لگیں تو ارم کو محسوس ہوا کہ اس سیاہ رات کی کوکھ سے اک نئی مچ تالیاں ختم  
ہو چکی ہے۔

داخلہ جاری ہے

دعائے پزیر گزرتا ہاٹل

ماہا گزرتا ہاٹل

NA-12، مین سید تقہ بڑا

سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

051-5826787

D-11/4، سیٹلائٹ ٹاؤن

بالقاعلی گورنمنٹ پوسٹ گریم جیوٹ کالج

0321-5330025, 051-5858195

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk